خلافتِ علی رضی اللہ عنہ
احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں
تالیف :
مولانا محمد زاہد
تدوین وتخریج : سید متین احمد شاہ
دار السنۃ

نوٹ: اس ڈیجٹیل کتاب میں اور مطبوعہ کتاب میں صفحات کا
فرق موجود ہے، کہیں کہیں کچھ لفظوں کا بھی فرق ہو سکتا ہے۔

## فہرستِ مضامین

# پیش لفظ

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وآله وصحبه أجمعین، ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین، وبعد:

یہ چند صفحات ایک ایسے موضوع پر پیش کیے جارہے ہیں جس پر کچھ کہنا یا لکھنا مزاجاً کبھی مرغوب نہیں رہا، لیکن کچھ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں مسلسل ایسے تجربات ہوئے اور وہ کچھ پڑھنے اور سننے کو ملا جس سے اندازہ، بلکہ یقین ہوا کہ ہماری تاریخ کے اس انتہائی تاب ناک باب اور خلافتِ راشدہ کے ایک حصے کو جو امیر المؤمنین اور مولی المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے دور سے متعلق ہے، بری طرح مسخ کرکے پیش کیا جارہاہے اور اس میٹھے زہر سے خصوصاً نئی نسل متأثر ہورہی ہے۔ ٹھیٹھ دین دار نوجوانوں کو بھی اہل السنت والجماعت کے مسلمات سے اجنبیت محسوس ہونے لگی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ صورتِ حال کے اس ادراک میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ جس کو دیکھو اس مظلوم ذات پر ایک سے ایک بڑھ کر عجیب وغریب اعتراض لے کر پھر رہاہوتاہے۔ یہ بھی تجربہ ہوا کہ کسی کے سوال پر مختصر جواب مزید الجھن کا باعث بن سکتاہے اور ہر جگہ مفصل جواب ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے اس طرح کے موضوعات سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے باوجود کچھ عرصے سے اس ضرورت کا احساس ہورہاتھا کہ اسلامی تاریخ کے اس حصے کا اس انداز سے جائزہ لیا جانا ضروری

ہے، جس سے حضرت علیؓ کی ذات اور خلافت پر اٹھنے والے اعتراضات کا ازالہ ہو جائے۔ یہ بھی احساس تھا کہ اس دور کی تاریخ کو سمجھنے کے معاملے میں ایک مسلمان کے لیے اہم کلید رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے وہ ارشادات ہیں جن میں آپ نے اپنے بعد پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پیشگی بہت کچھ بتایا ہے۔ تاریخ بھی خبر دینے والوں کی خبر سے وجود میں آتی ہے اور یہ تو سب سے سچی زبان سے صادر ہونے والی خبر ہے، بس یہ فرق ہے کہ یہ خبر واقعات سے پہلے دے دی گئی ہے۔ چناں چہ اسی احساس کے ساتھ جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں "حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت: احادیثِ نبویہ کی روشنی میں" کے عنوان سے ایک محاضرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں آخری درجات کے طلبہ اور علما نے شرکت کی۔ یہ محاضرہ تقریباً چار گھنٹے پر محیط رہا اور اسے ریکارڈ کر کے یوٹیوب اور فیس بک پر بھی نشر کیا گیا۔ براہِ راست سامعین اور ملک و بیرون ملک سوشل میڈیا پر سننے والوں سے معلوم ہوا کہ انھیں اس سے کافی فائدہ محسوس ہوا اور کئی الجھنوں کے ازالے میں مدد ملی۔

ہمارے فاضل دوست مولانا سید متین احمد شاہ صاحب (مدیر "فکر و نظر" اسلام آباد و فاضل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد) نے یوٹیوب سے سن کر بہت سلیقے سے اسے قلم بند بھی کر دیا اور حاشیے میں حوالہ جات اور اصل عربی عبارات کا بھی اندراج کر دیا۔ ہم تو اپنے طور پر اپنا کام کر کے فارغ ہو چکے تھے، مختلف احباب کی فرمائش کے باوجود اس محاضرے کی مزید کسی انداز کی اشاعت کا ارادہ نہیں تھا، بس خیال تھا اس تمہیدی محاضرے کے بعد کبھی موقع ملا تو خلافتِ راشدہ کے اس حصے پر اٹھائے جانے والے اشکالات پر کچھ مزید محاضرات ریکارڈ کرا دیے جائیں گے، تاکہ محاضرات کے اس سلسلے کے ذریعے موضوع کی تکمیل ہو جائے، لیکن شاہ صاحب نے جس سلیقے اور خوب صورتی سے اس محاضرے کی

تدوین کی اس سے ہماری بھی بھوک جاگ اٹھی کہ اسے تحریری شکل میں بھی شائع ہونا چاہیے، جو شاید کسی تحقیقی مجلے کے مفصل مقالے کے انداز میں ہو سکتا تھا، لیکن جب راقم الحروف نے نظرِ ثانی کے دوران اس میں اضافات کیے تو ضخامت دوگنی سے بھی کہیں زیادہ ہو کر اتنی بڑھ گئی کہ الگ کتابی شکل میں شائع کیے بغیر کوئی چارا نہیں رہا۔ اگرچہ اصلا یہ ایک سلسلۂ محاضرات کی پہلی تمہیدی کڑی تھی، لیکن ایک لحاظ سے موضوع کے ایک گوشے پر مکمل بحث بھی ہے، اس لیے مزید کام کے انتظار میں اس کی اشاعت کو موقوف رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوا؛ چناں چہ اب کتابی شکل میں یہ مواد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کام پر نظرِ ثانی کے دوران میں مراجعتِ کتب کا دوبارہ موقع ملا تو یہ احساس پہلے سے زیادہ ہوا کہ علی اور اولادِ فاطمہ (اہلِ کساء) کی سیاسی فکر، جو ان کے اقوال اور طرزِ عمل دونوں سے سمجھ میں آتی ہے، اس میں جو نپا تُلا پن، توازن، اعتدال اور خوب صورتی نظر آتی ہے، اس میں جس طرح سے تنوع اور مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف رنگ نظر آتے ہیں، وہ ہماری تاریخ کا بہت درخشاں باب اور مختلف حالات میں امت کی راہ نمائی کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ برگزیدہ ہستیاں بھی کسی مسلک کا نہیں پوری امت کا اثاثہ ہیں، اللہ کرے اہل السنت میں اس عظیم باب پر مزید علمی کام کی توفیق وافر ہو۔

یہ اصلاً نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب کی کتاب ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع موضوع ہے، اور اس پر اردو سمیت دیگر زبانوں میں مواد دست یاب ہے، نہ مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی براہِ راست اس خطاب کا موضوع تھا اور نہ براہِ راست عقیدہ وکلام اس کا موضوع ہے، بلکہ اس کی حیثیت اس خاص دور کی تاریخ کو ایک مسلمان کے زاویۂ نگاہ سے سمجھنے کے لیے ایک مقدمہ، مدخل اور تمہید کی تھی۔ اگر اللہ کو مقدر رہا تو اصل موضوع کے

مختلف گوشوں، جن کی نشان دہی خود اس خطاب کے شروع میں کی گئی ہے، پر بات ہو سکتی ہے؛ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور تاریخ کے اس حصے کی اس طرح سے تصویر کشی کہ صحیح حقائق سامنے آکر بے جا اعتراضات کا خاتمہ ہو جائے، تاہم اس ساری بحث سے مشاجرات کے مسئلے کی طرف ذہن منتقل ہونا فطری امر ہے؛ اس لیے آخر میں بطور ضمیمہ اس موضوع پر اہل السنت کے عمومی نقطۂ نظر کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ضمیمے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جس میں اہل السنت والجماعت کی نمایاں شخصیات کی وہ عبارات بھی پیش کر دی جائیں جن سے معلوم ہو کہ واقعی اہل السنت کا عمومی رخ وہی ہے جو ان احادیث سے سمجھ میں آرہا ہے۔ اس ناکارہ کے پاس ایسی عبارات کا کافی ذخیرہ موجود ہے، لیکن اس سے ضخامت کافی بڑھ جاتی، اس لیے فی الحال اس سے گریز کیا گیا ہے، البتہ درمیان میں خود متن یا حواشی میں بعض عبارات شامل کر دی گئی ہیں، بالخصوص ایسی شخصیات کی جو ردِ تشیع کے حوالے سے کافی معروف ہیں۔

جیسا کہ خود کتاب میں بھی عرض کر دیا گیا ہے کہ اس کے مخاطب وہ حضرات نہیں ہیں جو اس موضوع پر ہم سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں، بلکہ مخاطب صرف وہ حضرات ہیں جن کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس موضوع کو سمجھنے میں انھیں ہماری کسی کاوش سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ اس کاوش کا مقصد کسی کلامی یا مناظراتی بحث کا آغاز کرنا یا اس میں الجھنا بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ آج کے دور میں جسے "مثبت مکالمہ" کہا جاتا ہے وہ بھی اس کا مقصد نہیں ہے؛ اس لیے جن احباب کو اس سے کوئی فائدہ محسوس ہو وہ اس ناکارہ کے لیے دعاے خیر فرما دیں وگرنہ جس خیال پر وہ کار بند ہیں وہ انھیں مبارک ہو، اس لیے اس تحریر کے جواب میں سامنے آنے والے کسی بحث مباحثے کا جواب کا انتظار نہ رکھا جائے، یہ ناکارہ کسی مناظرے یا

"مثبت مکالمے" کے لیے دست یاب نہیں ہو گا۔ یہ امید ضرور ہے کہ کوئی بھی مثبت یا منفی رائے قائم کرنے سے پہلے پوری کتاب کو ملاحظہ ضرور فرمالیا جائے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس حقیر کاوش کو قبول فرما کر اپنی، اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل واصحاب کی محبت کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

محمد زاہد

جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

پاکستان

۲۱ جمادی الأولی ۱۴۴۰ھ

# حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت—احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

## تعارفِ موضوع اور اس پر گفت گو کی ضرورت

زیرِ نظر موضوع "حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت—احادیثِ نبویہ کی روشنی میں" کے بارے میں سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ اس موضوع پر گفت گو کی ضرورت کیا ہے؟ کیوں کہ بادی النظر میں یہ لگتا ہے کہ اہل السنت والجماعت کے ہاں یہ بات طے شدہ اور ان کے مسلمات میں سے ہے کہ خلفاے راشدین چار ہیں، جن میں چوتھے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس معاملے میں اہل السنت والجماعت کے درمیان کوئی بھی اختلاف موجود نہیں ہے، یہ اجماعی مسئلہ ہے، تو پھر اس پر بات کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟ بنیادی طور پر جو ہمارا ذوق ہے، وہ یہ ہے کہ زیادہ گفت گو ان مسائل پر کی جائے، جو ہماری آج کی زندگی سے متعلق اور آج کے ایشوز ہیں۔ مثلاً آج کی ایک اہم بحث مسئلۂ خلافت ہی کو لیں تو ایک اہم سوال اٹھتا ہے کہ آج اگر ہم نے خلافت قائم کرنی ہو تو شریعت ہم سے اس طرح کا کوئی تقاضا کرتی ہے یا نہیں؟ کرتی ہے تو وہ کس طرح سے کرتی ہے؟ آج کی ہماری زندگی سے متعلق اور بھی بہت سارے مسائل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری توجہ کا اصل محور وہی مسائل ہونے چاہییں، جو آج امت کو درپیش ہیں۔ جو چیزیں طے ہو چکیں، وہ طے ہو چکیں، ان پر زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لیے نہیں کہ وہ چیزیں درست نہیں ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ طے شدہ ہیں اور ان پر مغز کھپائی کرنا تحصیلِ حاصل ہے، اس لیے اس موضوع یا اس سے ملتے جلتے موضوعات پر گفت گو کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ جھجک رہتی ہے کہ امت کے سامنے اتنے بڑے

بڑے مسائل موجود ہیں، اور ہم اسی ماضی میں الجھے رہیں، وہ چیزیں جو تقریباً طے ہو چکی ہیں، ان پہ وقت لگائیں، اس کی کیا ضرورت ہے؟

## معاصر فضا میں خلافتِ علی رضی اللہ عنہ پر شکوک کا پس منظر

لیکن معاملہ دوسری طرف یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں یہ تو اہل السنت والجماعت کا اجماع ہے کہ وہ خلافتِ راشدہ کا حصہ ہے اور وہ ایک منعقد اور طے شدہ خلافت ہے، لیکن پچھلے کچھ عرصے میں—پچاس، ساٹھ، ستر سال کے اندر یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ لیں کہ پچھلی ایک صدی کے اندر—ردِ تشیع میں یا انکارِ حدیث میں؛ یہ دو رجحانات ہیں جنھوں نے ہماری تاریخ کے حوالے سے ایک نئے بیانیے کو رواج دیا۔ اس بیانیے کے بہت سارے اجزا ہیں اور بادی النظر میں لگتا ہے کہ بعض باتیں بہت خوب صورت ہیں اور ان باتوں میں لگتا ہے کہ دفاعِ صحابہ کیا جا رہا ہے، یا ان باتوں میں لگتا ہے کہ اہلِ تشیع کی تردید ہو رہی ہے، لیکن اس بیانیے کے ذریعے کبھی کھل کر اور کبھی مخفی انداز سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں بہت سارے شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔ جب بات کی جاتی ہے تو آگے سے جواب یہ ملتا ہے کہ یہ تو ساری تاریخ کی باتیں ہیں، تاریخ کا تو اعتبار ہی کوئی نہیں ہے، لیکن پھر جب خود اپنی بات کرنے پہ آئیں گے تو زیادہ تر بلکہ تقریباً تمام تر اسی تاریخ کے ادھورے حوالے دیں گے۔ اس بیانیے کے اثرات اہلِ حدیث اور دیوبندی مکتبِ فکر کے کئی لوگوں میں (اور شاید کسی قدر بریلوی مکتبِ فکر میں بھی) آہستہ آہستہ سرایت بھی کر گئے ہیں۔ ہمارے علما میں کچھ شخصیات ایسی بھی تھیں، جن کو بہت شروع میں اندازہ ہو گیا کہ یہ بات کدھر کو جائے گی اور کیا رخ اختیار کرے گی، لیکن کچھ حضرات ایسے بھی تھے، جن کو ذرا آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور اس کا جو

ظاہری پہلو ہے، اپنے انجام کے لحاظ سے وہ نہیں جو نظر آرہا ہے، بلکہ اس کا رخ کسی اور طرف کو جاتا ہے۔ یہ احساس، کم یا زیادہ شکل میں، مختلف بزرگوں کو ہوا۔

### مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا دردِ دل

مثال کے طور پر ہمارے بزرگوں میں ایک نام مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ آپ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے براہِ راست شاگرد ہیں، علمائے دیوبند کے ہمیشہ معتمد علیہ رہے ہیں۔ علمی اعتبار سے جہاں بہت وسیع مطالعے اور بے مثال حافظے کے مالک ہیں، وہیں استنباط کی بھی عجیب وغریب صلاحیت کے حامل بزرگ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دردِ دل اور جذبِ دروں رکھنے والے بزرگ ہیں۔ باطنی مقام بھی بہت بلند ہے۔[1] وہ ایک جگہ جدید لکھنے والوں کی طرف سے حضرت علیؓ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کہتے ہیں کہ جو مقابلہ غیروں سے ہو رہا تھا، علی نے غیروں سے ہٹا کر اس مقابلہ اور مقاتلہ کو خود باہم مسلمانوں کے اندر قائم کر دیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تلوار نکالنے کی سنت سب سے پہلے حضرت ہی نے قائم کی۔ اس سلسلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جن احسان فراموشیوں کا ارتکاب کرنے والے کر رہے ہیں، اور جن الفاظ میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کو یاد کرنے والے یاد کر رہے ہیں الی اللہ المشتکی کے سوا اس کے جواب میں اور کیا کیا کہا جاتا ہے۔ ان کے دورِ حکومت کے نقشے کو دکھلا دکھلا کر پوچھا جاتا ہے، اسلامی دائرہ

---

۱۔ اپنے والد صاحب سے دورانِ درس میں ان کی کرامت سنی تھی کہ اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بوڑھا جنت نہیں جائے گا۔ کسی کو بات سمجھ میں نہیں آئی۔ انتقال کے بعد بال مبارک جو سفید تھے، وہ سیاہ ہونا شروع ہو گئے، اب سمجھ میں آئی کہ جوان ہو کر جنت میں جا رہے ہیں۔

> اقتدار میں بتایا جائے کہ زمین کا کتنا حصہ انھوں نے داخل کیا؟ اسی کو دکھا کر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حکم رانوں میں علی سے زیادہ ناکام حکم ران اسلامی تاریخ میں کوئی نہیں گزرا۔۔۔[1]

بلکہ مولانا گیلانی کا یہ اقتباس پڑھ کر شاید قارئین کو بھی کچھ گمان ہو کہ اعتراض تو حضرت علی پر ٹھیک معلوم ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اعتراض ٹھیک لگنے کی وجہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے ناواقفیت اور کچھ غلط اصولوں کا ذہن میں بیٹھ جانا ہے۔

## ایک اہلِ حدیث عالم کی کتاب پر تقریظ کے ضمن میں مولانا قاضی مظہر حسین کا مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کو خط

ایک اور مثال کے طور پر ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ ہیں۔ ان کا ایک خط ہے حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم کے نام؛ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ ایک اہلِ حدیث عالم ہیں، انھوں نے بظاہر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دفاع میں کتاب لکھی ہے۔ مشہور اہلِ حدیث عالم ہیں، (اس طرح کی گفت گو میں کسی کا نام لینا ہمارا معمول نہیں ہے)، لیکن اس کتاب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نا مناسب انداز اختیار کیا گیا اور ان کے بارے میں تعبیرات غیر مناسب استعمال کی گئی تھیں۔ کتاب کافی ضخیم ہے۔ وہ کتاب جب چھپی تو اس پر حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی تقریظ تھی کہ یہ اس موضوع پر سب سے جامع کتاب ہے۔ قاضی مظہر حسین صاحبؒ کی نظر سے گزری تو وہ تو ٹھٹھک گئے اور اچنبھے کی کیفیت میں حضرت مولانا محمد تقی صاحب کو خط

---

۱۔ مناظر احسن گیلانی، **حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی** (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۳ء)، ۳۴۹۔

لکھ دیا کہ اس طرح کی کتاب پر تقریظ کیسے لکھ دی گئی؟ تو حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم نے جواب میں لکھا کہ در حقیقت اس کتاب پر **البلاغ** میں میرا تبصرہ چھپا تھا اور ساتھ جوابی خط میں حضرت نے **البلاغ** کے اس تبصرے کی کاپی بھی لگائی۔ اس میں جہاں اس پہلو کی تعریف کی گئی تھی کہ یہ جامع کتاب ہے، وہیں اگلے پیراگراف میں اس بات کی نشان دہی بھی کی گئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے، وہ قابلِ اصلاح ہے، لیکن ناشر نے حضرت مولانا تقی صاحب کے تبصرے کا پہلا حصہ تو چھاپ دیا کوئی وجہ ہوگی کہ ناشر نے دوسرا حصہ چھاپنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔[1] اس پر قاضی صاحب رحمہ اللہ

---

۱ - یہ تبصرہ مولانا صلاح الدین یوسف صاحب کی کتاب **خلافت وملوکیت: تاریخی وشرعی حیثیت** پر تھا اور **البلاغ** کے مئی ۱۹۷۱ء کے شمارے (جلد: ۵، شمارہ ۳، ربیع الاول ۱۳۹۱ھ) میں شائع ہوا۔ کتاب کے علمی مباحث، حضرت عائشہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے موقف کے دفاع اور دیگر امور کے حوالے سے مصنف کی کاوش کی تحسین کے بعد تبصرہ نگار (مولانا محمد تقی عثمانی زید فی مجدہم) لکھتے ہیں: "البتہ کتاب میں تین باتیں ہمیں خاص طور پر کھٹکتی ہیں۔" ان تین باتوں میں سے پہلی بات کے سلسلے میں لکھا ہے: "حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کا دفاع کرتے ہوئے کئی جگہ مؤلف نے اس بات کا اظہار تو کیا ہے کہ وہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک کے مطابق حضرت علیؓ کو مخلص اور مجتہد سمجھتے ہیں، نیز علمائے اہلِ سنت کے وہ ارشادات بھی بلا تنقید نقل فرمائے ہیں جن میں حضرت علیؓ کو مجتہدِ مصیب قرار دیا گیا ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ مصنف کا عقیدہ اس معاملہ میں جمہور اہلِ سنت ہی کے مطابق ہے، لیکن واقعات کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اور مولانا مودودی کے مختلف اعتراضات کا متعدد مقامات پر جس انداز سے الزامی جواب دیا گیا ہے، اس کو پڑھنے کے بعد حضرت علیؓ کے موقف کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا، بلکہ قاری کا ذہن یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اہلِ سنت نے حضرت علیؓ کے موقف کو برحق قرار دینے میں حقیقت پسندی سے زیادہ جذباتی عقیدت سے کام لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تاثر غلط ہے —— اگرچہ مصنف کی طرف سے یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ کتاب کا اصل موضوع چونکہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کے موقف کو واضح کرنا ہے، اس لیے اس میں

نے جوابی خط لکھا کہ میرا دل صاف ہو گیا ہے، غلط فہمی جو مجھے تھی، وہ دور ہو گئی ہے، البتہ اب ایک کام کرنے کا ہے۔ وہ کام یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اہلِ سنت کے نزدیک اصولی طور پر اسی طریقے سے ایک منعقد خلافت ہے جس طرح پہلے تین خلفا کی خلافت ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اس پر مستقلاً لکھنے کی ضرورت ہے۔ قاضی صاحب نے حضرت مولانا تقی صاحب سے شاید اس لیے کہا ہو گا کہ اس موضوع پر آپ زیادہ بہتر لکھ سکتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ خلفائے ثلاثہ پر جو اعتراضات ہیں وہ پرانے لوگوں کے ہیں اور زیادہ تر پرانے انداز کے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جو طعن کیے گئے ہیں، ان کا ہم اگر فکری پس منظر دیکھیں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ اس سارے بیانیے کے پیچھے تجدد پسندانہ ذہنیت ہے۔ خاص طور پر پچھلی صدی کے اندر ایک طبقہ رہا ہے جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہلاتا رہا ہے یا اسے اہلِ قرآن کہا جاتا تھا۔ ان میں مثلاً تمنا عمادی ہیں، اس طرح کے اور کچھ حضرات ہیں۔ حبیب الرحمن کاندھلوی ہیں۔ ان میں سے اگرچہ ہر ایک کی اپنی اپنی فکر ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ تقریباً وہی مکتبِ فکر ہے جو غلام احمد پرویز کا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ محمود احمد عباسی کا بھی اسی مکتبِ فکر سے ربط و تعلق رہا ہے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے

---

حضرت علیؓ کے دلائل سامنے نہیں آسکے، لیکن موضوع کی نزاکت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس پر کوئی مفصل گفتگو ہو تو قارئین کو ہر ممکن غلط فہمی سے بچایا جائے۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ فاضل مصنف آئندہ ایڈیشن میں کتاب کے ان حصوں پر نظر ثانی کر کے ان میں حضرت علیؓ کا موقف بھی واضح فرمائیں۔ اس کے بعد یہ کتاب اہلِ سنت کے مسلک کی بہترین نمائندہ دستاویز ہو گی۔" (محمد تقی عثمانی، **البلاغ**، شمارۂ مذکور، ۶۵،۶۶۔)

۱ - اس حوالے سے یہاں پر حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ (آپ کے مختصر تذکرے کے لیے دیکھیے: مولانا مفتی محمد تقی عثانی، **نقوشِ رفتگاں** (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۷۳-

۳۸۳۔) جیسے ثقہ عالم کی ایک شہادت درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے عباسی صاحب کے اس ربط اور مزاج و مذاق کا خاص اندازہ ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''محمود احمد صاحب عباسی، مصنفِ ''خلافت معاویہ ویزید'' و ''تحقیق مزید'' وغیرہ سے بندہ لیاقت آباد میں رہنے کی وجہ سے ایک عرصہ سے واقف تھا۔ شروع شروع میں روافض دشمنی کی قدرِ مشترک کہ وجہ سے عباسی صاحب سے خاصی دوستی تھی۔ کبھی کبھی ان کے کہنے پر بعض عربی عبارتوں کے ترجمہ میں مدد بھی دی۔ اسی طرح بعض کتابوں کے حصول میں معاونت بھی کی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ روافض کے خلاف عباسی صاحب اچھا کام کر رہے ہیں، بلکہ بعض بزرگوں کی ملاقات عباسی صاحب سے بندہ ہی نے کروائی۔ ایک عاشورائے محرم پر عباسی صاحب کا یہ رنگ بھی دیکھا کہ ان کے مکان پر اچھے خاصے لوگ جمع ہیں اور عباسی صاحب حضرت زینب بنت النبی ﷺ کا اور ان کی اولاد و امجاد کا ذکر کر رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ اس منظر سے میں خاصا متاثر ہوا، لیکن کچھ دن بعد یہ واضح ہوا کہ موصوف خاصے ناصبی ہیں۔ ایک بار میرے اور کچھ لوگوں کے سامنے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا پر العیاذ باللہ تنقید شروع کر دی اور ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ وہ ''اتنی سی تھیں''، یعنی ان کا قد چھوٹا تھا۔ میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو چیز اذیت دے، وہ مجھے بھی اذیت پہنچاتی ہے۔ آپ کس طرح خاتونِ جنت کی غیبت کر رہے ہیں؟ میں نے یہ بھی کہا کہ ''بخاری'' کی حدیث ہے۔ اس پر وہ ''بخاری'' اور دیگر کتبِ حدیث پر تنقید کرنے لگے اور منکرینِ حدیث کے طرز پر ''احادیثِ صحاح'' کو ''عجمی سازش'' کہنے لگے۔ اس سے پہلے میں مشہور منکرِ حدیث، تمنا عمادی کو ان کے یہاں دیکھ چکا تھا، وہ ان کے بڑے مداح تھے اور ان کی خود ساختہ تحقیقات کے خاصے معترف تھے۔ ان واقعات کے بعد بندہ نے عباسی صاحب کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا اور مجھ پر واضح ہو گیا کہ یہ شخص ناصبی اور منکرِ حدیث ہے۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ وہو اعلم!

کتبہ: ولی حسن، مفتی دارالافتاء جامع العلوم الاسلامیہ، کراچی۔ ۱۲ / جمادیٰ الاول ۱۴۰۰ھ۔ (دیکھیے: ''ضمیمہ'' از مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، مشمولہ، قاضی اطہر مبارکپوری، **علی وحسین** (لاہور: مکتبہ سید احمد شہید، ۲۰۰۳ء)، ۳۱۷، ۳۱۸۔) اسی کتاب کے اس ''ضمیمہ'' میں حکیم محمود احمد برکاتی کا

خانوادہ پر اعتراضات والی فکر کی اگر ہم تاریخی جڑیں دیکھیں تو وہ اسی تجدد پسندانہ ذہنیت کے ساتھ جا کر ملتی ہیں۔ عام طور پر اس بیانیے سے ہمارے سیدھے سادے نوجوان صرف یہ دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں کہ یہ شیعوں کی تردید ہو رہی ہے، ورنہ اس کے پیچھے حقیقت میں ایک خاص قسم کی تجدد پسندانہ ذہنیت ہوتی ہے اور اس کو بیان کرنے کے لیے شاید حضرت قاضی صاحبؒ نے محسوس فرمایا ہو کہ میرا سیدھا سادا قلم اتنا کام نہ کر سکے، جتنا حضرت مولانا محمد تقی صاحب جیسی شخصیت کر سکتی ہے، لیکن ظاہر ہے حضرت کی اور بہت ساری مصروفیات رہی ہوں گی اور اب اس وقت ان کے بڑھاپے کا بھی دور ہے، بہت سے کام آدمی کرنا چاہ رہا ہوتا ہے لیکن نہیں کر پاتا، اس لیے وہ یہ کام نہیں کر پائے۔

## حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اہل سنت کی کتابیں اور مزید کام کی ضرورت

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اہل السنت والجماعت کی بہت ساری کتابیں ہیں۔ خود ہمارے علماے دیوبند کی متعدد کتابیں موجود ہیں؛ مثلاً جن میں سب سے معروف حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب **المرتضیٰ** ہے؛ اور بھی کتابیں ہیں، لیکن ان کو اگر دیکھیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے سیاسی موقف اور ان کی سیاسی جدوجہد کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، جس پر مولانا گیلانیؒ کے دردِ دل کا کچھ حصہ پہلے گزار، اس کا احاطہ کر کے اس کا جواب دینا اور اہل سنت کے موقف کو منقح کرنے کا کام ان کتابوں میں بھی نہیں ہو پایا۔ وجہ اس کی بظاہر یہی ہے کہ ان حضرات نے سوچا کہ یہ تو ایک طے شدہ معاملہ ہے۔ خلفاے ثلاثہ کی خلافت میں تو اہلِ تشیع اختلاف کرتے ہیں، طعن کرتے ہیں، اس لیے

---

مضمون "عباسی صاحب حقیقتاً کیا تھے؟" (۳۱۹-۳۲۶) بھی قابلِ ملاحظہ ہے جس سے ان کے فکری رخ اور حضرت علیؓ کے حوالے سے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

ہمیں اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت) تو ایک اجماعی اور اتفاقی چیز ہے، شیعہ بھی مانتے ہیں ان کی خلافت کو، بلکہ وہ تو اس کو اس سے پہلے مانتے ہیں اور اہلِ السنت والجماعت بھی مانتے ہیں، اس لیے اس پر بحث کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن امر واقعہ کے لحاظ سے بہت ساری غلط فہمیاں –اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ– ہمارے اہلِ علم میں بھی ہوتی ہیں اور ہمارے نوجوان فضلا یا طلبہ میں تو بہت کثرت سے ہوتی ہیں اور ممکن ہے کہ ان میں سے کئی غلط فہمیوں سے اپنے کسی ابتدائی دور میں ہم خود بھی گزرے ہوں، لیکن جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا وہ غلط فہمیاں دور ہوتی چلی گئیں؛ اس لیے یہ سمجھنا کہ اس موضوع پر بات کی ضرورت نہیں ہے، واقعاتی طور پر درست نہیں ہے۔

## فریق یہاں دو نہیں تین ہیں

در اصل یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہاں فریق دو ہیں: ایک طرف سنّیت ہے اور دوسری طرف تشیع یا رافضیت ہے؛ اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ صرف اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ رافضیت کی طرف میلان نہ ہونے پائے، بس رافضیت سے بچ گئے تو خیر ہی خیر ہے اور سنیت پکّی ہے، لیکن حقیقت میں یہاں دو نہیں تین گروہ ہیں: سنّیت اور رافضیت کے علاوہ ناصبیت بھی ہے؛ اس لیے اعتدال کے لیے جہاں رافضیت کے اثرات سے بچنے کی ضرورت ہے، وہاں ناصبیت سے بھی بچنے کی ضرورت ہے۔ ایک معاملے میں بے احتیاطی رافضیت کی طرف لے جاسکتی ہے تو دوسری طرف کی بے احتیاطی ناصبیت کی طرف بھی لے جاسکتی ہے اور دونوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے جاتے ہوئے اپنے اہلِ بیت اور عترت کے بارے میں جو تاکیدات فرمائی ہیں، جن میں سے چند کا ذکر آگے آئے گا، ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ناصبیت سے بچنا کتنا ضروری ہے۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ، ردِّ تشیع میں لکھی گئی اپنی معروف کتاب **تحفہ اثنا عشریہ** میں جہاں شیعوں کے مختلف طبقات بیان کرتے ہیں، وہاں ایک طبقہ "تبرائی شیعہ" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس طبقے کے ظہور کی وجہ اور دوطرفہ افراط و تفریط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دوم یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کی اولاد مثلاً زید شہید رحمۃ اللہ علیہ یا دیگر ساداتِ حسینیہ ہمیشہ شام کے مروانی نواصب اور عراق کے عباسی نواصب کے ساتھ بر سرِ نزاع اور بر سرِ پیکار رہے اور باہم کینہ پروری فروغ پاتی رہی؛ اس لیے ادھر تو بعض نواصب گمراہی کے انتہائی درجے تک پہنچ کر روسیاہی کی زندگی گزارتے اور حضرات مذکورہ کی شانِ گرامی میں بڑی بے ادبی کا مظاہرہ کرتے۔ شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو نیکی سے یاد کرتے، بلکہ مروانیوں نے تو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف داری میں شرارت و گمراہی کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ دوسری طرف تبرائی فرقہ بھی ان نواصب کے مقابلہ میں بغضِ معاویہ کے مظاہرہ میں پیچھے نہ رہا اور مسلمانوں کے اسلاف ہر سہ خلفا رضی اللہ عنہم کے متعلق ہرزہ سرائی وطیرہ بنالیا۔[1]

شاہ صاحب جنھیں برصغیر میں ردِّ تشیع کی ایک علامت کے طور پر جانا جاتا ہے، وہ رافضیت کی طرح مروانی و عباسی ناصبیت کو بھی راہِ اعتدال سے ہٹنے کی ایک شکل سمجھتے ہیں، مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں مروانی ناصبیت کا خوب صورت عنوانات کے ساتھ احیا ہو رہا ہے اور اسے تسنن کی خدمت بھی باور کرایا جا رہا ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس موضوع پر راہِ اعتدال سے ہٹنے والے دو طبقوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی معروف کتاب مقامِ صحابہ میں لکھتے ہیں:

---

۱۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ، **تحفہ اثنا عشریہ** اردو (کراچی: دار الاشاعت، ۱۹۸۲)، ۲۸۔

> بعض حضرات نے ایک طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کی تائید وحمایت کا نام لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی اولاد بلکہ پورے بنی ہاشم کو ہدفِ تنقید بناڈالا اور اس میں صحابہ کرام کے ادب واحترام تو کیا اسلام کے عادلانہ اور حکیمانہ ضابطۂ تنقید کی بھی ساری حدود وقیود کو توڑ ڈالا۔ اس کے بالمقابل دوسرے بعض حضرات نے قلم اٹھایا تو حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمان غنیؓ اور ان کے ساتھیوں پر اسی طرح کی جرح وتنقید سے کام لیا۔ [1]

اب دوسری قسم کی بے اعتدالی کی تردید کا کام تو خود حضرت مفتی اعظمؒ کی سرپرستی میں ہوچکا ہے، اس کے علاوہ بھی علمائے دیوبند کی تصانیف میں خاصی تعداد اس موضوع پر موجود ہے۔ پہلی قسم کی بے اعتدالی کے خلاف بھی کام ہوا تو ہے، لیکن غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ نہ تو اس کی مقدار اتنی زیادہ ہے اور نہ ہی اس کے لیے تحمّس اور جوش وجذبہ اتنا زیادہ نظر آتا ہے؛ اس لیے اس پہلو پر کام کی خاصی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

## موضوع کے متنوع پہلو

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور اس میں پیش آنے والے واقعات کا موضوع بڑا لمبا ہے، اس کے کئی پہلو ہوسکتے ہیں؛ مثلاً:

- ❖ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد، شرعی اصولوں اور اس وقت کے مروجہ دستور کی روشنی میں۔ بعض لوگوں نے آپ کی خلافت کے مکمل انعقاد ہی پر سوالات اٹھائے ہیں، ان سوالات کا جائزہ لینا۔

---

۱ - مفتی محمد شفیعؒ، مقامِ صحابہ (کراچی: ادارۃ المعارف، ۱۹۷۱ء)، ۱۲۔

- اس خلافت کے فکری سیاسی پہلو؛ عصر حاضر کے بعض لوگوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جانا، بلکہ ان کے بقول خلافتِ راشدہ کا پورا ادارہ جن بنیادوں پر کھڑا تھا، وہ اس وقت کی عملی اور زمینی حقیقتوں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں ابن خلدون کے نظریۂ عصبیت کا خاص انداز سے سہارا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی پالیسیوں اور اقدامات پر عقلی نوعیت کے بھی سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ ان سوالات کا جائزہ اور یہ جائزہ کہ کیا واقعی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت عملی اور زمینی حقیقتوں سے اتنی ہی ناواقف، اتنی ہی بھولی بھالی اور سیاسی تدبر و فراست سے اتنی دور تھی جتنا باور کرایا جاتا ہے؟
- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جو اقدامات کیے ہیں، ان کا سیاسی اور دوسرے حوالوں سے جائزہ لیا جانا، یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، مثلاً میرا جہاں تک اندازہ ہے، ایک خاصی تعداد ہمارے لوگوں میں ہوتی ہے، جن کو کسی نہ کسی درجے میں یہ احساس ہوتا ہے کہ قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ میں کچھ نہ کچھ کوتاہی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی ہے، حالاں کہ اگر حقائق کو جا کر دیکھیں تو سو فی صد بلکہ ہزار فی صد یہ بات غلط ہے، یہ ایک مستقل موضوع ہے۔
- چوں کہ حضرت علی کے دور میں داخلی جنگیں زیادہ ہوئیں، نئی فتوحات بہت کم ہوئیں، اس لیے ایک طرح سے آپ ناکام حکم ران تھے۔

- واقعات کیسے اور کس ترتیب سے ہوئے؟ یہ بڑا نازک موضوع ہے اور اس سلسلے کا سب سے خطرناک اور بھول بھلیوں والا جنگل ہے۔
- اسی میں مثلاً مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بحث آجاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر برحق ہیں تو جو صحابہ آپ کے خلاف کھڑے ہوئے ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔
- ایک سوال، جو اگرچہ براہِ راست اس موضوع کا حصہ تو نہیں، لیکن اس کا کسی قدر تعلق اس موضوع سے ہے، یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد جو دور آیا اس کا معیار کیا تھا؟ عصرِ حاضر میں اس پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور کئی لوگ افراط و تفریط کے بھی شکار ہوئے ہیں۔

## زیرِ نظر گفت گو کا رخ: خلافتِ علی رضی اللہ عنہ اور احادیثِ مبارکہ

زیرِ نظر گفت گو صرف ایک پہلو سے متعلق ہے اور وہ ہے اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں اور احادیث مبارکہ۔ جو دیگر موضوعات اور پہلو ہیں، جن کی ایک مختصر فہرست ابھی ذکر ہوئی، ان پر ضمناً اگر بات آجائے تو آجائے، ورنہ بذاتِ خود ان کی طرف جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو پھر کبھی اس پر گفت گو ہو جائے گی، ہمیں اپنی زیادہ توانائیاں آج کے زندہ مسائل پر خرچ کرنی چاہییں؛ لیکن بہرحال جب ایک بحث چل پڑتی ہے تو ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے بات کرنا پڑتی ہے۔

## تنقیحِ موضوع

اس گفت گو میں جو بنیادی نکتہ زیرِ بحث رہے گا، وہ یہ ہے کہ اہل السنت والجماعت کے اصولوں کے مطابق خلفائے ثلاثہ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی ایک جائز اور

منعقد خلافت ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں امام عادل تھے (جیسا کہ صلحِ حسن رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت ایک جائز اور منعقد امارت ہے، وہ شرعی طور پر امیر المؤمنین ہیں۔) اور کسی کے امامِ عادل ہونے پر جو شرعی احکام مرتب ہوتے ہیں، وہ سب کے سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت پر بھی منعقد ہوتے ہیں۔ (ذاتی مقام و مرتبے اور حکومتی پالیسیوں کے معیار کے فرق کے باوجود یہی معاملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ خانوادۂ نبوت نے بھی اس کا لحاظ رکھا اور جن اصولوں کو وہ اپنے لیے منوانا چاہتے ہیں، ان پر خود سب سے زیادہ عمل کرکے دکھایا۔) اگر اس موضوع پر ایک حدیث بھی نہ ہوتی تب بھی مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوزیشن یہی بنتی تھی، اسی نکتے پر اتفاق سے کئی احادیث بھی موجود ہیں، انھیں کو پیش کرنا یہاں اصل مقصود ہے۔ یہ گفت گو بحث ومباحثے کا دروازہ کھولنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے ہے۔ اس کے مخاطب ہم سے اختلاف رکھنے والے نہیں ہیں، بلکہ وہ دوست ہیں جو موضوع کو سمجھنے کے لیے ہمیں کسی مدد کا اہل سمجھتے اور ہم سے مدد لینا چاہتے ہیں، جیسا کہ پیش لفظ میں ذکر کیا گیا۔

## انتخابِ احادیث کا منہج

الحمد للہ ایسا نہیں ہے کہ جو حدیث موضوع سے متعلق سامنے آئی اسے اٹھا کر یہاں درج کر دیا، بلکہ ایک خاص منہج سامنے رکھ کر احادیث کا انتخاب کیا ہے اور موضوع سے تعلق رکھنے والی کافی تعداد میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جنھیں یہاں اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ وہ یا تو موضوع تھیں یا ان کا ضعف شدید تھا۔ شدید ضعف والی حدیث یا تو لی نہیں گئی یا اس کا ضعف بیان کر دیا گیا ہے۔ جس طرح بجٹ اور حکومتی مالیات کے باب میں اعداد وشمار ایک

ایسا ہتھیار ہوتا ہے جس سے متضاد دعوے ثابت کیے جاسکتے ہیں، اعداد وشمار کے ذریعے اسی بجٹ کو صدی کا بہترین بجٹ بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور بدترین بھی، لیکن اس بنیاد پر، کہ اعداد وشمار کا استعمال الجھاؤ کے لیے بھی ہوتا ہے، اس فن یا معلومات کی اس شاخ کی اہمیت و افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا؛ تقریباً یہی معاملہ علوم الحدیث کی ایک انتہائی اہم شاخ اسماء الرجال کا بھی ہے۔ اگر اس علم کو کسی منہج کے بغیر استعمال کیا جائے تو اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اچھا خاصا الجھاؤ پیدا کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس مقصد کے لیے کرنے والوں نے اس فن کا استعمال کیا بھی ہے۔ یہاں احادیث کے انتخاب کا ایک خاص منہج پیشِ نظر رہا ہے، جس کی تفصیل کا تو موقع نہیں، لیکن مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ زیادہ معاملات میں ان اصولوں کو استعمال کیا گیا ہے جو مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے **إعلاء السنن** کے مقدمے میں ذکر فرمائے ہیں۔ جدید دور میں نقدِ حدیث پر کام کرنے والے حضرات، جن میں علامہ البانیؒ بھی شامل ہیں، کا منہج بعض معاملات میں اس سے مختلف ہوسکتا ہے، یہاں اس پر زیادہ انحصار نہیں کیا گیا؛ البتہ ان حضرات کا زیادہ رجحان چوں کہ اس طرح کی احادیث کی تضعیف کی طرف زیادہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی طرف سے بعض حدیثوں کی تصحیح کو متعدد جگہوں پر بطور استدلال کے پیش کیا گیا ہے۔ ہر ہر حدیث کی اسانید اور دیگر فنی بحثوں میں جایا جائے تو ایک ایک حدیث پر بات بہت لمبی ہوسکتی ہے، اس لیے زیادہ تر اس سے گریز کیا گیا ہے، سوائے چند جگہوں کے۔ اصولِ حدیث کے خود استعمال کرنے کے بجائے ائمۂ فن جیسے ذہبیؒ، ہیثمیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ کی طرف سے صادر کیے گئے احکام کو ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور عموماً جدید دور کے محققینِ حدیث –ان کے کام کی وقعت اور قدر وقیمت کے اعتراف کے باوجود– پر ان ائمہ کی بات کو ترجیح دی گئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا اصل مدعا، جو ان احادیث سے ثابت ہو رہا ہے، وہ ویسے بھی اصول اہل السنت کے لحاظ سے ثابت ہے۔ جب مسلمہ اصول اور قواعد کے خلاف کوئی حدیث ہوتی ہے، تو سنداً صحیح ہونے کے باوجود اسے قبول کرنے میں تردد کیا جاتا ہے۔ اگر ایک بات فی الجملہ ثابت ہو اور اسی کے بارے میں کوئی حدیث بھی آرہی ہو تو اس میں کسی قدر ضعف کو بھی برداشت کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً جس کام کا فضیلت والا ہونا فی الجملہ ثابت ہو، اس کی فضلیت میں ایسی ضعیف حدیث کو بھی قبول کر لیا جاتا ہے جس کا ضعف شدید نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ان گزارشات کا مقصد کسی سے بحث میں الجھنا نہیں ہے؛ تاہم اگر کسی صاحب کو کسی حدیث کے ضعف پر زیادہ ہی اشکال ہو تو ان سے دو مؤدبانہ درخواستیں ضرور کی جاسکتی ہیں: ایک یہ کہ جس حدیث کے ضعف پر اشکال ہے، اسی درجے بلکہ سنداً اس سے کہیں کم درجے کی حدیثیں ہماری تحریروں، خطبات و مواعظ میں بکثرت چل رہی ہیں، بلکہ انھیں عقیدے کے انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر مسئلہ صرف حدیثوں کے اسنادی ضعف کا ہے تو زبان زدِ عام، بلکہ زبان زدِ خطبا ان ''ضعیف'' حدیثوں کے خلاف جناب کی طرف سے اب تک کتنی کوشش صرف ہوئی ہے؟ کیا اب یہ ممکن ہے کہ ہم جلسوں میں بیان ہونے والی ان ضعیف حدیثوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور مشترکہ طور پر ان کے بیان کی حوصلہ شکنی کی کوشش شروع کرتے ہیں؟ دوسری درخواست یہ ہے کہ ہم نے تو اپنا اصل مدعا اور اس کی تائید میں آنے والی حدیثیں پیش کر دی ہیں، اس کے برخلاف جناب کا کوئی مدعا ہے تو پہلے اسے واضح کیجیے پھر اس کی تائید میں کوئی نص پیش کیجیے تاکہ دلیل کا تقابل دلیل سے ہو سکے، اِس طرف کی ضعیف حدیث کے مقابلے میں کوئی ضعیف ہی پیش فرما دی جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سچ مچ ضعیف حدیثیں پیش کرنے جارہے ہیں، بلکہ ایک خاص ذہنیت ایسی ہے

جو اپنی مرضی کے خلاف کسی بھی صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینے کی بنیاد تلاش کر سکتی اور مرضی کے مطابق ہونے کی صورت میں واقعی ضعیف حدیث کو پورے اعتماد کے ساتھ پیش کر سکتی ہے۔

# کچھ تمہیدی باتیں

## ۱- رسول اللہ صَلَّیٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو آنے والے واقعاتِ فتن کا پیشگی علم دیا گیا تھا

اس طرح کی احادیث خاصی تعداد میں ہیں کہ رسول اللہ صَلَّیٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو اپنے بعد پیش آنے والے واقعات کا پیشگی علم کافی تفصیل سے دیا گیا تھا اور اس کا بڑا حصہ آپ نے صحابہ کے سامنے بیان بھی فرمایا۔ مثلاً:

❖ **صحيح البخاري** میں حضرت اسامہ بن زید رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صَلَّیٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مدینہ منورہ کے ٹیلوں پر تشریف لے گئے اور فرمایا کیا تمھیں وہ کچھ نظر آرہا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ صحابہ نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے گھروں میں فتنے ایسے واقع ہو رہے ہیں، جیسے بارش برستی ہے۔[۱]

---

۱ - **صحيح البخاري** ہی کے ایک جگہ الفاظ یہ ہیں: عن أسامة بن زيد رضي الله عنهما، قال: أشرف النبي صلى الله عليه وسلم على أطم من آطام المدينة، فقال: «هل ترون ما أرى» قالوا: لا، قال: «فإني لأرى الفتن تقع خلال بيوتكم كوقع القطر». (كتاب الفتن، باب قول النبي ﷺ: «ويل للعرب من شر قد اقترب»، رقم: ۷۰۶۰۔)

❖ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی بھی ایسا فتنہ جس کے قائد کے ساتھ لوگوں کی تعداد تین سو یا اس سے اوپر تھی، اس کے بارے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔[1]

❖ حضرت عمرو بن الاخطب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا، ظہر کے بعد بھی خطبہ جاری رکھا یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا، عصر کے بعد بھی مغرب تک آپ نے خطبہ جاری رکھا۔ اس خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک ہونے والے امور بیان فرمائے، عمرو بن اخطب کہتے ہیں ہم سے جس کو جتنا زیادہ یاد رہا، اتنا ہی وہ زیادہ علم والا ہے۔[2]

❖ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے، جسے امام بخاری نے بھی متعدد جگہوں پر روایت کیا ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان الله ماذا أنزل اللية من الفتن وماذا فتح من الخزائن.[3]۔(سبحان اللہ،

---

[1] - **سنن أبي داود** کے الفاظ ہیں: والله ما أدري أنسي أصحابي، أم تناسوا؟ «والله ما ترك رسول الله ﷺ من قائد فتنة، إلى أن تنقضي الدنيا، يبلغ من معه ثلاث مائة فصاعدا، إلا قد سماه لنا باسمه، واسم أبيه، واسم قبيلته».(كتاب الفتن،باب ذكر الفتن ودلائلها،رقم:۴۲۴۳۔)

[2] -**صحيح مسلم**،حدیث نمبر:۲۸۹۲، آگے حدیث کا متن آ رہا ہے۔

[3]-**صحيح البخاري**،كتاب العلم،باب العلم والعظة بالليل،رقم:۱۱۵۔

یعنی آج کی رات عجیب سی لگ رہی ہے، آج بہت سے خزائن بھی کھولے گئے ہیں اور کئی فتنے بھی نازل ہوئے ہیں۔) اُس وقت فتنے نازل ہونے سے مراد یہ ہے کہ بعد میں نازل ہونے والے فتنے رسول اللہ ﷺ کو دکھائے گئے تھے۔

بہر حال اس موضوع پر کافی احادیث جمع کی جاسکتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو بعد کے واقعات کے بارے میں بہت ساعلم دیا گیا ہے، اس لیے عہد رسالت کے بعد کے واقعات کو سمجھنے کے لیے حدیث نبوی کی طرف مراجعت بہت ضروری ہے۔

## ۲- کیا اس موضوع پر احادیث پیش کرنا غلط ہے؟

بعض حضرات نے کچھ عرصہ قبل ایک نئی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، ہو سکتا ہے کچھ عرصے میں یہ بات باقاعدہ فلسفہ بن جائے، اس لیے اس پر کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر حدیثیں پیش کرنا درست ہی نہیں ہے، بلکہ بقول ان کے شاید اس طرح کی حدیثیں روایت کرنے والوں کا منہج ہی ٹھیک نہیں تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت حذیفہؓ کے ذوق میں فرق تھا اور ان کا خیال ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کا ذوق زیادہ بہتر ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے **سنن أبي داود** کی ایک روایت سے استدلال کیا ہے جو پوری کی پوری یہاں پیشِ خدمت ہے:

> عن عمرو بن أبي قرة، قال: كان حذيفة بالمدائن فكان يذكر أشياء قالها رسول الله صلى الله عليه وسلم لأناس من أصحابه في الغضب، فينطلق ناس ممن سمع ذلك من حذيفة فيأتون سلمان فيذكرون له قولَ حذيفة، فيقول سلمان: حذيفةُ أعلم بما يقول،

فيرجعون إلى حذيفة فيقولون له قد ذكرنا قولك لسلمان فما صدّقك ولا كذّبك، فأتى حذيفة سلمان وهو في مبقلة فقال: يا سلمان، ما يمنعك أن تصدقني بما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فقال سلمان: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يغضب فيقول في الغضب لناس من أصحابه، ويرضى فيقول في الرضا لناس من أصحابه، أما تنتهي حتى تورث رجالا حب رجال ورجالا بغض رجال، وحتى توقع اختلافا وفرقة؟ ولقد علمت أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خطب فقال: «أيما رجل من أمتي سببته سبة، أو لعنته لعنة في غضبي، فإنما أنا من ولد آدم أغضب كما يغضبون، وإنما بعثني رحمة للعالمين، فاجعلها عليهم صلاة يوم القيامة» والله لتنتهين أو لأكتبن إلى عمر.[1]

عمرو بن ابی قرة کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہؓ مدائن میں تھے تو بعض اوقات وہ ایسی باتیں بھی ذکر کر دیا کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے بعض لوگوں سے غصے کی حالت میں فرمائی ہوتی تھیں۔ یہ باتیں سن کر بعض لوگ حضرت سلمانؓ کے پاس جاتے اور ان سے اس کا ذکر کرتے۔ حضرت سلمانؓ کہتے کہ حذیفہ جو کہتے ہیں انھیں کو اس کا زیادہ پتا ہو گا۔ وہ لوگ پھر حضرت حذیفہؓ کے پاس آ کر بتاتے کہ سلمان نے تو آپ کے قول کی تصدیق یا تکذیب نہیں کی۔ ایک دفعہ حضرت حذیفہؓ، حضرت سلمانؓ کے پاس ان کی کھیتی میں آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنی ہوئی بات کی تصدیق آپ کیوں

---

[1] - **سنن أبي داود**،كتاب السنة،باب في النهي عن سبِّ أصحاب رسول الله–صلى الله عليه وسلم،رقم:۴۶۵۹۔

نہیں کرتے؟ حضرت سلمانؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات غصے میں ہوتے تھے اور غصے کی حالت میں اپنے بعض ساتھیوں کو کوئی بات کہہ دیتے تھے اور کبھی خوشی میں ہوتے تو اس حالت میں کوئی بات ارشاد فرمادیتے۔ کیا تم بعض کے دلوں میں بعض کی محبت اور بعض کے دلوں میں بعض کی نفرت ڈالنے اور اختلاف پیدا کرنے سے باز نہیں آؤ گے؟ حالاں کہ آپ کو پتا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ اپنی امت میں سے کسی شخص کو میں نے غصے میں برا بھلا کہا ہو یا اس پر لعنت کی ہو تو میں بھی آدم کی اولاد میں سے ہوں۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے جیسے دوسروں کو آتا ہے اور اللہ نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے، لہٰذا اس (غصے کی بات) کو ایسے لوگوں کے حق میں قیامت کے دن باعثِ رحمت بنا دیجیے۔ (اے حذیفہ) تم ایسی باتیں بیان کرنے سے رک جاؤ، وگرنہ میں حضرت عمر کو خط لکھ دوں گا۔

لیکن اس معاملے میں سب سے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہاں تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی غصے اور خوشی میں کہی ہوئی بات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمارہے ہیں، جب کہ خود اسی **سنن أبي داود** میں خود رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد موجود ہے کہ اس طرح کی حالت میں آپ کی زبان سے صادر ہونے والے الفاظ کی کیا حیثیت ہے؟ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ میں جو بات بھی رسول اللہ ﷺ سے سنتا تھا اسے لکھ لیتا تھا، مقصد یہ ہوتا تھا کہ اسے یاد کرلوں (ظاہر ہے کہ یاد کرنے کا مقصد آگے بتانا ہی ہوگا)۔ قریش کے کچھ لوگوں نے مجھے لکھنے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ کیا تم رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی ہر بات لکھ لیتے ہو، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ بھی بشر ہیں، آپ غصے اور خوشی ہر طرح کی حالت میں بات کرتے ہیں۔ میں لکھنے سے (وقتی طور پر) رک تو گیا، لیکن یہ اشکال خود رسول اللہ ﷺ کی

خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے اپنی انگلی سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ لکھتے رہو، اس لیے کہ اس زبان سے حق کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔[1] مطلب یہ کہ عام لوگ تو غصے یا خوشی کی حالت میں مغلوب ہو کر خلافِ حقیقت بات کہ دیتے ہیں، میری زبان کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اس لیے بات اتنی سادہ نہیں ہے کہ چوں کہ آپ نے یہ بات غصے کی حالت میں فرمائی ہو گی اس لیے غیر معتبر ہو گی۔ در حقیقت یہاں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا جو اختلاف ہے وہ خود روایت کے سیاق سے واضح ہو رہا ہے کہ مناقب یا پیش گوئیوں کی حدیثوں کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ مخصوص نوعیت کے ارشادات کے بارے میں ہیں، جن میں اظہارِ ناراضی کے طور پر یا تو کسی لفظ کے مجازی معنی مراد لیے گئے ہوتے ہیں یا اس کا کسی مخصوص صورتِ حال سے تعلق ہوتا ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا خدشہ تھا (اور عوامی مزاج کے اعتبار سے یہ خدشہ بالکل بجا تھا) کہ بعض لوگ ان الفاظ کو حقیقی یا عمومی معنی پہنا کر شخصیات کے بارے میں غیر مناسب آرا قائم کر لیں گے۔ اس کی مثال دی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حضرت معاذؓ کے بارے میں پتا چلا کہ آپ نماز میں قراءت، طویل کرتے ہیں تو اظہارِ ناراضی کے طور پر حضرت معاذؓ کے لیے "فتّان" کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس کا ایک متعین سیاق ہے، اور مقصد اس خاص عملی غلطی کو "فتنہ" قرار دینا ہے، لیکن کوئی بد فہم یہ اخذ کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو فتّان کا باقاعدہ لقب دے دیا ہے۔ اسی کی مثال علامہ ابن رسلان نے **سنن أبي داود** کی شرح میں بخاری و مسلم وغیرہ کی مشہور حدیث سے دی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجۃ الوداع سے فراغت کے

---

[1]- **سنن أبي دواد**، کتاب العلم، باب في کتاب العلم، رقم: ۳۶۴۶۔

بعد مدینہ منورہ کی طرف واپسی کا وقت ہوا تو آپ کو بتایا گیا کہ حضرت صفیہؓ کو ایام آ گئے ہیں، یعنی انھوں نے ابھی تک طوافِ وداع نہیں کیا، جس کی وجہ سے شاید رکنا پڑ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے یہ سمجھا کہ شاید انھوں نے طوافِ زیارت بھی ابھی تک نہیں کیا، اس لیے ایام کا سنتے ہی آپ نے فرمایا "عَقْرَى حَلْقَى" (وہ عورت جو اس قابل ہے کہ زخمی ہو اور اس کے گلے میں کچھ لگے)۔ آپ کو بتایا گیا کہ دس ذی الحجہ کو انھوں نے طوافِ زیارت کر لیا تھا (ایسی حالت میں طوافِ وداع معاف ہو جاتا ہے) آپ نے فرمایا پھر کوئی بات نہیں۔ اب یہاں آپ نے حضرت صفیہؓ کے لیے جو لفظ بولے ہیں وہ بظاہر سخت ہیں، لیکن اس طرح کے سیاق میں ایسے الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں جیسے عورتیں اپنے بچوں کو کھلاتے ہوئے کہہ دیا کرتی ہیں "اے گندا بچہ"، ظاہر ہے سچ مچ اسے گندا کہنا مقصود نہیں ہوتا۔[1]

---

[1] - چناں چہ ابن رسلان (م: ۸۴۴) **سنن أبي داود** کی شرح میں اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أي: كان يحصل له الغضب، فيقول في حال غضبه لأناس من أصحابه بما يحصل به الزجر والردع على سبيل التأديب لهم، وليس فيه ضرر لهم، كقوله ليتيمة أم سليم: "لا كبر سنك" أي: لا كبر سنك كبرة تعودي بها إلى أرذل العمر، كما كان -صلى اللهَّ عليه وسلم- يتعوذ من أن يرد إلى أرذل العمر وقوله: "عقرى حلقى" ، و"تربت يمينك" مما هو جارٍ على اللسان حال الغضب من غير قصد الوقوع للمخاطب به.(ويرضى فيقول في) حال (الرضا لناس من أصحابه) ممن وقع منه فسق قاصر بينه وبين اللهَّ: لا تلعنوه، ونحوه، كقوله لشارب الخمر المضروب:

یہاں جو حدیثیں پیش کی جائیں گی ان کا تعلق یا تو مناقبِ صحابہ سے ہے، یا رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ ان پیش گوئیوں سے ہے جو آپ نے واقعات کے ظہور سے بہت پہلے بیان فرمادی تھیں۔ ان کا مضمون ہی بتارہا ہوتا ہے کہ یہ بات وحی کی بنیاد پر کہی جارہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرمارہے ہیں کہ ابو بکر و عمر اور فلاں فلاں جنتی ہیں، بلال کے قدموں کی آہٹ مجھے جنت میں سنائی دی ہے تو یہ امکان نہیں ہے کہ محض کسی وقتی خوشی سے متأثر ہو کر ایسا فرمادیا ہو۔ اسی طرح واقعات کے سامنے آنے سے پہلے ہی انھیں بیان کرنا واضح طور پر ان کے وحی پر مبنی ہونے کی دلیل ہے۔ بہت کم پیش گوئیاں ایسی ہوں گی جن کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ یہ بات محض حالات کا بہاوٴ دیکھ کر آپ نے فرمائی ہوگی؛ اس لیے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا اس طرح کی حدیثوں سے کوئی تعلق نہیں۔ احادیثِ مناقب اور احادیثِ فتن سے صحابہ کا مختلف مواقع پر استدلال کرنا اتنا عام ہے کہ شمار سے باہر ہے،

---

لعنه اللهّ ما أكثر ما يشرب: "لا تكن عونًا للشيطان على أخيك" ، وما في معناه إشارة إلى أن الرفق في حقه أولى من العنف والتغليظ، ثم قال لحذيفة (أما تنتهي) عن هذا الكلام (حتى تورث رجالًا) من أصحابك (حب رجال) ليسوا بمرضيين، (و) تورث (رجالًا) من أصحابك (بغض رجال) مرضيين (وحتى توقع) بين أصحابك (اختلافًا) بينهم (وفرقة) بضم الفاء، من اختلاف كلمتهم، وتشعب أهويتهم. (*شہاب الدین ابو العباس احمد بن حسین بن علی بن رسلان المقدسی الرملی الشافعی*(م ۸۴۴ھ)، **شرح سنن أبي داود** (*الفیوم، مصر:* دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث،۲۰۱٦ء)،۱۸:۱٦۹۔)

اس لیے محض حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے اس مخصوص سیاق کے حامل اثر کی وجہ سے اس پورے باب کو بند نہیں کیا جا سکتا۔

پھر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تو حضرت حذیفہ کو دھمکی دے رہے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تمھاری شکایت کر دوں گا، اور دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ، خود حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے احادیثِ فتن کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ خود حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کوئی غیر ذمہ دار آدمی نہیں تھے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رازوں کے بارے میں ان پر اعتماد کیا تھا، جو بات نہیں بتانے کی تھی، وہ انھوں نے عمر کو بھی نہیں بتائی۔

## ۳۔ کیا پیش گوئیوں سے خلافت منصوص ہو گئی ہے

اہل السنت والجماعت کے مذہب کے مطابق، خلافت منصوص نہیں ہوتی، اس لیے خلیفہ لوگوں کا مقرر کردہ ہوتا ہے، اللہ کا مقرر کردہ نہیں ہوتا۔ اہل السنت کے نزدیک خلافت اپنی ذات میں ایک انتظامی منصب ہے۔ جب کہ اہلِ تشیع کے نزدیک امامت ایک بہت اعلیٰ روحانی منصب ہے، اس لیے امام مأمور من الناس نہیں، بلکہ مأمور من اللہ ہوتا ہے، اس لیے اس پر نص کا ہونا ضروری ہے۔ اہل السنت والجماعت کے ہاں خلافت کے منصوص نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے جس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہو، وصیت فرمائی ہو، بطور ولی عہدی فرمایا ہو کہ میرے بعد فلاں اور اس کے بعد فلاں کو خلیفہ بنایا جائے؛ تاہم بطور خبر اور پیشین گوئی چاروں خلفاے راشدین کے بارے میں متعدد حدیثیں موجود ہیں، ان کے ادوار میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بھی حدیثیں موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ان پیشین گوئیوں میں چوں کہ امت کو کہیں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ فلاں موقع پر فلاں شخص کو خلیفہ

بنانا؛ اس لیے ان حدیثوں سے خلافت کے غیر منصوص ہونے کے اصول پر زد نہیں پڑتی۔ البتہ ان کے ادوار میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں آپ کے ارشادات بھی ہیں، ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ان کے حکمِ شرعی کی بھی تعیین ہوتی ہے۔ یہ دونوں قسم کی باتیں ان واقعات کو سمجھنے کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہیں، بلکہ آگے چل کر ہم شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کا نظریہ پیش کریں گے کہ بعض خلفا کو بعض خاص حالات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے خاص ہدایات بھی دیں تھیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غیر خلیفہ صحابہ کو بھی آپ نے ان کے مزاج وغیرہ کے مد نظر یا کسی خاص وجہ سے ہدایات دی تھیں کہ جب ایسا ہو تو تم ایسا کرنا۔ مثلاً حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بعض ہدایات دیں، مثلاً یہ فرمایا کہ جب مصر میں دو شخصوں کو ایک اینٹ کے برابر جگہ میں جھگڑتے ہوئے دیکھو تو مصر کو خیر باد کہہ دینا۔[1]

## ۴- کیا ان احادیث کا مطالباتِ شریعت سے تعلق ہے؟

پھر رسول اللہ ﷺ کو وحی کی بنیاد پر عطا فرمودہ علم دو طرح کا ہے: ایک وہ جس سے اللہ کا کوئی حکم یا شریعت کا کوئی مطالبہ سامنے آتا ہے۔ ایسے علم کا بوقتِ ضرورت اظہار،

---

۱ - **صحیح مسلم**، كتاب فضائل الصحابة، باب وصية النبي ﷺ بأهل مصر رقم: ۲۵۴۳۔ پوری حدیث یوں ہے: عن أبي ذر، قال: قال رسول الله ﷺ: «إنكم ستفتحون مصر وهي أرض يسمى فيها القيراط، فإذا فتحتموها فأحسنوا إلى أهلها، فإن لهم ذمة ورحما» أو قال «ذمة وصهرا، فإذا رأيت رجلين يختصمان فيها في موضع لبنة، فاخرج منها» قال: فرأيت عبد الرحمن بن شرحبيل بن حسنة، وأخاه ربيعة يختصمان في موضع لبنة فخرجت منها.

واجب اور چھپانا ناجائز ہے۔ دوسری قسم کا علم وہ ہے جس سے اس طرح کا کوئی مطالبۂ شریعت سامنے نہیں آتا، مثلاً آنے والے کسی واقعہ کی خبر دی گئی ہے۔ اس طرح کے علم کا کتمان یعنی اسے چھپانا گناہ نہیں ہے۔ ایسے علم کے بیان کرنے میں صحابہ نے حالات اور موقع محل کو بھی دیکھا ہے اور اس میں ہر صحابی کے اپنے منفرد مزاج کی بھی عکاسی ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی معروف روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن حاصل کیے، ان میں سے ایک کو تو میں نے انڈیل دیا، یعنی کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کر دیا اور دوسرے کی اگر اشاعت کروں تو خطرہ ہے کہ میرا گلا کاٹ دیا جائے۔[1] یہ دوسرے برتن کا علم جو بھی ہو، یہ بات واضح ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اللہ کا اپنے بندوں سے مطالبہ واضح ہوتا ہو، یعنی اس میں حکمِ شریعت بیان کیا گیا ہو۔ علم کے اس برتن کے بارے میں ایک امکان یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے برے حکام کے بارے میں تفصیلی جزئیات کے ساتھ بتایا تھا، لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کا پورا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ مثلاً **صحيح البخاري** میں جہاں حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اس امت کی ہلاکت قریش کے بعض نوعمروں کے ہاتھوں ہوگی، وہاں بخاری ہی کی ایک روایت میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ

---

[1] - **صحيح البخاري**، كتاب العلم، باب حفظ العلم، رقم: ۱۲۰۔ الفاظ یوں ہیں: " حفظت من رسول الله ﷺ وعاءين: فأما أحدهما فبثثته، وأما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم ."

اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ یہ بنو فلاں اور بنو فلاں ہیں۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے جتنا بیان فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والا علم اس سے مفصل تھا۔

ایسی روایتیں بھی اس طرح کی حدیثوں میں ہیں جہاں کسی آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا گیا ہوتا ہے، وہیں بعض اوقات اس کا حکمِ شرعی بھی اسی روایت سے ثابت ہو رہا ہوتا ہے، لیکن عموماً وہ حکمِ شرعی ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے سامنے وہ خاص حدیث نہ بھی ہو، تب بھی شریعت کے عام اصولوں میں غور کر کے وہ حکم جاننا ممکن ہوتا ہے؛ مثلاً اگر پیش گوئیوں کی کسی حدیث سے قتلِ عثمانؓ کی شناعت معلوم ہو رہی ہے، تو فرض کرلیں وہ حدیث نہیں بھی ہے، تب بھی اس فعل کا شنیع ہونا بہت واضح ہے؛ اس لیے ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی کو بعد کے واقعات کے حوالے سے کسی حدیث کا علم تھا، اس میں کسی درجے میں کسی خاص واقعے کا حکم بھی معلوم ہو رہا تھا، لیکن کسی خاص وقت تک انھوں نے بیان نہیں کیا، پھر کسی داعیے کے تحت انھوں نے اسے بیان کر بھی دیا۔

بہر حال اس طرح کی احادیث کا کتمان گناہ تھا یا نہیں، وہ براہِ راست بیانِ شریعت سے متعلق ہیں یا نہیں، چوں کہ مبنی بہر حال وحی پر ہیں، اس لیے ان میں غلطی کا امکان نہیں ہے اور اس دور کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے یہ احادیث ہمارے لیے بہت بڑی راہ نمائی کا ذریعہ ہیں، اس لیے اس گفت گو کا موضوع ان احادیث کو بنایا گیا ہے۔

---

[1]-**صحيح البخاري**، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، رقم:۳۶۰۵۔

## ۵- پیشین گوئیوں کے باوجود خلفاے راشدین کا عمومی دلیلوں سے استدلال

یہیں سے ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی مناسب ہو گا، وہ یہ کہ اہل السنت کے ہاں عمومی طور پر اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خلفاے راشدین اور ان کی خلافتوں کے بارے میں پیش گوئیاں فرمائی تھیں، لیکن اس کے باوجود بہت سی جگہوں پر ہمیں نظر آئے گا کہ یہ خلفا ان خاص احادیث سے استدلال کے بجاے عمومی دلیلوں سے استدلال کر رہے ہیں، بلکہ متعدد جگہوں پر ان حضرات کے طرزِ عمل سے بادی النظر میں ایسے لگے گا جیسے یہ حدیث ان کے پیشِ نظر ہے ہی نہیں، اور وہ معاملے کو مکمل رائے کے انداز میں لے رہے ہیں، حالاں کہ وہ حدیث بھی اپنی جگہ ثابت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اس حدیث کو بھی ثابت مانا جاتا ہے اور اس واقعے میں کوئی توجیہ بھی کر لی جاتی ہے، یعنی تطبیق کی کوئی راہ نکال لی جاتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکر و حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا کی خلافت کی طرف اشارہ کرنے والی متعدد حدیثیں موجود ہیں، مگر متعدد مواقع ایسے ملتے ہیں کہ ان کو مسندِ خلافت پر فائز کرنے پر یا ان کے کسی فیصلے کے جواز کے لیے ان حدیثوں کا حوالہ دیا جانا نظر نہیں آتا، بلکہ دیگر دلیلوں سے استدلال ہوتا نظر آتا ہے۔ سقیفۂ بنو ساعدہ میں بحث کے دوران میں اور دلائل تو پیش ہو رہے ہیں، لیکن خوخة أبي بكر والی حدیث یا اس جیسی حدیثوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، حالاں کہ حدیث اپنی جگہ ثابت اور بالکل صحیح ہے اور اس کو حضرت ابو بکر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کی خلافت کی طرف اشارہ سمجھنا بھی صحیح ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے: اقتدوا باللذَین من بعدي

أبي بكر وعمر.[1] (میرے بعد جو دو ہوں گے ان کی اقتدا کرو، یعنی ابو بکر و عمر)۔ لیکن بہت سے مواقع پر ان حضرات کے دورِ خلافت میں ان کے کسی فیصلے کے جواز کے لیے اور دلیلیں تو ملتی ہیں، اس طرح کی کسی حدیث کا حوالہ نہیں ملتا۔ عراق کی مفتوحہ زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کیا جائے یا نہیں، اس پر خاصی بحث بھی رہی، مشاورت بھی ہوئی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ یہ زمینیں فوجیوں میں تقسیم نہ کی جائیں، بعد میں اکثریت کا مشورہ بھی یہی آیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ استدلال نہیں کیا کہ تمھیں تو میری اقتدا کا حکم دیا گیا تھا، لہٰذا خاموشی سے میری تجویز مان لو، بلکہ سب کو کھل کر اپنی رائے پیش کرنے کا موقع دیا۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی تمھیں قمیص پہنائیں، پھر کچھ لوگ تم سے اس قمیص کے اتارنے کا مطالبہ کریں، تو ان کے کہنے پر یہ قمیص مت اتارنا۔ قمیص سے مراد خلافت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک عہد کیا ہے، میں اس پر ثابت قدم رہنے والا ہوں۔[2] لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مختلف مواقع پر لوگوں کے سامنے اپنے حق میں استدلال کرتے ہوئے

---

[1] -**سنن الترمذي**، أبواب المناقب، رقم: ۳۶۶۲۔

[2] -مثلاً ترمذی کی ایک روایت کے لفظ ہیں: قال عثمان يوم الدار: إن رسول الله ﷺ قد عهد إلي عهدا فأنا صابر عليه. امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔(**سنن الترمذي**، أبواب المناقب، باب في مناقب عثمان بن عفان، رقم: ۳۷۱۱۔)

قمیص نہ اتارنے سے مراد خلافت سے مستعفی نہ ہونا ہے اور اس عہد سے مراد قتال نہ کرنا ہے، چناں چہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہ تو خلافت سے مستعفی ہوئے، نہ قتال ہی کا اعلان فرمایا۔

پیش گوئیوں والی ان حدیثوں کا حوالہ دینے کے بجائے عمومی دلیلوں سے استدلال کر رہے ہیں۔ کہیں نظر آتا ہے کہ متعدد صحابہ سے صلاح مشورہ کر رہے ہیں کہ اس حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؛ مثلا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا، جس کا مکالمہ ابن ابی شیبہ نے کچھ اس طرح سے نقل کیا ہے:

> ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب محصور تھے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مغیرہ بن اخنس نے مجھے جو مشورہ دیا ہے، تمھاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ میں نے پوچھا انھوں نے کیا مشورہ دیا ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ انھوں نے کہا ہے کہ ان لوگوں کا مطالبہ آپ کے مستعفی ہونے کا ہے، اگر آپ مستعفی ہو جائیں تو یہ لوگ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے وگرنہ یہ لوگ آپ کو قتل کر دیں گے (یعنی مجھے جان بچانے کے لیے مستعفی ہو جانا چاہیے)۔ میں نے پوچھا اگر آپ مستعفی ہو جائیں تو ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کیا جنت و دوزخ ان کے اختیار میں ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا مستعفی نہ ہونے کی صورت میں آپ کی جان لینے سے زیادہ بھی کچھ کر سکتے ہیں، انھوں کہا نہیں۔ میں نے کہا کیا آپ اسلام میں یہ سنت جاری کریں گے کہ جب بھی کسی حاکم پر کچھ لوگ ناراض ہوں تو اسے اتار دیں؟ جو قمیص اللہ نے آپ کو پہنائی ہے وہ مت اتاریے۔[1]

---

[1]-**مصنف ابن أبي شيبة** کے لفظ یہ ہیں:عن نافع، قال: حدثني عبد الله بن عمر، قال: قال لي عثمان وهو محصور في الدار: ما تقول فيما أشار به علي المغيرة بن الأخنس؟ قال: قلت: وما أشار به عليك؟ قال: إن هؤلاء القوم يريدون خلعي فإن خلعت تركونيوإن لم أخلع قتلوني. قال: قلت: أرأيتَ إن خلعتَ أتُراك مخلّدا في الدنيا؟ قال: لا ، قلتُ: فهل يملكون الجنة والنار؟ قال: لا ، قلتُ: أرأيت إن لم تخلع

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے ہاتھ روکنے یعنی قتال نہ کرنے کا مشورہ دیا، چناں چہ ابن ابی شیبہ ہی کی ایک روایت میں ہے:

> ابو لیلی کندی کہتے ہیں جب حضرت عثمانؓ محصور تھے تو میں نے ایک دن دیکھا کہ آپ لوگوں پر ظاہر ہوئے اور کہا لوگو! مجھے قتل نہ کرو، مجھ سے معذرت طلب کرلو۔ اللہ کی قسم اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو کبھی بھی اکٹھے دشمن کے خلاف جہاد اور قتال نہیں کرپاؤ گے اور آپس میں الجھ جاؤ گے۔ پھر حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کو (مشورے کے لیے) بلایا تو انھوں نے کہا ہاتھ روکے رکھیے، ہاتھ روکے رکھیے (یعنی قتال نہ کیجیے)، اس میں آپ کے لیے حجت زیادہ مضبوط ہوگی۔ پھر وہ لوگ داخل ہوئے اور آپ کو شہید کر دیا۔[1]

---

أيزيدون على قتلك؟ قال: لا، قلت: أرأيتَ تسنّ هذه السنة في الإسلام كلما سخط قوم على أمير خلعوه. ولا تخلع قميصا قمصكه الله. ( **مصنف ابن أبي شيبة**، كتاب الفتن، ماذكر في عثمان، رقم:٣٧٦٥٦۔)

[1]- ابن ابی شیبہ کے لفظ یہ ہیں: سمعت أبا ليلى الكندي، يقول: رأيت عثمان اطلع على الناس وهو محصور فقال: أيها الناس لا تقتلوني واستعتبوني، فوالله لئن قتلتموني لا تقاتلون جميعا أبدا ولا تجاهدون عدوا أبدا ، لتختلفُنّ حتى تصيروا هكذا وشبك بين أصابعه {يا قوم لا يجرمنكم شقاقي أن يصيبكم مثل ما أصاب قوم نوح أو قوم هود أو قوم صالح وما قوم لوط منكم ببعيد} قال: وأرسل إلى عبد الله بن سلام فسأله فقال: الكف الكف ، فإنه أبلغ لك في الحجة فدخلوا عليه فقتلوه. (**مصنف ابن أبي شيبة**،كتاب الفتن،ما ذكر في عثمان،رقم:٣٧٦٥٨۔)

اس طرح کی مزید مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، جہاں ایک طرف نص موجود ہے اور دوسری طرف انداز ایسا ہے جیسے نص ہو ہی نہیں۔ ایسے موقع پر دونوں طرح کی باتوں میں تطبیق کا کوئی راستہ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابن عمر اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہما سے مشورہ کرنے کا یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہو گا کہ جب مشورہ کر رہے ہیں تو ثابت ہوا کہ کوئی نص موجود نہیں ہے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نص موجود ہونے اور دوسری طرف مشورہ طلب کرنے میں تطبیق کی وجہ جو بھی بیان کریں یہ الگ معاملہ ہے، لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کے امور سے نص رد نہیں ہوتی۔ مثلاً دونوں طرح کی روایات میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بسا اوقات پیشین گوئیوں میں ایک اہم معاملہ یہ بھی ہوتا ہے کہ واقعہ مکمل ہونے تک کسی درجے میں تردد کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ یہ صورتِ حال وہی ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یا نہیں۔ بعض اوقات مصداق کی یقینی تعیین واقعہ مکمل ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ یہ تو ممکنہ توجیہ کی ایک مثال ذکر کی ہے، بہر حال کوئی نہ کوئی توجیہ کر لی جاتی ہے اور اس طرح کے واقعات کو نص کے رد کرنے کا قرینہ نہیں بنایا جاتا۔ مگر معلوم نہیں کیوں جب اسی نوعیت کا معاملہ حضرت علیؓ کے بارے میں سامنے آتا ہے بعض حضرات کی سوچ کا رخ بالکل مختلف ہو جاتا ہے اور نص کو رد کرنے کے لیے ان کی ذہانت کو عجیب وغریب قرائن نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ دیکھیں جی، اگر اس طرح کی حدیثیں ہوتیں تو فلاں فلاں موقع پر حضرت علیؓ کا یہ انداز کیوں ہوتا، اس طرح کی بعض باتوں کا جواب اپنے موقع پر ان شاء اللہ عرض کریں گے۔ یہاں چوں کہ صرف اصولی، عمومی اور تمہیدی باتیں ہو رہی ہیں، اس لیے یہ عرض کر دیا کہ اگر نص اپنے طریقے سے ثابت ہو تو اس طرح کے واقعات کی بنیاد پر اسے

رد کرنے کے بجائے تطبیق کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے، وگرنہ دیگر خلفا کے بارے میں بھی بہت سی نصوص کو رد کرنا پڑ جائے گا۔

## حالات کی خرابی (فتن) کب اور کیسے شروع ہوئی؟

### حدیثِ حذیفہ رضی اللہ عنہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکالمہ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں بعد میں آنے والے واقعات بیان فرمائے، حفظه من حفظه و نسيه من نسيه.[1] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ذہن سے نکل چکا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا، لیکن جب رونما ہو جاتا ہے تو پھر یاد آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تھی۔ اس کا بھی مطلب یہ ہے کہ جو آنے والے واقعات تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا خاصی تفصیل سے علم دیا گیا تھا اور بعض صحابہ کو بھی ان کا علم تھا، جن میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سر فہرست ہیں۔

---

[1] - **صحيح مسلم** کے الفاظ ہیں: "عن شقيق، عن حذيفة، قال: «قام فينا رسول الله ﷺ مقاما، ما ترك شيئا يكون في مقامه ذلك إلى قيام الساعة، إلا حدث به»، حفظه من حفظه ونسيه من نسيه." (كتاب الفتن و أشراط الساعة، باب إخبار النبي ﷺ فيما يكون إلى قيام الساعة، رقم: ٢٨٩١۔) **صحيح مسلم** ہی میں ابو زید عمرو بن اخطب کی روایت کے الفاظ ہیں: " صلى بنا رسول الله ﷺ الفجر، وصعد المنبر فخطبنا حتى حضرت الظهر، فنزل فصلى، ثم صعد المنبر، فخطبنا حتى حضرت العصر، ثم نزل فصلى، ثم صعد المنبر، فخطبنا حتى غربت الشمس، فأخبرنا بما كان وبما هو كائن فأعلمنا أحفظنا."

## خطباتِ عمر رضی اللہ عنہ اور حالات کی نبض شناسی

دوسری اہم بات یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بعض خطبوں سے اور ان کی بعض باتوں سے اس وقت کے حالات کے رخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست ہر کوئی جانتا ہے کہ ناممکن ہے کہ ان کو اندازہ نہ ہو کہ میرے بعد حالات کدھر کو جا سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبوں سے احساس ہوتا ہے کہ ان کو کچھ احساس اور ادراک تھا۔

### جملۂ معترضہ: زیرِ بحث موضوعات میں احادیث و تاریخ کا درجہ

اس لیے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ان موضوعات کو سمجھنے کے لیے ہمارا بنیادی ماخذ یہ احادیث ہونی چاہییں اور تاریخ کی حیثیت ثانوی ہونی چاہیے۔ تاریخ کوئی بری چیز نہیں ہے کہ اس کا انکار کر دیا جائے، کیوں کہ حدیث بھی بعض امور کی وضاحت میں تاریخ کی محتاج ہے۔ حدیث کو پرکھنے کے لیے اسماء الرجال کی ضرورت ہوتی ہے اور اسماء الرجال کیا ہے؟ یہ آدمی کب پیدا ہوا؟ اس کا کب انتقال ہوا؟ وہ کیسا تھا؟ کیسی زندگی تھی؟ یہ سب کچھ تاریخ ہی ہے۔ اس لیے قدیم محدثین اسماء الرجال کو کہتے ہی تاریخ تھے۔ مثلاً امام بخاریؒ کی اسماء الرجال پر مشہور کتاب ہے، اس کا نام ہے: **التاریخ الکبیر**. یہ تاریخ اس معنیٰ میں نہیں ہے کہ فلاں سال میں یہ ہوا؟ نہیں، اس میں واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ اسماء الرجال پر ہے کہ فلاں راوی ثقہ ہے، فلاں نہیں ہے۔ اسماء الرجال پر حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھی گئی غالباً یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ تو علمِ حدیث بھی ایک معنیٰ میں تاریخ کا محتاج ہے، لیکن بہرحال تاریخ میں جو کچھ درج ہوتا ہے، اس میں تاریخ لکھنے والے اتنی چھان پھٹک کا اہتمام نہیں کرتے، ان کا معیار اتنا سخت نہیں ہوتا جتنا کہ محدثین کا ہوتا ہے، ویسے بھی تاریخ میں

کسی واقعے کے بارے میں عام انسانوں کا بیان ہوتا ہے اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا بیان ہوتا ہے؛ اس لیے ہمیں ان چیزوں کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو تفصیل سے بیان فرمایا اور صحابہ کو جو اس کا ادراک تھا، اسے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے؛ یعنی ان واقعات کے ہونے سے پہلے صحابہ کیا کہ رہے تھے؟ واقعات ہونے کے بعد صحابہ نے کیا کہا؟ رسول اللہ ﷺ کی کس بات کا حوالہ دیا؟ حاصل یہ کہ حالات کو سمجھنے کے لیے دو چیزوں کی مراجعت ضروری ہے: ایک رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیاں اور دوسرے صحابہ، بالخصوص کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تبصرے اور آرا۔

## تدوینِ تاریخ اور سازشی عنصر

یہاں ضمناً یہ عرض کرنا بھی مناسب ہو گا کہ اسلامی اور عربی علوم وفنون کی تدوین ایک دوسرے کے ساتھ اتنی جڑی ہوئی اور منسلک ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی ایک ہی تحریک ہے۔ کسی میں تشکیک سے دوسری میں بھی تشکیک کا راستہ بھی کھلتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر علم وفن میں بعض انتہائی کم زور بلکہ غلط باتیں بھی در آئی ہیں؛ حدیث میں انتہائی ضعیف بلکہ موضوع حدیثیں آگئی ہیں، قراءت کے نام پر صرف شاذ ہی نہیں، مضحکہ خیز لفظ ذکر کر دیے گئے، فقہ میں بالکل غیر معتبر اقوال آگئے ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر ان علوم کی تدوین ہی کو کسی سازش سے جوڑ دینا ٹھیک نہیں ہو گا۔ اسی طرح تاریخ کی کتابوں میں ہر طرح کا رطب ویابس مواد موجود ہے۔ کتبِ تاریخ میں بھی موضوع درجے کی روایات کا موجود ہونا ممکن ہے؛ اس لیے یہاں بھی آنکھیں بند کر کے ہر بات نہیں لی جائے گی، لیکن یہ تاثر کہ تاریخ کی تدوین میں جزوی طور پر ہی سہی کوئی سازشی عنصر بھی کار فرما تھا، کوئی سبائی ٹولہ تھا، جو ان سیدھے سادے تاریخ نگاروں سے اپنی مرضی کی باتیں لکھوا رہا

تھا، نہ صرف یہ کہ خلافِ واقع ہے بلکہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔ ابتدائی مؤرخین کا دیگر علوم کی تدوین میں بھی عمل دخل رہا تھا۔ بعض مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ محدث، مفسر اور فقیہ وغیرہ بھی تھے۔ اگر اس طرح کی بات کو مان لیا جائے تو پھر خدانخواستہ ان لوگوں کے بیانیے کو مدد ملے گی جو تدوینِ حدیث کو عجمی سازش اور تدوینِ فقہ کو اس وقت کے ملوک اور حکم رانوں کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ یہ مان لیا جائے کہ سبائی ٹولہ (جس کا عصرِ تدوین میں مؤثر طاقت ہونا تو دور کی بات، وجود ثابت کرنا بھی مشکل ہے) یا اس وقت کے حکم ران اپنی مرضی کی باتیں لکھواتے رہتے تھے، تو تمام علوم کی تدوین پر ہی سوال اٹھ جائیں گے؛ چناں چہ جو لوگ تاریخ کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں (اگرچہ سارا اعتماد پھر تاریخ ہی پر کرتے ہیں) انھی میں سے بعض لوگ حدیث کو بھی عجمی سازش کہنے سے نہیں چوکتے[1]۔ یہ تو ممکن ہے مخصوص حالات کی وجہ سے کسی نے کوئی بات بیان کرنے سے گریز اور سکوت کیا ہو، یا کچھ ابہام رہنے دیا ہو، مثلاً نام کی جگہ فلاں کہہ دیا ہو، مگر سارا عملِ تدوین ریموٹ کنڑول کے ذریعے چلایا جا رہا تھا یہ بات خلافِ واقعہ بھی ہے دور رس غلط نتائج کی حامل بھی۔ اگرچہ آج کے دور میں بعض ثقہ اہلِ علم کے قلم سے بھی ایسے الفاظ نکل گئے ہیں، جن سے ترشح ہوتا ہے کہ تدوینِ تاریخ میں کسی خاص معاملے میں باقاعدہ کوئی سازشی عنصر حاوی تھا، جو اس تدوین کو ایک خاص رخ پر لے جا رہا تھا، لیکن شاید انھوں نے ایسی بات کے نتائج و مضمرات پر غور نہیں فرمایا۔

---

۱۔ بالکل شروع کے ایک حاشیے میں مفتی ولی حسنؒ کی جو شہادت نقل کی گئی ہے، عبرت کے لیے اسے یہاں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال! ہمارا موضوع اس وقت تاریخ کی حجیت ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ تاریخ کو دیکھنے سے پہلے حدیثِ رسول ﷺ کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔

## آمدم بر سر مطلب؛ حدیثِ حذیفہ رضی اللہ عنہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکالمہ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے؛ **بخاری** میں بھی ہے، **مسلم** میں بھی ہے اور **مشکوٰۃ** میں بھی ذکر کی گئی ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتنوں کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے آپ نے جو فتنوں کے بارے میں سنا ہے، وہ مجھے بتائیں۔ انھوں نے کہا: "فتنة الرجل في أهله وولده وجاره تكفرها الصلاة والصيام والصدقة، والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر". (آدمی کا اپنے اہل وعیال اور پڑوس کے معاملے میں فتنہ میں پڑنا، جس کی تلافی نماز، روزہ، صدقہ اور نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا کر دیتا ہے۔) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میری مراد یہ نہیں ہے۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست تو مسلم ہے، انھیں ٹالا تو نہیں جا سکتا تھا۔) انھوں نے کہا: ليس هذا أريد، إنما أريد التي تموج كموج البحر. (میری مراد یہ نہیں، بلکہ میں تو ان فتنوں کی بات کر رہا ہوں جو سمندر کی موجوں کی طرح موج زن ہوں گے۔) یعنی میں اجتماعی اور سیاسی نوعیت کے فتنوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ سوال وجواب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں یہ معہود و مسلم تھا کہ فتنے آنے ہیں۔ ہم تو واقعاتِ فتن کے بعد کے دور میں جی رہے ہیں، اس لیے ہمیں تو پتا ہونا ہی تھا کہ یہ فتن واقع ہوئے ہیں، دورِ فاروقی میں جب کہ فتن کا ابھی ظہور بھی نہیں ہوا تھا، اگر فتن پر بات ہو رہی ہے تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھا ہے اور یہ سمجھا جارہا ہے کہ یہ بھی رسول اللہ ﷺ کے دیے گئے علم کا ایک باب ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں؛ اس لیے کہ ان فتنوں کے آگے ایک دروازہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں پوچھا کہ دروازہ کیا ہے؟ کون ہے؟ البتہ یہ پوچھا کہ وہ دروازہ کھلے گا یا ٹوٹے گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بل یُکسر. یعنی ٹوٹے گا۔ اس پر بات ختم ہو گئی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ مکالمہ اپنے شاگردوں کے سامنے نقل کیا، تو انھیں تجسس ہوا کہ کہ دروازہ کون ہے؟ اب پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا، کیوں کہ کسی کا یہ نام ہو گا۔ جب معاملہ شخصیات کا آجاتا ہے تو اس میں نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر اُس دور کی شخصیت ہو تو نزاکت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ مسروقؒ اجلّ تابعین میں سے ہیں اور عمر کے اگلے حصے میں تھے۔ انھوں نے باقی شاگردوں کے کہنے پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، تو انھوں نے بتایا کہ یہ دروازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اس بات کا پتا تھا اور اس طرح پتا کہ جیسے تمھیں یقین سے پتا ہے کہ کل آنے سے پہلے رات آئے گی۔ کما یعلم أن دون غد الليلة.[1]

---

۱ - **بخاری** کے الفاظ ہیں: حدثنا علي بن عبد الله، حدثنا سفيان، حدثنا جامع، عن أبي وائل، عن حذيفة، قال: قال عمر رضي الله عنه، من يحفظ حديثا عن النبي صلى الله عليه وسلم في الفتنة؟ قال حذيفة أنا سمعته يقول: «فتنة الرجل في أهله وماله وجاره، تكفرها الصلاة والصيام والصدقة»، قال: ليس أسأل عن ذه، إنما أسأل عن التي تموج كما يموج البحر، قال: وإن دون ذلك بابا مغلقا، قال: فيفتح أو يكسر؟ قال: يكسر، قال: ذاك أجدر أن لا يغلق إلى يوم القيامة، فقلنا لمسروق:

## خطبۂ عمر رضی اللہ عنہ اور فتنوں کی پیش قیاسی

اس میں سب سے پہلی بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ کہ دورِ فتن شروع کہاں سے ہوتا ہے؟ دورِ فتن اس دروازے کے ٹوٹنے سے شروع ہوتا ہے۔ دروازہ کھلنے سے مراد طبعی موت تھی اور دروازہ ٹوٹنے سے مراد تھی شہادت۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے علم کے مطابق پتا تھا۔ فتن سے مراد سیاسی معاملات میں کشاکشی اور اختلافات ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کی بعض باتیں بڑی حیران کن اور فراستِ عمری کا ثبوت ہیں۔ اس خطبے کے حوالے سے **صحیح مسلم** کی روایت کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ میں وہاں ہے جہاں باب ہے کہ اگر کسی آدمی نے لہسن یا پیاز کھایا ہو تو اسے مسجد میں نہیں آنا چاہیے۔ اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ ہے۔ اس خطبے کی فی الحال تشریح نہیں کی جائے گی، بلکہ ضرورت محسوس ہوئی تو آگے چل کر کچھ گفت گو ہو گی، لیکن اس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چیزوں کو دیکھ رہے تھے اور مطالعہ کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ غالباً آخری خطبہ ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں: أن عمر بن الخطاب، خطب یوم الجمعة، فذكر نبي اللهﷺ، وذكر أبا بكر. یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا۔ ان کے دور کی خوبیاں بیان کیں۔

---

[1] أكان عمر یعلم من الباب؟ فسأله فقال: نعم، كما یعلم أن دون غد اللیلة. (**صحيح البخاري**،كتاب الصوم،باب الصوم كفارة، رقم:۱۸۹۵۔)

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے خواب کا بیان اور اس کی تعبیر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خطبے میں اپنا ایک خواب بھی بیان فرمایا کہ: إني رأيت كأن ديكا نقرني ثلاث نقرات. میں نے خواب دیکھا کہ ایک مرغے نے مجھے تین چونچیں ماریں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ: وإني لا أراه إلا حضورَ أجلي. اب میرا آخری وقت قریب ہے، میں اس دنیا سے جا رہا ہوں۔

حضرت اسماء بنتِ عُمیس رضی اللہ عنہا مشہور صحابیہ ہیں اور کئی صحابہ کے نکاح میں رہی ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں بھی رہی ہیں۔ وہ خوابوں کی تعبیر کی بہت ماہر تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی بہت ماہر تھے۔ ممکن ہے انھوں نے انھی سے یہ علم حاصل کیا ہو۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں بھی رہی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے بھی اس خواب کی یہی تعبیر بیان کی۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے بعد امر خلافت کو چھے افراد کی شوریٰ کی طرف منتقل کرنا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے بعد کسی کو نام زد کر دوں، لیکن اللہ اپنے دین کو اور خلافت کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں اور کچھ اور باتیں اس حوالے سے ارشاد فرمائیں اور پھر فرمایا: فإن عجل بي أمر، فالخلافة شورى بين هؤلاء الستة، الذين توفي رسول الله ﷺ وهو عنهم راض. چھے افراد کو خلافت کے لیے نام زد کیا۔ یہ چھے افراد اصل میں وہی عشرۂ مبشرہ ہیں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے دو شخصیات کا انتقال ہو چکا ہے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما اور اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتقال کا وقت ہے۔ باقی سات افراد ہیں۔

## حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو قرابت کے باعث امر خلافت سے دور رکھنا

بظاہر ان ساتوں کو اس شوریٰ میں لینا چاہتے تھے، لیکن ان میں بہت جلیل القدر شخصیت ہیں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ۔ ان کے والد کے بارے میں آتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ شرک سے بچتے تھے اور بہت سی زندہ درگور کی جانے والی بچیوں کو انھوں نے بچایا ہے۔ جب کسی کے بارے میں پتا چلتا کہ وہ اپنی بچی کو زندہ درگور کرنے والا ہے تو یہ اس کے پاس جاتے اور کہتے کہ اس بچی کو دفن کرنے کے بجائے میرے حوالے کر دو، اس طرح وہ ان بچیوں کی جان بچا لیتے اور انھیں اپنی کفالت میں لے لیتے۔ جب بچی بڑی ہو جاتی تو دوبارہ اسے اپنے والد کے پاس لے کر جاتے، اگر وہ بچی کی اگلی ذمہ داریاں خود نبھانے کے لیے تیار ہوتا تو یہ بچی اس کے حوالے کر دیتے، وگرنہ اس کی شادی وغیرہ بھی خود ہی کراتے۔ ان سعید بن زید کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ میں اس لیے شامل نہیں کیا کہ یہ آپ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے خاندان کے کسی دور دراز کے بندے کو بھی اس میں شامل کریں۔ یہ ان کی شفافیت ہے، ورنہ جو معیار ہے، وہ وہی ہے کہ: توفي رسول الله ﷺ وهو عنهم راض. یہ بات سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ہے، لیکن ان کو شامل نہیں کیا گیا اور باقی چھے بچے۔[1]

---

۱ - ان چھے کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض روایات میں مختصر مختصر تبصرے بھی ہیں اور بڑے دل چسپ ہیں۔ مثلاً ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے ایک مکالمے میں فرماتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) شخصیت تو ٹھیک ہے، لیکن جب اسے غصہ آتا ہے تو بہت اوپر چلا جاتا ہے اور جب غصہ ختم ہوتا ہے تو بہت نیچے چلا جاتا ہے۔ یہ کوئی خامی نہیں، آدمی کا فطری مزاج ہوتا ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی خوبی کے اعتراف کے ساتھ یہ کہا کہ وہ تو منڈی میں لوگوں سے کھجوروں کے ایک ایک صاع کا

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے داخلی فتنوں کی طرف اشارات

آپ نے ایک بات فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اندازہ تھا کہ فتنوں اور تنازعات کے بیج موجود ہیں، لیکن عمر کے ہوتے ہوئے وہ سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس کے بعد فرمایا: وإني قد علمت أن أقواما يطعنون في هذا الأمر. کچھ لوگ اس خلافت کے معاملے میں طعن کرتے ہیں۔ وہ کون سے لوگ ہیں؟ أنا ضربتُهم بيدي هذه على الإسلام. میں نے انھیں اپنے ان ہاتھوں سے اسلام پر مارا ہے۔ یعنی یہ طعن کرنے والے وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مد مقابل غزوات میں آتے رہے ہیں اور ہم ان کے خلاف جہاد کرتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے بہت بعد میں جا کر — فتحِ مکہ کے بعد — اسلام قبول کیا ہے۔ یہ کون ہیں؟ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا، کیوں کہ اس کا موضوعِ زیرِ بحث سے براہِ راست تعلق نہیں ہے، البتہ شارحین نے اس پر بات کی ہے۔ فإن فعلوا ذلك فأولئك أعداء الله، الكفرة الضلال.[1] اگر انھوں نے ایسا کیا تو یہ اللہ

---

حساب کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی ہزاروں وسق کا کاروبار ہے، اس میں ایک ایک صاع کا کاروبار کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لیے کھلے دل کے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی ایسا آدمی جو نظام چلانے کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز بھی کر سکے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ والی بنا تو لوگوں کو سیدھے راستے پر لے کر چلے گا، لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں ذرا مزاح ہے۔ اس میں ذرا یہ بات ہوتی ہے کہ لوگوں کی نظر میں جو رعب سا ہوتا ہے، وہ بعض لوگوں کے ہاں کم ہو جاتا ہے۔ (علامہ شبیر احمد عثمانی، **فتح الملهم** (بیروت: دار إحياء التراث العربي) ۴:۱۱۶۔

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خطبے کے حوالے سے **صحيح مسلم** کے الفاظ ہیں: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، حَدَّثَنَا هِشَامٌ، حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ،

کے دشمن، کافر اور گمراہ ہوں گے۔ اس طرح کے الفاظ اہلِ سنت کے منہج کے مطابق کفرِ عملی پر محمول ہوتے ہیں، یعنی ان کا کام اللہ کے دشمنوں اور کافروں والا ہو گا۔ نبی کریم ﷺ کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے آپ نے آخری دور کے متعدد خطبوں میں ارشاد

---

عَنْ مَعْدَانَ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ، خَطَبَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَذَكَرَ نَبِيَّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَذَكَرَ أَبَا بَكْرٍ قَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ كَأَنَّ دِيكًا نَقَرَنِي ثَلَاثَ نَقَرَاتٍ، وَإِنِّي لَا أُرَاهُ إِلَّا حُضُورَ أَجَلِي، وَإِنَّ أَقْوَامًا يَأْمُرُونَنِي أَنَّ أَسْتَخْلِفَ، وَإِنَّ اللهَ لَمْ يَكُنْ لِيُضَيِّعَ دِينَهُ، وَلَا خِلَافَتَهُ، وَلَا الَّذِي بَعَثَ بِهِ نَبِيَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَإِنْ عَجِلَ بِي أَمْرٌ، فَالْخِلَافَةُ شُورَى بَيْنَ هَؤُلَاءِ السِّتَّةِ، الَّذِينَ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَنْهُمْ رَاضٍ، وَإِنِّي قَدْ عَلِمْتُ أَنَّ أَقْوَامًا يَطْعَنُونَ فِي هَذَا الْأَمْرِ، أَنَا ضَرَبْتُهُمْ بِيَدِي هَذِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ، فَإِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَأُولَئِكَ أَعْدَاءُ اللهِ، الْكَفَرَةُ الضُّلَّالُ، ثُمَّ إِنِّي لَا أَدَعُ بَعْدِي شَيْئًا أَهَمَّ عِنْدِي مِنَ الْكَلَالَةِ، مَا رَاجَعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي شَيْءٍ مَا رَاجَعْتُهُ فِي الْكَلَالَةِ، وَمَا أَغْلَظَ لِي فِي شَيْءٍ مَا أَغْلَظَ لِي فِيهِ، حَتَّى طَعَنَ بِإِصْبَعِهِ فِي صَدْرِي، فَقَالَ: «يَا عُمَرُ أَلَا تَكْفِيكَ آيَةُ الصَّيْفِ الَّتِي فِي آخِرِ سُورَةِ النِّسَاءِ؟» وَإِنِّي إِنْ أَعِشْ أَقْضِ فِيهَا بِقَضِيَّةٍ، يَقْضِي بِهَا مَنْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَمَنْ لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ، ثُمَّ قَالَ: اللهُمَّ إِنِّي أُشْهِدُكَ عَلَى أُمَرَاءِ الْأَمْصَارِ، وَإِنِّي إِنَّمَا بَعَثْتُهُمْ عَلَيْهِمْ لِيَعْدِلُوا عَلَيْهِمْ، وَلِيُعَلِّمُوا النَّاسَ دِينَهُمْ، وَسُنَّةَ نَبِيِّهِمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَيَقْسِمُوا فِيهِمْ فَيْئَهُمْ، وَيَرْفَعُوا إِلَيَّ مَا أَشْكَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ أَمْرِهِمْ، ثُمَّ إِنَّكُمْ، أَيُّهَا النَّاسُ تَأْكُلُونَ شَجَرَتَيْنِ لَا أَرَاهُمَا إِلَّا خَبِيثَتَيْنِ، هَذَا الْبَصَلَ وَالثُّومَ لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِذَا وَجَدَ رِيحَهُمَا مِنَ الرَّجُلِ فِي الْمَسْجِدِ، أَمَرَ بِهِ فَأُخْرِجَ إِلَى الْبَقِيعِ، فَمَنْ أَكَلَهُمَا فَلْيُمِتْهُمَا طَبْخًا.(**صحيح مسلم**، كتاب المساجد ومواضع الصلوة، بَابُ نَهْيِ مَنْ أَكَلَ ثُومًا أَوْ بَصَلًا أَوْ كُرَّاثًا أَوْ نَحْوَهَا، **رقم**:٥٦٧۔)

فرمایا:لا ترجعوا بعدي كفارًا يضرب بعضكم رقاب بعض. یہاں پر بھی کفار کا لفظ اسی معنیٰ میں ہے۔

یہاں بعض حضرات نے سوال اٹھایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایسا کون ہو سکتا ہے جس کی جرأت ہو کہ اس طرح کی بات کر سکے؟ **صحیح مسلم** کے علاوہ دیگر جگہوں جیسے **مسند أحمد** میں بھی یہ بات نقل ہوئی ہے۔ ان میں یطعنون کے بجائے ہے: سیطعنون۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات مستقبل کے بارے میں فرمائی ہے کہ میرے بعد خلافت کے معاملے میں طعن کرنے والے طعن کریں گے۔ یہاں اس سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں: ایک یہ کہ فتن کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہو رہا ہے اور دوسری یہ کہ اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، لیکن حضرت عمرؓ کی موجودگی میں وہ سر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت تاریخِ طبری کی نہیں، مسلم کی روایت ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں حضرت عمر کو فتنوں کے آگے دروازہ کہا گیا ہے بخاری اور مسلم کی ہے۔

## دو غلط فہمیاں: عہدِ علی منبعِ فتن ہے / یہ فتن عجمی سازش ہے

اس سے دو غلط فہمیاں ذہن سے نکل جانی چاہییں، اگرچہ وہ ہمارا آج کا موضوع نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنے پیدا ہو گئے اور ایک طرح سے یہ ان کے دورِ خلافت کا نقص ہے۔ حقیقت یہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت شروع ہونے سے پہلے فتنے اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے، بیج تو پہلے سے موجود تھے البتہ فاروقی دروازہ رُکاوٹ تھا۔ یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مذاق بنا دیا گیا ہے اور اس طرح کی باتیں اچھے بھلے لوگ کرتے ہیں۔ میں اپنے موضوع سے ہٹ جاؤں گا، ورنہ ایک بزرگ کے حوالے سے منقول ہے کہ ہم شیعوں سے کہ دیتے ہیں کہ جو علاقے ابو بکر و عمر نے فتح کیے ہیں، وہ ہم لے لیتے ہیں اور جو علاقے علی نے فتح کیے ہیں، وہ تم لے لو۔ یہ عجیب بات ہے۔ شیعہ تو جواب میں یہی کہے گا کہ علی کو تم نے خلافت شروع میں دی نہیں اور کہتے ہو کہ فتح کیوں نہیں کی؟ اور خلافت اس وقت دی کہ جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اندرونی مسائل پیدا ہو چکے تھے، لیکن خیر!

## فتوحات معیارِ خلافت نہیں

فتوحات کیا کسی کی خلافت کا معیار ہے؟ کون سی نص میں آتا ہے؟ فتوحات اچھی چیزیں ضرور ہیں، لیکن اسلام میں حکم رانی کے معیار کو محض مربع کلو میٹرز کی تعداد سے نہیں ناپا جاتا۔ ہمیں مغربی دنیا نے اسلامی تاریخ کو بھی سیکولر معیارات پر پرکھنے پر لگا دیا ہے کہ کس نے کتنی فتوحات کیں، کتنا بڑا تمدن قائم کیا وغیرہ۔ اس بات سے انکار نہیں کہ اس طرح کے کام بھی کارنامے شمار ہوں گے، لیکن ٹھیٹھ دینی معیارات جن میں عدل وانصاف سرِ فہرست ہے، سے بہر حال یہ اہم نہیں۔ یہی اگر معیار ہے تو اگر بدر کو نکال دیں، احد کو نکال دیں، احزاب کو نکال دیں، خیبر کو نکال دیں، فتحِ مکہ کو نکال دیں تو پیچھے کچھ بچتا ہے؟ اور ان سب معرکوں کا سب سے بڑا ہیرو علی ہے۔ **بخاری** میں ہے: "هذان خصمان اختصموا في ربهم" نزلت في بدر. کہ یہ آیت "هذان خصمان اختصموا في ربهم" اہلِ بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی کے تحت فرماتے ہیں: أنا

أول من يجثو بين يدي الرحمن يوم القيامة للخصومة.[1] اس میں دو خصم ہیں: ایک اہلِ باطل کا اور ایک اہلِ حق کا؛ بدر میں جو اہلِ حق کا فریق ہے، اس میں سب سے آگے اور سر فہرست **بخاری** کی اس روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

تفصیل کا موقع نہیں، لیکن اس بات پر بھی دلائل قائم کیے جاسکتے ہیں کہ عہدِ رسالت کا جہاد خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کیا ہوا جہاد جتنی اہمیت رکھتا ہے، بعد کے معرکوں کی وہ اہمیت نہیں ہے۔ بنیاد اور اساس تو عہدِ رسالت کی قربانیاں ہی ہیں۔ ایسی متعدد روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صحابہ بھی عہدِ رسالت کے جہاد اور عمل، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہوئے تھے، کو بعد کے جہاد اور عمل سے بہت افضل سمجھتے تھے۔ **صحیح بخاری** میں حضرت عمر اور حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہما کے درمیان ایک مکالمہ منقول ہے، جس میں یہ بات زیرِ بحث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے جو جہاد وغیرہ کیے ان سے ہم کتنی امید وابستہ کرسکتے ہیں؟ اس میں حضرت عمرؓ غلبۂ خشیت اور غلبۂ تواضع کی وجہ سے فرمارہے ہیں کہ میں تو یہ سمجھ رہاہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے جو ہمارے جہاد وغیرہ ہیں، ان میں بس ہم پورے سورے بچ جائیں، یعنی یہ نیکیاں حقیقت میں

---

[1] - **صحیح بخاری** میں ہے: عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه، أنه قال: «أنا أول من يجثو بين يدي الرحمن للخصومة يوم القيامة» وقال قيس بن عباد: وفيهم أنزلت: {هذان خصمان اختصموا في ربهم} [الحج: 19] قال: " هم الذين تبارزوا يوم بدر: حمزة، وعلي، وعبيدة، أو أبو عبيدة بن الحارث، وشيبة بن ربيعة، وعتبة بن ربيعة، والوليد بن عتبة ". (**صحيح البخاري**، كتاب المغازي، باب قتل أبي جهل، رقم: ۳۹۶۵)

ہمارے گناہ شمار نہ ہوں۔ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ غلبۂ رجا کی وجہ سے اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں، لیکن اس بات پر دونوں کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو جہاد ہجرت وغیرہ اعمال ہم نے کیے ہیں وہ بہر حال قابلِ امید ہیں۔[1] حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی عشرہ مبشرہ والی معروف روایت میں **سنن أبي داود** میں یہ لفظ بھی آتے ہیں: «لمشهد رجل منهم مع رسول الله ﷺ يغبر فيه وجهه، خير من عمل أحدكم عمره، ولو عمر عمر نوح».[2]

---

[1]- **مشكاة المصابيح** (باب البكاء والخوف : الفصل الثالث) میں یہ روایت ان لفظوں کے ساتھ آئی ہے:

وعن أبي بردة بن أبي موسى قال: قال لي عبد الله بن عمر: هل تدري ما قال أبي لأبيك؟ قال: قلت: لا. قال: فإن أبي قال لأبيك يا أبا موسى هل يسرك أن إسلامنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وهجرتنا معه وجهادنا معه وعملنا كله معه برد لنا؟ وأن كل عمل عملناه بعده نجونا منه كفافا رأسا برأس؟ فقال أبوك لأبي: لا والله قد جاهدنا بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم وصلينا وصمنا وعملنا خيرا كثيرا. وأسلم على أيدينا بشر كثير وإنا لنرجو ذلك. قال أبي: ولكني أنا والذي نفس عمر بيده لوددت أن ذلك [ص:۱۴۷۲] برد لنا وأن كل شيء عملناه بعده نجونا منه كفافا رأسا برأس. فقلت: إن أباك والله كان خيرا من أبي. رواه البخاري.

[2]-**سنن أبي داود**، كتاب السنة،باب في الخلفاء، رقم:۴۶۵۰۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی معرکے میں صرف چہرے کا غبار آلود ہو جانا ہی اتنا بڑا عمل ہے کہ بعد میں عمرِ نوح بھی عملِ خیر میں کھپا دی جائے تو اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اسی غلط فہمی پر اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

باوجود دیکھنے کے جو نہیں دیکھنا چاہتے ہیں ان کو کیسے دکھایا جاسکتا ہے؟ حضرت علیؓ پر تنقید کرنے والوں کی طرف سے اس قسم کی باتیں جب میرے کانوں میں پہنچتی ہیں تو ہمیشہ دل میں یہ خیال آیا کہ علیؓ کی پچھلی زندگی پر تنقید کرنے والے ان کی زندگی کے ابتدائی خدمات سے اپنے آپ کو کیوں اندھا بنالیتے ہیں۔ وہ اسلامی اطلس میں ایران و مصر شام و عراق کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قادسیہ میں جو کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوئی، کیا بدر کی فیصلہ کن کامیابی کے بغیر نصیب ہو سکتی تھی؟ وہ خوش ہوتے ہیں کہ یرموک ندی کے ساحل پر معجزانہ شکست ان کے دشمنوں کو اٹھانی پڑی، لیکن یرموک کی فتح پر خوشی کے شادیانے بجانے والوں سے کون پوچھے کہ ارے محسن کشو! یرموک تک تم پہنچ بھی سکتے تھے اگر کھولنے والا تم پر خیبر کے پہاڑی قلعوں کے دروازوں کو نہ کھول دیتا۔ سچ کہتے تھے ابوہریرہؓ جب کسی ملک کی فتح کی خبر مدینے پہنچتی تھی کہ خبر گو آج آئی ہے، لیکن فتح کا یہ واقعہ تو اسی دن پیش آچکا تھا جب مدینہ کے اطراف میں اللہ کا رسول اور رسول کے ساتھی خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ تم نے دجلہ کے کنارے دیکھا کہ سعد بن وقاص [کذا] اپنی فوج کو تراتے ہوئے مدائن کی طرف لے جارہے ہیں، لیکن دیکھنے والوں نے اسی واقعہ کو اسی وقت دیکھ لیا تھا جب مدینہ کے خندق کو پھاند کر عمرو بن عبدوڈ عرب کا سورما اس شخص سے مبارزت طلب کررہا تھا جس نے ایک ہی وار میں سو کے برابر سمجھے جانے والے اس پہلوان کو دو ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔ یقیناً حافظے کم زور بھی ہوتے ہیں، لیکن کیا اتنے کم زور کہ ہر دوسرے قدم کو اٹھانے کے بعد دماغ سے یہ بات نکل جائے کہ دوسرا

قدم اٹھ ہی نہیں سکتا تھا اگر پہلا قدم نہ اٹھتا۔ یہ فطرت کی انتہائی دناءت اور گندگی ہے کہ جس نے سارے جسم سے کانٹوں کو نکالا، اس کے احسانوں کا صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ آنکھ جب کھلی تھی تو اس وقت ہمارے سامنے صرف وہی تھا جس نے آخر میں آنکھ کے کانٹوں کو کھینچ لیا تھا۔ (۱)

## فتنوں کا منبع عہدِ علی رضی اللہ عنہ نہیں

اوپر غزوات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کردار کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اللہ نے ہمارے سمجھانے کے لیے کیا ہے۔ اس کو نکال دیں تو پھر بچتا کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مذاق تک بنا دیا جاتا ہے کہ جی ان کے دور میں تو فتنے ہی پیدا ہو گئے، لیکن یہ بات درست نہیں۔ یہ کس نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنے پیدا ہو گئے! اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنے پیدا ہوئے ہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس ڈھٹائی اور بے شرمی سے کس نے شہید کیا تھا؟ یہ لوگ اہل فتنہ ہی تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت ظاہر ہے فتنے کی غیر معمولی صورتِ حال میں ہوئی ہے۔ یہ بات کہ فتنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیدا ہوئے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور واقعات کے بھی؛ حدیث تو یہ کہتی ہے کہ فتنوں کے آگے اگر کوئی رکاوٹ ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں؛ اور عمر کو اپنے بعد وہ فتنے نظر آ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کے اس دور میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور بھی آ جاتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی، لیکن اس سے نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں کوئی کمی آتی ہے اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں۔ اگر کسی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مسئلہ کھڑا کیا تو وہ ان کی غلطی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس فتنے کے بانی نہیں تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو دور ہی وہ تھا جس میں

---

۱۔ مناظر احسن گیلانی، **حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی**، ۳۵۰۔

حالات پہلے سے خراب ہو چکے تھے، بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ لوگوں نے قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ دورِ عثمانی کے فتنوں سے حضرت عثمانؓ کی خلافتِ راشدہ پر کوئی حرف نہیں آتا، یہی معاملہ دورِ علوی کا بھی ہے۔

اچھا تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتی، وہ اسے قبول ہی نہیں کرتے، پھر کیا ہونا تھا؟ ظاہر ہے حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما میں سے کسی کے ہاتھ پر ہونی تھی، یا زیادہ سے زیادہ حضرت سعد بن اَبی وقاص کا نام لیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نامزد کردہ لوگوں میں یہی تین حیات تھے، اگرچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ ان تین یا دو (طلحہ وزبیر) میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تو کیا ان کے خلاف کوئی مزاحمت نہ ہوتی؟ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو اسے سادگی اور حالات و تاریخ سے ناواقفیت کی مثال ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے حالات کی خرابی کے ذمہ دار مخلصین تو نہیں تھے۔ وہ تو چھپے ہوئے کچھ اہلِ اغراض ہی ہوں گے، جنھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظرِ فراست بھی غالباً دیکھ رہی تھی، انھیں تو ان تین حضرات میں سے کوئی بھی راس نہیں آ سکتا تھا۔ چلو تھوڑی دیر کے لیے یہ بیانیہ ہی مان لیتے ہیں کہ یہ ساری سبائی سازش تھی یا عجمی سازش تھی، تو جو بھی سازشی تھے ان کو طلحہ، زبیر یا سعد کی خلافت سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی، وہ کیوں ان کی خلافت کو آسانی سے چلنے دیتے۔ اس لیے حالات کی خرابی کو خلیفۂ وقت پر ڈالنے کے بجائے اس کے اسباب کو کہیں اور ڈھونڈھنا چاہیے۔

## حوادثِ فتن اصلاً عجمی سازش نہیں

دوسری اہم بات یہ سمجھ میں آئی کہ یہ جو ایک بیانیہ ہے کہ یہ جتنے واقعات ہوئے، ان کے پیچھے عجمی سازش ہے، دیکھنے میں یہ بہت سادہ سی بات لگتی ہے، لیکن اتنی سادہ نہیں ہے۔ یہ اصل میں ایک مقدمہ ہے پورا ملبا اور الزام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان پر ڈالنے کا اور بعض کی طرف سے تو صراحتاً ڈالا گیا ہے، حتی کہ بعض لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمے داری بھی "بنو ہاشم کے نوجوانوں" پر ڈالی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خطبے سے معلوم ہوا کہ یہ جو خلفشار پیدا ہوا ہے، اس کے اسباب زیادہ تر داخلی ہیں۔

یہ بات پھر عرض کی جاتی ہے کہ ہم نے چیزوں کو حدیث کے تناظر میں دیکھنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار پیش گوئیاں کی ہیں، لیکن کوئی ایک پیش گوئی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں کے آنے والے حالات عجمی لوگ خراب کریں گے، ہاں بخاری میں یہ ضرور آتا ہے کہ هَلاَكُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ.[1] یعنی میری امت کی بربادی قریش کے لونڈوں کے ہاتھوں ہوگی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بتلا رہے ہیں کہ خلافت میں طعن کرنے والے کون ہیں؟ ضربتهم بيدي هذه على الإسلام. تو اس

---

[1] - **بخاری** کے الفاظ ہیں: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ المَكِّيُّ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ الأُمَوِيُّ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: كُنْتُ مَعَ مَرْوَانَ وَأَبِي هُرَيْرَةَ فَسَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ، يَقُولُ: سَمِعْتُ الصَّادِقَ المَصْدُوقَ، يَقُولُ «هَلاَكُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ»، فَقَالَ مَرْوَانُ: غِلْمَةٌ؟ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: إِنْ شِئْتَ أَنْ أُسَمِّيَهُمْ بَنِي فُلاَنٍ، وَبَنِي فُلاَنٍ . (**صحيح البخاري**، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، رقم:٣٦٠٥۔)

خلفشار کا سر چشمہ بنیادی طور پر اندر سے تھا۔ باہر کے کچھ لوگوں کا بھی اس میں کردار ہو سکتا ہے، لیکن اس کا سر چشمہ اندر کے لوگ ہیں، اگر روایات کو نظر انداز کر کے محض قیاس آرائی پر حالات کی تشخیص کریں گے تو اس کے مدمقابل اہلِ تشیع کا تیار کردہ بیانیہ واقعات کا ایک بالکل ہی دوسرا رخ پیش کرتا ہے۔ وہ سارا ملبہ عجمی یعنی فارسی عنصر کے بجائے رومی عنصر پر ڈالتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ رومیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، شام و مصر وغیرہ کے علاقوں میں ان کا اثر ورسوخ موجود تھا تو انھوں نے سازش کر کے شام اور مصر کے علاقوں میں گڑبڑ کی بنیادیں رکھوائیں، اور مسلمانوں کے مرکز کے خلاف خصوصاً خاندانِ رسول کے خلاف متبادل قیادت کھڑی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بیانیہ بھی بہت بھیانک اور خطرناک ہے۔ تاریخ کوئی فِکشن، کوئی ناول نہیں ہے کہ اسے اپنے ذہن سے مرتب کر لیا جائے، اس کے لیے مضبوط شواہد پیش کرنا ہوتے ہیں، اہلِ تشیع کا یہ بیانیہ شواہد سے بالکل عاری ہے، اسی طرح اس کے برعکس والا بیانیہ بھی۔ جہاں یہ بات کہی جارہی ہو کہ یہ عجمیوں کی، مجوسیوں کی، فلاں کی سازش ہے تو اس سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس بات کا رخ اور انجام کچھ اور ہو گا۔ اس طرح کے مفروضوں کے بجائے آپ حدیث کی طرف آئیں، یا جو بات کہنا چاہتے ہوں اس پر مضبوط تاریخی شہادتیں موجود ہوں۔

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت شروع کیسے ہوتی ہے؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو انتہائی مظلومانہ انداز میں اور بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا جاتا ہے؛ نہ ان کے سامنے قرآن پڑھنے کی کی حیا آتی ہے، نہ ان کی عمر کی حیا آتی ہے، نہ ان کی سفید داڑھی کی کوئی حیا ہے، ان کے سامنے خواتین موجود ہیں، ان کی بھی کوئی حیا نہیں ہے، جذبات کے اندھاپن نے ہر چیز بھلا رکھی ہے۔ اس طریقے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے

گھر کے اندر شہید کر دیا جاتا ہے۔ حالات بہت زیادہ خراب ہو چکے تھے، ظاہر ہے اس سے بڑی خرابی کیا ہو گی کہ خلیفۂ وقت کی شہادت ہو گئی۔ اب لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے کہ خلافت کے لیے بیعت کریں۔ مختلف روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو باتیں کیں: ایک تو یہ فرمایا کہ اس وقت یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام نہیں ہے، بلکہ یہ قدیم الاسلام صحابہ کا کام ہے۔ جب تک وہ ہوں گے، صرف تمھارے کہنے سے بیعت نہیں ہو گی۔ اور دوسرا یہ فرمایا کہ یہاں پر بیعت نہیں ہو گی، بلکہ بیعت ہو گی تو مسجد میں سرعام ہو گی۔[1]

---

۱۔ اس حوالے سے کئی نظائر تراث سے پیش کیے جاسکتے ہیں، یہاں چند حوالہ جات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آگے عہدِ سلف کے اساطین کی مستقل شہادتیں آتی ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے حنبلی عالم ابو بکر الخلال اپنی **کتاب السنة** میں ایک مستقل عنوان تثبيت خلافة علي بن أبي طالب رضي الله عنه أمير المؤمنين حقا حقا کے الفاظ میں باندھتے ہیں اور اس کے تحت کئی آثار اور اقوالِ سلف ذکر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ باب قابلِ ملاحظہ ہے۔ اس میں محمد بن الحنفیہ کی روایت میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس لوگ آئے اور امیر بننے کو کہا کہ آپ سے زیادہ اس وقت اس امر کے لیے کوئی مستحق نہیں تو آپ نے فرمایا: «لا تريدوني، فإني لكم وزير خير مني لكم أمير» ، فقالوا: لا والله ما نعلم أحدا أحق بها منك. قال: فإن أبيتم علي فإن بيعتي لا تكون سرا، ولكن أخرج إلى المسجد، فمن شاء أن يبايعني بايعني. قال: فخرج إلى المسجد فبايعه الناس ".(ابو بکر احمد بن محمد الخلال البغدادی الحنبلی(۳۱۱ھ)، **السنة**، ت، عطیہ الزہرانی (ریاض: دار الرایة، ۱۹۸۹ء)، ۲: ۴۱۵؛(تم میرے بارے میں ارادہ نہ کرو، اس لیے کہ میں تمھارا وزیر اور مددگار بنوں اس سے بہتر ہے کہ میں تمھارا امیر بنوں۔ لوگوں نے کہا اللہ کی قسم ہم اس معاملے میں آپ سے زیادہ موزوں اور لائق

کسی اور کو نہیں پاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم میری بات نہیں مان رہے تو میری بیعت پوشیدہ طور پر نہیں ہوگی، بلکہ میں مسجد میں جاتا ہوں وہاں جس کا جی چاہے مجھ سے بیعت کر لے۔ چناں چہ آپ مسجد کی طرف گئے اور لوگوں نے آپ سے بیعت کی) اس مفہوم کی دیگر روایات بھی اس کتاب میں نقل کی گئی ہیں۔ محمد بن الحنفیہ کی اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی اسی مفہوم کی ہے جسے سیدنا علیؓ کے معاصر سیرت نگار ڈاکٹر محمد علی الصلابی نقل کر کے کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند کے رجال ثقہ ہیں۔ دیکھیے (علی محمد محمد الصلابی، **أسمى المطالب في سيرة أمير المؤمنين علي بن أبي طالب رضي الله عنه**، (شارقہ امارات: مكتبة الصحابة، ۲۰۰۴ء)، ۱: ۲۳۶؛ محمد الصلابی اس طرح کے آثار ذکر کر کے ان سے مستفاد دروس و عبر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: " زهد علي في الخلافة وعدم طلبه لها أو طمعه فيها، واعتزاله في بيته حتى جاءه الصحابة يطلبون البيعة. "(حضرت علیؓ کا خلافت سے بے رغبت ہونا، اس کی طلب یا طمع نہ کرنا اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو جانا، یہاں تک کہ صحابہ ان کے پاس بیعت کا مطالبہ لے کر آئے۔) (نفسِ مرجع، ۱: ۲۳۶۔)

امام بیہقی **کتاب الاعتقاد** میں زہری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لما قتل عثمان برز علي بن أبي طالب للناس ودعاهم إلى البيعة فبايعه الناس ولم يعدلوا به طلحة ولا غيره وهذا لأن سائر من بقي من أصحاب الشورى كانوا قد تركوا حقوقهم عند بيعة عثمان كما مضى ذكره فلم يبق أحد منهم لم يترك حقه إلا علي وكان قد وفى بعهد عثمان حتى قتل وكان أفضل من بقي من الصحابة فلم يكن أحد أحق بالخلافة منه، ثم لم يستبد بها مع كونه أحق الناس بها حتى جرت له بيعة وبايعه مع سائر الناس من بقي من أصحاب الشورى. (جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو حضرت علیؓ نمایاں ہوئے اور [کئی لوگوں کے اصرار اور مطالبے کے بعد] لوگوں کو اپنی بیعت کی طرف بلایا، چناں چہ سب لوگوں نے بیعت کر لی اور انھوں نے حضرت طلحہؓ یا کسی اور کو حضرت علیؓ کے برابر نہیں سمجھا؛ اس لیے کہ اہل شوریٰ میں سے جتنے حضرات موجود تھے وہ سب اپنے حق سے دست بردار ہو چکے تھے۔ ان میں سے صرف حضرت علیؓ ہی بچے تھے جنھوں نے ایسا نہیں کیا تھا اور وہ حضرت عثمانؓ کی

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت صحابہ میں غیر مختلف فیہ تھی

مسجد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سرِ عام بیعت ہوئی اور لوگوں نے بیعت کی اور اس بیعت پر اس وقت کسی نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ تقریباً تحکیم کے واقعے تک کسی کی طرف سے صراحتاً یہ سوال نہیں اٹھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت

---

شہادت تک ان کا عہد بھی نبھا چکے تھے۔ ویسے بھی اس وقت زندہ صحابہ میں حضرت علیؓ سب سے زیادہ فضیلت والے تھے؛ اس لیے ان سے زیادہ خلافت کا اہل کوئی نہیں تھا۔ پھر سب سے زیادہ حق دار ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے طور پر اپنی خلافت مسلط نہیں کی، بلکہ باقاعدہ ان کے لیے بیعت ہوئی اور تمام لوگوں کے ساتھ ساتھ اہل شوریٰ میں سے جو حیات تھے، انھوں نے بھی بیعت کی۔ (احمد بن الحسین ابو بکر البیہقی، **الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد على مذهب السلف وأصحاب الحديث**، ت، احمد عصام الکاتب (بیروت: دار الآفاق الجدیدة، ۱۴۰۱ھ)، ۳۷۰؛ اسی طرح مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب **المرتضیٰ** میں فرماتے ہیں: ”حضرت عثمان کی شہادت کے بعد کئی روز تک اہل مدینہ اور اس کے حاکم و منتظم غافقی بن حرب کو انتظار رہا کہ مسلمانوں کی سربراہی کے لیے کون آگے بڑھتا ہے، مصریوں کا حضرت علی پر اصرار تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس سے گریز تھا۔ وہ باغوں کی چہار دیواری میں روپوش ہو رہے تھے، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس مشکل کو حل کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے بار بار رجوع کیا جارہا تھا، ان کے اصرار پر آپ نے بیعت قبول کرلی۔ بیعت سے پہلے اہل مدینہ کی رائیں معلوم کرلی گئی تھیں، ہر شخص کہہ رہا تھا کہ علی کے علاوہ کوئی اس منصب کے لائق نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس وقت امتِ اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالنے والا، خلافت راشدہ کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے والا اور اس کے لیے ہمہ گیر صلاحیتوں اور کمالات کا حامل ابو بکر و عمر و عثمان کے بعد، علی مرتضیٰ سے زیادہ کوئی نہ تھا۔“ (سید ابوالحسن علی ندوی، **المرتضیٰ** (کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن)، ۲۲۸۔

منعقد نہیں ہوئی یا یہ کہ علی خلیفہ نہیں ہے فلاں خلیفہ ہے یا اسے خلیفہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کے بعد بھی شاید یہ سوال کسی نے نہیں اٹھایا کہ اس عرصے میں حضرت علیؓ خلیفہ نہیں تھے۔ تحکیم کے بعد یہ ضرور کہا گیا، خوارج کی طرف سے بھی اور دوسری طرف سے بھی، کہ وہ معزول ہو گئے ہیں، حکمین نے انھیں معزول کر دیا ہے۔ اس سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلافات ہوئے، ام المومنین رضی اللہ عنہا کا اختلاف ہوا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا ہوا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہوا، لیکن کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ اس لیے یہ سوال کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی یا نہیں ہوئی، ایک لغو بات ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت، بیعتِ عامہ تھی، اس میں اکا دکا کسی کے شریک نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ بھی آگے چل کر بتایا جائے گا کہ بعض لوگوں نے بلا دلیل ایک فہرست مرتب کر دی کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت سے انکار کیا۔ ابن العربی جیسے شخص نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قتال کرنے سے تو کسی وجہ سے پیچھے رہے، بیعت سے نہیں۔ جس طرح کی بیعتِ عامہ روایات سے ثابت ہے، اس کے بعد کسی مضبوط روایت سے کسی کے اعتراض کے منقول ہونے کی ضرورت ہے، وگرنہ اس طرح کی بیعتِ عامہ کے بعد انعقادِ خلافت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ یہ تو عقلِ عام کی بات ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی خبر بھی اطراف واکناف میں تیزی کے ساتھ پھیلی ہو گی، ایک قابلِ ذکر وقت گزرنے تک کسی طرف سے یہ آواز نہیں اٹھی کہ علی کے بجائے فلاں کو خلیفہ ہونا چاہیے۔ اتنا وقت اس طرح گزرنے کے بعد اٹھنے والا سوال خلیفہ کی معزولی کا سوال تو کہلا سکتا ہے، انعقادِ خلافت پر سوال نہیں۔ یہ بہت واضح حقیقت ہے کہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور اس پر کوئی اعتراض نہیں اٹھا۔ اس کے علاوہ واقعات کو دیکھیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام سب سے بڑا تھا اور یہ بات تقریباً متعین تھی۔ اس کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام تھا ہی نہیں، جیسا کہ خود اُم المؤمنین اور حضرات طلحہ وزبیر کا ارشاد بھی نقل ہو گا۔

## خلافتِ علی رضی اللہ عنہ کی صحت پر عہدِ سلف کے اساطین کی شہادتیں

### ۱- امام احمد بن حنبلؒ کی شہادت

یہی وجہ ہے کہ امام احمدؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے منکر کو گدھے سے بھی زیادہ کم عقل قرار دیا ہے۔ چناں چہ امام احمد بن حنبلؒ سے امام ابنِ تیمیہؒ نے نقل کیا ہے اور ابنِ تیمیہ کا یہ بات نقل کرنا بہت بڑی بات ہے، کیوں کہ وہ ردِ تشیع میں بعض اوقات بہت آگے نکل جاتے ہیں اور ان سے تعبیرات میں تسامح بھی ہو جاتا ہے۔ امام احمدؒ کا انھوں نے یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد نہیں ہوئی، وہ بدعتی ہے اور اپنے گدھے سے بھی گیا گزرا ہے اور فرمایا کہ ایسے شخص کے پاس نہ بیٹھو، نہ معاملات کرو اور نہ اس کے ساتھ کھاؤ پیو۔[1]

### ۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت پر دو روایات

اس سلسلے میں، دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں، جو حافظ ابنِ حجرؒ نے **فتح الباري** میں نقل کی ہیں:

---

۱- آگے اس قول کی تفصیل آتی ہے۔

ان میں ایک تو عبد اللہ بن بُدَیل بن ورقاء الخزاعی کی روایت ہے جس میں وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ یہ ہیں:

وأخرج ابن أبي شيبة بسند جيد عن عبد الرحمن بن أبزى قال انتهى عبد الله بن بديل بن ورقاء الخزاعي إلى عائشة يوم الجمل وهي في الهودج فقال يا أم المؤمنين أتعلمين أني أتيتك عندما قتل عثمان فقلت ما تأمريني فقلت الزم عليا فسكتت.[1]

عبد اللہ بن بدیل نے جمل کے موقع پر حضرت عائشہ کو یہ واقعہ یاد دلایا کہ جب حضرت عثمان شہید ہوئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور پوچھا تھا کہ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا تھا علی کو لازم پکڑو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اطلاع حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچی تھی یا نہیں، لیکن وہ سمجھتی تھیں کہ نام یہی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ عبد اللہ بن بدیل، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت میں شہید ہوئے۔

دوسری روایت احنف بن قیس کی ہے۔ **فتح الباري** میں باب ''إذا التقى المسلمان بسيفيهما'' (كتاب الفتن) میں ہے۔ کافی لمبی روایت ہے، اس لیے اس کا پڑھنا طوالت کا باعث ہو گا۔ احنف بن قیس ابتدا میں ذہنی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، لیکن قتال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل نہیں ہوئے، بلکہ پیچھے رہے۔ اس کی ایک

---

۱ ۔ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی، **فتح الباري**، (بیروت: دار المعرفة، ۱۳۷۹ھ)، ۱۳: ۵۷۔

وجہ تو بخاری کی روایت میں آتی ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ نے ایک حدیث سنا کر انھیں شریک ہونے سے روک دیا تھا، لیکن ایک اور وجہ ہے۔ حافظ کہتے ہیں: وورد في اعتزال الأحنف القتالَ في وقعة الجمل سبب آخرفأخرج الطبري بسند صحيح عن حصين بن عبد الرحمن عن عمرو بن جاوان الخ۔[1] اس سند کو حافظ صحیح قرار دیتے ہیں۔ احنف بن قیس کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری دور تھا تو میں مکے میں آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے میری ملاقات ہوئی اور وہاں پہنچا تو یہ اطلاع بھی پہنچ گئی کہ حضرت عثمان کی شہادت ہو گئی۔ جب مدینے میں تھا تو اس وقت بھی لگ رہا تھا کہ نعوذ باللہ اس طرح کا کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔ میں نے ام المؤمنین سے کہا: من تأمريني به. آپ مجھے کس کے ساتھ ہونے کا حکم دیتی ہیں؟ قالت: علي. فرمایا: علی (رضی اللہ عنہ)۔ (تو ایک طرف ام المؤمنین ہیں، دوسری طرف وہ صاحب ہیں جن کو خود ام المؤمنین ہی خلافت کا سب سے بڑا حق دار کہہ چکی ہیں۔ اب بندہ حمایت کرے تو کس کی کرے، البتہ احنف بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے قتال میں شریک ہوئے اور صفین میں حضرت علی کے کمانڈروں میں سے تھے۔)

## ۳- طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت

مذکورہ بالا روایت ہی کا حصہ ہے کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے آخری دنوں میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا: إني لا أرى هذا

---

۱- نفس مصدر، ۱۳: ۳۴۔

الرجل يعني عثمان إلا مقتولا. مجھے لگ رہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شاید اب بچ نہ سکیں، تو: فمن تأمراني به؟ قالا: علي، [1] آپ مجھے کس کے بارے میں حکم دیتے ہیں؟ انھوں نے کہا: علی (رضی اللہ عنہ)۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے تو روایت میں کسی قدر اختصار کیا ہے۔ ابن جریر طبری کی پوری روایت میں ہے کہ جب حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حکم دیا تو احنف نے دوبارہ پوچھا أتأمراني به وترضيانه لي کیا آپ دونوں حضرات، علی کے بارے میں مجھے حکم دیتے ہیں اور انھیں پر راضی ہیں تو دونوں حضرات نے کہا جی ہاں۔ یہی دوبارہ تاکیدی سوال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ اس کے بعد احنف کہتے ہیں میں مدینے آیا اور حضرت علیؓ سے بیعت کر کے واپس بصرہ چلا گیا، ولا أرى الأمر إلا قد استقام، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ معاملات درست ہو چکے ہیں اور حضرت علیؓ کی خلافت قائم ہو چکی ہے، اس حالت میں مجھے پتا چلا کہ طلحہ و زبیر اور اُم المؤمنین بصرے کی طرف آ رہے ہیں۔ [2] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عملی مخالفت استقرارِ امور کے بعد ہوئی ہے۔ یعنی درمیان میں ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ حضرت علیؓ کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھ رہی تھی، یہ بھی انعقادِ خلافت کی دلیل ہے۔

---

۱۔ نفسِ مصدر و صفحہ۔

۲۔ محمد بن جریر الطبری، **تاریخ الرسل والملوك** (بیروت: دار التراث، ۱۳۸۷ھ)، ۴: ۴۹۸۔

حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم یہ اس وقت کی تینوں بزرگ شخصیات ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے محبوب زوجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ان کے فضائل ہیں؛ اور طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے بھی متعدد مناقب ہیں۔ طلحہ، احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوئے اور آنے والے تیروں کو اپنے ہاتھوں پر روکا، حضرت طلحہؓ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے جنت کو اپنے لیے واجب کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طلحہ اور زبیر جنت میں میرے پڑوسی ہیں، حضرت زبیر کو آپ نے اپنا حواری قرار دیا۔ یہ بڑی شخصیات ہیں۔ ان کے آپس کے اختلافات اپنی جگہ، لیکن بہر حال مرتبے سب کے بہت اونچے ہیں۔

یہ بات ذکر ہوئی کہ جن حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی ہے، ان میں حضرت علیؓ کے علاوہ کوئی اور اتنا نمایاں اور قابلِ ذکر آدمی نہیں تھا، خود حضرت ام المؤمنین، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم بھی یہی سمجھتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے پر امن حالات میں بیعت نہیں ہوئی، جیسی کہ پہلے خلفا کی ہوئی، لیکن اس سے حضرت علیؓ کی خلافت کی شرعی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ احادیث بہت سی ہیں جو آگے آئیں گی۔ ابھی یہ بات تمہیداً عرض کی جا رہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کھڑی کس چیز پر ہوئی ہے؟ یہ بات معلوم ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جو پہلی بیعت ہوئی ہے، وہ کہاں پر ہوئی ہے؟ سقیفۂ بنو ساعدہ میں، جہاں چند حضرات تھے۔ زیادہ تعداد میں انصار تھے اور مہاجرین میں سے چند ایک تھے۔ مثلا حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم۔ اس پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جو Main Stakeholders ہیں (مثلاً بنو ہاشم ہیں، ظاہر ہے کہ Stakeholder بنتے ہیں۔ ان کا خلیفہ بننا تو ضروری نہیں ہے، لیکن رائے تو ان کی شامل

ہونی چاہیے تھی۔)وہ اس میں موجود نہیں ہیں، اور کئی دیگر موجود نہیں ہیں۔ یہ تو اچانک ایک میٹنگ بلائی گئی اور اس میں بیعت کا اچانک فیصلہ ہوا، تو یہ طریقہ تو درست نہیں ہے۔ یہ اعتراض حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کیا گیا ہے، لیکن یہ اعتراض غلط ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری خطبوں میں سے ایک لمبا خطبہ **صحیح البخاري** میں اس موقع کا ہے جب آپؓ آخری حج کر کے واپس آئے۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ابو بکرؓ کی بیعت رواروی میں (فلتة) ہوئی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہوئی تو رواروی میں ہی ہے، لیکن حضرت ابو بکرؓ کے معاملے میں یہ باعثِ اعتراض نہیں ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں دو باتیں ارشاد فرمائیں: ایک بات یہ ارشاد فرمائی کہ اس وقت کی صورتِ حال ہی یہ تھی کہ حالات نازک تھے اور فوری فیصلہ کر کے اٹھنا ضروری تھا وگرنہ امت انتشار کا شکار ہو سکتی تھی، تو حالات کی نزاکت کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا، اسے روٹین بنانا درست نہیں۔ دوسری وجہ یہ فرمائی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا کوئی اور شخص تھا ہی نہیں جس کی طرف لوگوں کی آنکھیں اٹھتیں؛ اس لیے وہ بیعت اگرچہ ایک محدود دائرے میں ہوئی ہے، لیکن اگر ابتدا ہی سے بڑی میٹنگ بلائی جاتی تو اس میں بھی فیصلہ یہی ہونا تھا، اس لیے فیصلہ بہر حال درست ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ ہو نہیں سکتا تھا، کیوں کہ ابو بکر کی طرح کا کوئی اور تھا ہی نہیں جس کی طرف اس طرح آنکھیں اٹھتیں جیسے ابو بکر کی طرف اٹھتیں تھیں۔ اس اعتراض کے یہ دو جواب خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیے ہیں۔[1]

---

[1] - **صحیح البخاري** میں ایک طویل حدیث موجود ہے، جس میں یہ تفصیل ہے۔ دیکھیے: **صحیح البخاري**، ت، زہیر بن ناصر الناصر، کتاب الحدود، باب رجم باب رجم الحبلى من الزنا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے شروع میں حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، چھ مہینے بعد کی۔ اس میں اختلاف ہے کہ پہلے کی تھی یا نہیں، ایک قول یہ ہے کہ پہلے کی تھی لیکن وہ مشہور نہیں ہوئی تھی، اس لیے دوبارہ کی کہ لوگوں میں مشہور ہو جائے کہ ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ایک یہ بھی ہے کہ چھ مہینے بعد کی ہے۔ ابتدا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کچھ تحفظات تھے، لیکن وہ تحفظات کیا تھے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وہ خود منقول ہیں۔ ان کے تحفظات یہ نہیں تھے کہ فیصلہ غلط ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے برابر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس میں اختلاف ہے ہی نہیں۔ ہمارا اختلاف اتنا ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے، اس میں ہمیں نظر انداز کر کے فیصلہ کیا گیا، یعنی اگرچہ ہم بھی شریک ہوتے تو ووٹ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہی دینا تھا۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اشکال صرف جلدی پر تھا، اس جلدی اور رواروی کے بارے میں حضرت عمرؓ بتلا رہے ہیں کہ یہ اس وقت کی مجبوری تھی۔ یہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے میٹنگ کال نہیں کی تھی۔ از خود انصار وہاں جمع ہو گئے، اس لیے بحث چل پڑی تو اسی مجلس میں فیصلہ کر کے اٹھنا ضروری ہوا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی درست تھا کہ ابو بکرؓ کے برابر کوئی نام نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس فیصلے کو قبول کیا اور اس کے نتیجے میں آگے جو خلافتیں منعقد ہوئیں، ان کو بھی انھوں نے قبول کیا۔ آج کوئی ان کا وکیل بن کر کہے کہ وہ خلافتیں غلط تھیں، تو یہ مدعی سست گواہ چست کا مصداق ہو گا۔ یا تو یہ بات ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سابقہ تین خلافتوں کے دور میں، کسی شیعہ کتاب ہی میں ہو، کہ کوئی محاذ کھڑا کیا ہو! انھوں نے اطاعت کی ہے، مشورے دیے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

---

إذا أحصنت، رقم: ٦٨٣٠۔

دور میں تو بہت زیادہ مشوروں میں شریک رہے ہیں، کیوں کہ نئے اور بڑے بڑے فیصلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں ہوئے ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دور تو بہت مختصر تھا۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ابتدا میں کسی کی رائے حضرت ابو بکر کے علاوہ ہو یا بعد میں رہی ہو کہ ان کے علاوہ کسی کو خلیفہ بننا چاہیے تھا، جیسا کہ سعد بن عبادہ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے، تو اس سے حضرت ابو بکر کی خلافت کے انعقاد پر فرق نہیں پڑتا۔ جب حضرت ابو بکر کے لیے بیعتِ عامہ ہو گئی، کچھ وقت ایسا گزر گیا کہ ان کے خلیفہ ہونے پر کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا تو یہ ان کی خلافت کا انعقاد ہی تھا۔ اکّا دکا محض رائے کی حد تک دوسری بات کے موجود ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔

یہی بات یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاملے میں بھی ہوئی، کہ حالات بھی نازک تھے، اور شخصیت بھی ایسی نمایاں کہ سب کی نظریں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر کوئی اور نہیں تھا، پھر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلی بیعت ہی مسجد میں جا کر کی۔ یہ بیعت عامہ تھی، روایات میں اس کے لیے لفظ بایعہ الناس کے آتے ہیں۔ اگر نارمل حالات میں بیعت ہوتی، فرض کریں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طبعی طور پر انتقال ہوا ہوتا، مدینے میں باہر آنے والے بلوائیوں کا نام ونشان بھی نہ ہوتا تب بھی یہی کچھ ہونا تھا، اب خوامخواہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا سہرا بلوئیوں کے سر مڑھنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کیا قصور ہے کہ اس طرح کے حالات میں بیعت ہوئی ہے۔ اس طرح کے حالات ان کے اپنے پیدا کردہ نہیں تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہو گئی تو پھر اس کے بعد کچھ اختلافات ہوئے جس کے نتیجے میں جنگِ جمل ہوئی (جس میں آپ رضی اللہ عنہ کے مدمقابل حضرت عائشہ، طلحہ اور

زبیر رضی اللہ عنہم ہیں جو بہت بڑے بڑے نام ہیں۔)، پھر جنگِ صفین ہوئی ( جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ بھی صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کا احترام ہم پر واجب ہے اوران کے لیے نامناسب لفظ بولنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔)اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری اور آخری جنگ، خوارج کے ساتھ ہوئی جسے جنگِ نہروان کہا جاتا ہے۔

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیاسی پوزیشن اور احادیث

ان تینوں جنگوں میں اور ان سارے سیاسی معاملات میں رسول اللہ ﷺ کی نظر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں کھڑے ہیں؟ یہ ہے اصل موضوع جس تک ہم اب پہنچ سکے ہیں۔ اگرچہ اصولی طور پر جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ حضرت علی خلیفۂ وقت تھے تو اس کے فقہی، دستوری اور کلامی نتائج اس پر خود ہی مرتب ہو جائیں گے، اگرچہ اس پر ایک بھی نص موجود نہ ہو، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چوں کہ ناخوش گوار حالات میں منعقد ہوئی، بعد میں کچھ ذہنوں میں الجھاؤ موجود رہا، نواصب نے اس الجھاؤ کو بڑھانے کی بھی کوشش کی اس لیے اللہ کی طرف سے ایسا ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور اس میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پہلے ہی اللہ کے نبی ﷺ بہت کچھ فرما گئے تھے۔

### ١- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان سے منقول احادیث

احادیث کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آنے والے واقعات کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ ان کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سب سے زیادہ محفوظ رکھنے والے اور سمجھنے والے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ آپ رازدانِ رسول ﷺ ہیں اور محض رازدان ہی نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے جو مجمعوں میں باتیں فرمائی ہیں، انھیں بھی اچھی طرح یاد رکھنے والے آپ ہی تھے، یعنی آپ ان باتوں کے Specialist تھے۔ اور خواتین میں جو آپ ﷺ کی رازدان سمجھی جاتی ہیں، وہ ام المؤمنین

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ **مسند أحمد** کی اس حوالے سے ایک روایت ہے جس پر گفت گو کی جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔[1]

سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ شہادتِ عثمان کے بعد کے واقعات کے بارے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کیا کہتے ہیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جب شہادت ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔ وہ اس وقت مدائن میں رہتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں وہاں کا والی مقرر کیا تھا۔ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے کچھ ہی عرصے بعد حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا، لیکن ان معاملات میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنی رائے بھی دے گئے اور کچھ حدیثیں بھی اسی سیاق میں سنا گئے۔

## حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیعتِ علی رضی اللہ عنہ اور ان کی مدد و نصرت کی ترغیب

ان روایات کے بیان سے پہلے حافظ ابنِ حجرؒ کی ایک بات نقل کی جاتی ہے۔ وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے حالات ذکر کرتے ہوئے اس حدیث کے ضمن میں کہتے ہیں جس میں امانت

---

۱۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ارد گرد کے لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو ایک مرتبہ میری جدائی کے بعد کبھی مجھ سے مل نہیں پائیں گے، یعنی آخرت میں ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سامنا بھی نہیں ہو گا۔ حضرت عمرؓ کو جب اس روایت کا علم ہوا تو انھوں نے پریشان ہو کر حضرت ام سلمہؓ سے پوچھا کہ کہیں میں تو ان میں سے نہیں ہوں۔ حضرت اُم سلمہؓ نے نفی میں جواب دیا، لیکن ساتھ ہی حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ آپ کے علاوہ کسی کو اس طرح سے بھی جواب نہیں دوں گی، اس لیے کہ اس طرح بھی راز فاش ہونے کا راستہ کھلتا ہے (**مسند أحمد**، رقم: ۲۶۴۸۹۔)۔ اب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات بطور راز کے فرمائی، حضرت ام سلمہؓ نے راز رکھنے کا انتہائی اہتمام کیا تو کسی کے لیے جواز نہیں بنتا کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کون تھے۔

کے اٹھ جانے کا ذکر ہے۔ اس میں یہ الفاظ آتے ہیں: ولا أبالي أيكم بايعت[1]. یہاں مبایعہ سے مراد خرید وفروخت ہے یا اس سے مراد بیعت کرنا ہے؟ صحیح مطلب اس کا خرید وفروخت ہے کہ حضرت حذیفہؓ فرمانا چاہتے ہیں کہ پہلے امانت عام تھی کہ ہر ایک سے سودا کر لیتا تھا، لیکن اب امانت کم ہو گئی ہے (صحابہ کم رہ گئے ہیں اور دوسرے لوگ زیادہ آ گئے ہیں۔) اس لیے میں کسی سے سوچ سمجھ کر ہی معاملہ کرتا ہوں، پہلے کسی سے مبایعہ کرتے ہوئے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی اب ہوتی ہے۔ حافظ بتا رہے ہیں کہ اس مبایعہ سے بیعت کرنا یعنی بیعتِ امامت مراد نہیں ہے؛ اس لیے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پہلوں کی بھی بیعت کی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھی بیعت کی ہے، حضرت حذیفہؓ کی زندگی میں وہ وقت آیا ہی نہیں کہ کسی بیعت سے ہچکچاہٹ ہوتی۔ حافظ کے یہاں لفظ ہیں: فقد كان عثمان ولاه على المدائن وقد قُتل عثمان وهو عليها ، وبايع لعلي وحرّض على المبايعة له والقيام في نصره.[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں مدائن کا والی بنایا تھا اور شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت وہ وہیں تھیں۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کی اور لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اور ان کی نصرت کے لیے کھڑا ہونے کی ترغیب دی۔ یہ بہت بڑی سند ہے اور دنیا سے جاتے ہوئے انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی لوگوں کو ترغیب بھی دی اور یہ بھی کہا کہ ان کی مدد کے لیے کھڑے بھی ہونا ہے۔ ایک دفعہ میں نے حدیث کے سبق میں یہ بات سرسری طور پر طلبہ کے سامنے بیان کی۔ بعد میں ایک طالب علم

---

۱ - ابن حجر، **فتح الباري**، ۱۳:۴۰۔

۲ - نفس مصدر۔

آیا۔ اس نے کہا کہ مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بہت سارے اشکالات تھے اور ایسا ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کھٹک ہوتی ہے اور بہت سے ذہنوں میں ہوتی ہے۔ اس طالب علم نے کہا کہ آپ نے جو یہ حضرت حذیفہؓ کی بات نقل کی ہے تو اب میرا مسئلہ حل ہو گیا اور میں مطمئن ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ جس وقت حضرت حذیفہؓ، حضرت علیؓ کی مدد میں کھڑے ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں اس وقت بظاہر حضرت علیؓ کو مدد کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے - اور یہی بات آگے آنے والی روایات سے بھی معلوم ہو گی - کہ حضرت حذیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی پیش گوئیوں کی روشنی میں فرما رہے ہیں۔

یہ باتیں ظاہر ہے کتبِ تاریخ کی نہیں، بلکہ حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ جب آپ واقعات کی تفصیل میں جاتے ہیں تو اس میں تاریخ کے حوالے آتے ہیں۔ اس سے یہ تاثر سا بن جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ساری کی ساری بنیاد ہی تاریخ پر کھڑی ہے، جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

## حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کی کچھ تفصیل

### حدیثِ سیار ابوالحکم

حافظ ابن حجرؒ نے جو بات کہی ہے وہ در حقیقت کئی روایات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، یہاں ان میں سے کچھ روایتیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ روایتیں ایک ہی طرح کے مضمون کی ہیں، بعض بالکل صحیح ہیں، بعض حسن درجے کی ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت ہے سیار ابوالحکم کی۔

**مجمع الزوائد** میں علامہ ہیثمیؒ نقل کرتے ہیں: عَنْ سَيَّارٍ أَبِي الْحَكَمِ قَالَ: قَالَتْ بَنُو عَبْسٍ لِحُذَيْفَةَ: إِنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عُثْمَانَ قَدْ قُتِلَ، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: آمُرُكُمْ أَنْ تَلْزَمُوا عَمَّارًا. سیار ابو الحکم کہتے ہیں کہ بنو عبس (ایک قبیلہ) نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے گئے ہیں، اب ہم کیا کریں؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آمرکم أن تلزموا عمارا. میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ جس طرف عمار رضی اللہ عنہ ہو، تم اسی طرف ہو جاؤ۔ اس پر انھوں نے کہا: إن عمارًا لا يفارق عليًا. انھوں نے کہا کہ پھر سیدھا سیدھا علی کا نام ہی لے لیجیے، کیوں کہ عمار، علی سے تو جدا ہوتا ہی نہیں ہے۔ (واللہ اعلم، کہنے والا کون ہو گا! بظاہر وہ غیر صحابی ہو گا۔) اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور کہا: إِنَّ الْحَسَدَ هُوَ أَهْلَكَ الْجَسَدَ. کہ علی سے تمھیں کیا تکلیف ہے؟ حسد کے علاوہ اور کیا ہے؟ کہ عمار کو مان لیا تو علی کو ماننا پڑے گا، حسد انسان کو برباد کر دیتا ہے۔ وَإِنَّمَا يُنَفِّرُكُمْ مِنْ عَمَّارٍ قُرْبُهُ مِنْ عَلِيٍّ، فَوَاللهِ لَعَلِيٌّ أَفْضَلُ مِنْ عَمَّارٍ أَبْعَدَ مَا بَيْنَ التُّرَابِ وَالسَّحَابِ، وَإِنَّ عَمَّارًا لَمِنَ الْأَخْيَارِ. [1] تمھیں عمار سے یہ بات دور کرتی ہے کہ وہ علی کے قریب ہیں تو اللہ کی قسم علی تو عمار سے بھی افضل ہیں،

---

۱ - ابو الحسن نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان الہیثمی، **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**، ت: حسام الدین القدسی، کتاب الفتن، بَابٌ فِيمَا كَانَ بَيْنَهُمْ يَوْمَ صِفِّينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ، رقم: ۱۲۰۵۸۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: رواه الطبراني. ورجاله ثقات. إِلَّا أَنِّي لَمْ أَعْرِفِ الرَّجُلَ الْمُبْهَمَ.

اور ان سے اتنا اونچے ہیں جتنا کہ بادل مٹی سے، اور خود عمار بھی اخیار میں سے ہیں۔ (اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ بعض لوگوں کو حضرت علیؓ سے خدا واسطے کی چڑ تھی، اسے نصب کی بیماری کہا جاتا ہے، جیسا کہ آگے مزید روایات سے معلوم ہو گا کہ یہ بیماری اس دور میں موجود تھی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کے بارے میں خبر دار کیا تھا)۔

اس حدیث کے بارے میں علامہ ہیثمی نے کہا ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں، مگر اس میں جو مبہم شخص ہے میں اسے نہیں جانتا۔ **جمع الفوائد** کے محقق کا کہنا ہے کہ مبہم شخص سے مراد سیار ابو الحکم ہی ہیں، تاہم بظاہر انھیں مبہم کہنا اس لیے مشکل ہے کہ یہ صحاح ستہ کے راویوں میں سے ہیں، بڑے اونچے درجے کے عبادت گذاروں میں سے ہیں، علامہ ذہبی نے **سير أعلام النبلاء** میں انھیں الإمام الحجة القدوة الرباني کے لفظوں سے یاد کیا ہے، اور بتایا ہے کہ علامہ اصفہانی نے **حلية الأولياء** (جو اولیاے امت پر لکھی جانے والی معروف کتاب ہے) میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔[1] البتہ اگرچہ یہ تابعین میں سے ہیں، لیکن انھوں نے بظاہر حضرت حذیفہ کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے سیار جن سے روایت کر رہے ہیں، وہ مبہم ہیں، لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ یہ حدیث مرسل ہو گی، اور ایسے جلیل القدر تابعی کی مرسل، جب کہ اس کی تائید دیگر روایات سے بھی ہو رہی ہے، قابلِ استدلال ہو گی۔

### حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی اسلام میں حیثیت اور مقام

یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، بلکہ پرجوش حامی تھے۔ جنگِ صفین میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی نوے سال عمر تھی۔ یہ بہت

---

۱- سير أعلام النبلاء ۵:۳۹۱ ترجمة سيار بن وردان أبو الحكم

طویل عمر ہے۔ یہ حضور ﷺ کے ہم عمر لوگوں میں سے ہیں، لیکن یہ بہت جوش اور جذبے کے ساتھ قتال میں شریک تھے۔ یہ تو معلوم ہے کہ عمارؓ کون ہے؟ اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ سمیہؓ کا بیٹا ہے۔ جنھوں نے مکے میں ماریں کھائی ہیں اور وہ جن کے بارے میں قرآن میں آتا ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ .[1] (اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا جو صبح و شام اپنے پروردگار کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پکارتے رہتے ہیں۔ ان کے حساب میں جو اعمال ہیں ان میں سے کسی کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اور تمھارے حساب میں جو اعمال ہیں ان میں سے کسی کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے جس کی وجہ سے تم انھیں نکال باہر کرو، اور ظالموں میں شامل ہو جاؤ۔) جن کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں، ان میں یہ عمار شامل ہیں۔ یہ مستضعفینِ مکہ ہیں، جن کے بارے میں کفار کہتے تھے کہ انھیں اپنے پاس سے ہٹا دیں۔ اللہ نے کہا نہیں ہٹانا۔

ہمارے نبی ﷺ کے صحابیوں اور حضرت نوحؑ کے صحابیوں میں، مَیں ایک فرق بیان کیا کرتا ہوں۔ نوح علیہ السلام سے بھی یہ کہا گیا تھا: وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ.[2] یہ جو کمی قسم کے لوگ آپ کے ساتھ لگے رہتے ہیں، انھیں اپنے پاس سے

---

[1] -الأنعام٦:٥٢۔

[2] -ھود١١:٢٧۔

ہٹائیں، پھر ہم آپ کی بات سنیں گے۔ نوح علیہ السلام نے جواب میں خود کہا کہ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِم.[1] اور اللهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِين.[2] یعنی میں انھیں دور نہیں کر سکتا۔ ان کے دل میں کیا ہے؟ اللہ جانتا ہے۔ اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اللہ خود کہہ رہا ہے کہ آپ نے ان کو ہٹانا نہیں ہے اور اللہ بتا رہے ہیں کہ ان کے دل میں کیا ہے؟ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ. وہاں ہے اللهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ . بہر حال حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے ذاتی مناقب اور فضائل بھی بہت سارے ہیں (وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھی بہت سارے ہیں۔)، لیکن وہ ہمارا موضوع نہیں ہیں۔

## علی کا گروہ ہدایت پر

زید بن وہب کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے فرمایا کہ اس وقت کیا ہو گا جب تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ ایک دوسرے کے مدمقابل نکلیں گے (ایک طرف ام المؤمنین اور دوسری طرف حضرت علیؓ)۔ ہم نے پوچھا ایسا بھی ہو گا؟، حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ہو کر رہے گا۔ بعض حضرات نے عرض کیا ہم اگر ایسا وقت دیکھیں تو کیا کریں، فرمایا اس گروہ کو لازم پکڑنا جو علی کی طرف بلاتا ہو، اس لیے کہ وہ ہدایت پر ہو گا۔

---

[1] - ھود ۱۱:۲۹۔

[2] - ھود ۱۱:۳۱۔

اس حدیث کو بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔[1] ہیثمی نے **مجمع الزوائد** میں بزار ہی کے حوالے سے ذکر کرنے کے بعد کہا ہے رجاله ثقات. حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی **فتح الباري** میں اس روایت کو ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔[2] حافظ ابن حجر **فتح الباري** میں جس حدیث پر سکوت اختیار کرتے ہیں وہ کم از حسن ضرور ہوتی ہے، جیسا کہ خود حافظ نے **فتح الباري** کے مقدمے کے بالکل شروع میں تصریح کی ہے اور علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے **قواعد في علوم الحديث** (مقدمہ **إعلاء السنن**) میں اسے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب صحابی کوئی ایسی بات کر رہا ہو جو محض رائے کی بنیاد پر نہیں کہی جاسکتی تو اس میں اگر صراحتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ نہ بھی ہو تب

---

۱-حدثنا أحمد بن يحيى الكوفي، قال: أخبرنا أبو غسان، قال: أخبرنا عمرو بن حريث، عن طارق بن عبد الرحمن، عن زيد بن وهب، قال: بينما نحن حول حذيفة، إذ قال: «كيف أنتم وقد خرج أهل بيت نبيكم صلى الله عليه وسلم في فئتين يضرب بعضكم وجوه بعض بالسيف؟» ، فقلنا: يا أبا عبد الله، وإن ذلك لكائن، قال: «أي والذي بعث محمدا صلى الله عليه وسلم بالحق إن ذلك لكائن» ، فقال بعض أصحابه: يا أبا عبد الله فكيف نصنع إن أدركنا ذلك الزمان؟، قال: «انظروا الفرقة التي تدعو إلى أمر علي رضي الله [ص:٢٣٧] عنه فالزموها فإنها على الهدى» **مسند البزار = البحر الزخار**، رقم: ٢٨١٠۔

۲-**فتح الباري**،۱۳:۶۹۔

بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ صحابی رسول اللہ ﷺ سے ہی روایت کر رہا ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہے، کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ قبل از وقت ایک پیش گوئی فرما رہے ہیں جو وحی کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت اور ان کے ہدایت پر ہونے کی بات کر رہے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بات وہ رسول اللہ ﷺ سے سن کر کر رہے ہیں۔

## حدیثِ أبو الیقظان علی الفطرة

ایک اور حدیث حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہی کی ہے جسے کئی حضرات نے روایت کیا ہے۔ علامہ البانیؒ نے اس کی تفصیل سے تخریج کی ہے اور یہ کہا ہے کہ وھو إسناد صحیح، رجاله ثقات كلهم.[1] اور متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت منقول ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا، تو لوگ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابو عبد اللہ ! ان صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے اور لوگوں میں اختلاف پیدا ہو چکا ہے تو آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو۔ (آخری دن ہیں اور وہ بیمار ہیں۔) لوگوں نے انھیں ایک شخص کے سینے کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھایا تو انھوں نے کہا: سمعت رسول الله ﷺ يقول: أبو اليقظان على الفطرة. (ابو الیقظان حضرت عمار کی کنیت ہے۔) لايدعها حتى يموت أو ينسيه الهرم. بعض میں أو

---

[1] - ابو عبد الرحمن محمد ناصر الدین الالبانی، **سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها**(رياض: مكتبة المعارف للنشر والتوزيع،١٩٩٥ء- ٢٠٠٠ء)،٧: ٦٥٨، رقم: ٣٢١٦۔

يمسه الهرم ہے، لیکن مجھے زیادہ صحیح یہ لگ رہا ہے کہ أو ينسيه الهرم ہے۔ کبھی کبھار بڑھاپے میں کوئی بات بھول جائیں، (نوے سال کی عمر میں شہادت ہوئی ہے۔) تو وہ تو الگ بات ہے، لیکن اس کے علاوہ ابو الیقظان موت تک فطرت پر رہے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی منقبت میں بات نہیں کر رہے، بلکہ لوگ یہ پوچھ رہے ہیں کہ اب ان حالات میں ہم نے کس کے ساتھ ہونا ہے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنی رائے نہیں بیان کر رہے، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کر رہے ہیں کہ عمار مرتے دم تک فطرت پر رہے گا، جس کا مطلب یہ کہ حضرت حذیفہ یہ فرما رہے ہیں کہ جدھر عمار ہو ادھر ہی جانا ہے۔

## حدیثِ خالد العرنی

ایک اور حدیث ہے۔ یہ حدیث سنداً اتنی تسلی بخش نہیں لگ رہی۔ اگرچہ بعض نے اسے صحیح قرار بھی دیا ہے، لیکن اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے، تاہم اس کا مضمون دوسری روایات سے ثابت ہے:

> عن خالد العرني، قال: دخلت أنا وأبو سعيد الخدري على حذيفة: يا أبا عبد الله ،حدثنا ما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم في الفتنة، قال حذيفة: قال رسول الله ﷺ: «دوروا مع كتاب الله حيث ما دار» فقلنا: فإذا اختلف الناس فمع من نكون؟ فقال: «انظروا الفئة التي فيها ابن سمية فالزموها، فإنه يدور مع كتاب الله» قال: قلت: ومن ابن سمية؟ قال: أو ما تعرفه؟ قلت: بينه لي، قال:

«عمار بن ياسر» ، سمعت رسول الله ﷺ يقول لعمار: «يا أبا اليقظان، لن تموت حتى تقتلك الفئة الباغية عن الطريق». [1]

خالد عرنی کہتے ہیں کہ میں اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی، اے حذیفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنے کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ہمیں بتایئے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، جدھر اللہ کی کتاب جاتی ہے، تم بھی ادھر جاؤ۔ (فتنے میں سب سے بڑی چیز اللہ کی کتاب ہی ہے۔) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: (ہم علمی اعتبار سے رہ نمائی نہیں لے رہے، شخصیات کے اعتبار سے لے رہے ہیں۔ علمی طور پر تو کتاب اللہ ہی ہدایت کا سرچشمہ ہے، لیکن ہم یہ پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ کتاب اللہ سمجھ میں نہ آئے تو کس کا دامن تھاما جائے؟) جب لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر ہم کس کے ساتھ ہوں؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس جماعت کو دیکھو جس میں سُمیہ کا بیٹا ہے، بس اسی کو لازم پکڑو۔ (یہ جملہ اور روایتوں میں بھی آتا ہے، لیکن باقی پورا مضمون اس ترتیب سے صرف اس روایت کے اندر ہے۔)، کیوں کہ وہ اللہ کی کتاب کے ساتھ ہی چلتا ہے۔ اسی میں پھر وہ حدیث بھی حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سنائی کہ تمھیں تب تک موت نہیں آئے گی، جب تک تمھیں باغی جماعت قتل نہ کر دے۔ (حضرت عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی، یہ صحیح حدیث ہے جو آگے "حضرت علی کے داخلی قتال" کے عنوان کے تحت آرہی ہے)۔

---

[1] - ابو عبداللہ الحاکم محمد بن عبداللہ النیسابوری، **المستدرك على الصحيحين**، ت، مصطفی عبد القادر عطا، كتاب قسم الفيء، كتاب قتال أهل البغي وهو آخر الجهاد، رقم: ۲۶۵۲۔

حاکم نے اس حدیث کو دو جگہ روایت کیا ہے اور دونوں جگہ صحیح قرار دیا ہے، ایک قتال أهل البغي میں اور دوسرے مناقب عمار بن یاسر میں، ذہبی نے **المستدرک** کی تلخیص میں پہلی جگہ اس کی سند پر کلام کی ہے مسلم الاعور کی وجہ سے، لیکن دوسری جگہ انھوں نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ مضمون اگرچہ وہی ہے جو دیگر احادیث سے ثابت ہے، لیکن بہر حال اس متعین سند کے ساتھ روایت کو صحیح کہنا مجھے محل نظر معلوم ہوتا ہے، بظاہر یہاں ذہبی سے چوک ہوگئی ہے۔ لیکن بنیادی مضمون بہر حال دیگر روایات سے بھی ثابت ہے۔

### حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: إذا اختلف الناس؛ فابن سمية مع الحق.[1] (جب لوگوں میں اختلاف ہو تو ابن سمیہ حق کے ساتھ ہوتے ہیں۔)

---

[1] - الہیثمی، **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**، بَابٌ فِيمَا كَانَ بَيْنَهُمْ يَوْمَ صِفِّينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ، رقم: ۱۲۰۵۹؛ ہیثمی کہتے ہیں کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ضرار بن صُرد ہے جو کہ ضعیف ہے۔ اسی حدیث کے معنی میں مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن سُمَيَّة ما عرِض عليه أمرانِ قَطُّ إلا اختار الأرشد منهما". (ابن سمیہ پر جب بھی دو معاملات پیش ہوئے، اس نے ان میں سے اسی کو اختیار کیا جو ہدایت کے قریب تر تھا۔) (ابو عبد اللہ احمد بن حنبل، **مسند الإمام أحمد بن حنبل**، ت: احمد محمد شاکر، مسند عبد الله بن مسعود رضي الله تعالى عنه، رقم: ۳۶۹۳۔)، تاہم اس کے بارے میں بھی محقق احمد شاکر لکھتے ہیں کہ اس کی اسناد سالم بن ابو جعد الاشجعی کے انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ تاہم اسی مضمون کی حدیث آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے آرہی ہے وہ سندا بالکل صحیح ہے۔

ہیثمی نے اس حدیث کے ایک راوی ضرار بن صرد کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہیں، اور واقعی ایسا ہی ہے، تاہم بیش تر نے ضرار بن صرد کے ضعف کی وجہ ان کی سچائی پر اعتراض کو قرار نہیں دیا، چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے **تقریب التهذيب** میں ان پر بحث کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا ہے صدوق له أوهام وخطأ، رُمي بالتشيع، اور مزی نے **تهذیب الکمال** میں ان پر گفت گو شروع کرتے ہوئے کہا ہے: كان متعبدا کہ وہ کثرت سے عبادت کرنے والے تھے۔ لہذا ان پر قدح ان کے صدق پر طعن کی وجہ سے نہیں ہے، لہذا ان کی حدیث حسن شمار ہونی چاہیے۔ نیز البانی نے **سلسلة الأحاديث الضغيفة**[1] میں اگر چہ اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن یہ بھی بتایا ہے کہ اس حدیث کے ضرار بن صرد کے علاوہ دو طریق اور بھی ہیں، لہذا ضرار بن صرد کا ضعف کافی حد تک غیر متعلق ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک طریق کے بارے میں البانی کہتے ہیں کہ اس کے سارے راوی ثقہ اور مسلم کے راویوں میں سے ہیں۔ اس طریق پر البانی کا اعتراض صرف یہ ہے کہ سالم بن ابی الجعد اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، جب کہ ضرار بن صرد والے طریق میں یہ انقطاع نہیں ہے؛ اس لیے کہ وہاں سالم علقمہ سے اور علقمہ ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ اس ساری بات کو دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث کم از کم حسن ضرور ہے۔ سالم بن ابی الجعد چوں کہ تابعی ہیں (اور صحاحِ ستہ کے

---

۱- ابو عبد الرحمٰن ناصر الدین البانی، **سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الأمة**، رقم: ۲۲۰۹۔

راویوں میں سے ہیں) اس لیے مرسل ہونے کے علاوہ اس پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ البانی نے اس حدیث کے لیے تیسرے جس طریق کا ذکر کیا ہے وہ بیہقی کی **دلائل النبوۃ** سے لیا ہے۔ **دلائل النبوۃ** وہ کتاب ہے جس میں بیہقی نے رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو ذکر فرمایا ہے۔ واقعات کی پیشگی خبر دینے کی وجہ سے اس طرح کی حدیثوں کو بھی انھوں نے معجزات میں شمار کیا ہے۔ اس کا پورا متن **دلائل النبوۃ** سے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سالم بن ابی الجعد کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ نے یہ تو اطمینان ہمیں دلایا ہے کہ وہ ہم پر ظلم نہیں کرے گا، لیکن اللہ فتنے میں نہیں ڈالے گا، اس کی یقین دہانی نہیں کرائی، تو اگر میں فتنے کا زمانہ پالوں تو بتائیں کیا کروں (اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے جو شروع میں ہم نے کہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے آنے والے واقعات کے بارے میں بہت کثرت سے باتیں بتائیں تھیں۔ اس شخص کا ابن مسعود سے اس انداز سے سوال کرنا بتارہا ہے کہ لوگوں کو ادراک تھا کہ فتنوں نے کبھی نہ کبھی آنا ہی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فتنوں کے بارے میں پوچھنا اور مذاکرہ کرنا عہدِ صحابہ میں عام تھا، اسے نامناسب نہیں سمجھا جاتا تھا)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کتاب اللہ کو لازم پکڑنا، اس نے عرض کیا: یہ بتایئے اگر سارے ہی بظاہر کتاب اللہ کی طرف بلا رہے ہوں تو؟ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جب لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو ابن سمیہ حق پر ہو گا۔[1]

---

۱-أَخْبَرَنَا أَبُو عَبْدِ اللهِ الْحَافِظُ، وَأَبُو بَكْرٍ أَحْمَدُ بْنُ الْحُسَيْنِ الْقَاضِي، قَالَا [ص:٤٢٢]: حَدَّثَنَا أَبُو الْعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ، حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرٍ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ الصَّغَانِيُّ،

بیہقی کی اس روایت کی سند کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے البانی نے مسلم کے راویوں پر مشتمل قرار دیا ہے، اس سے نیچے امام بیہقی تک سارے راوی بھی حفاظِ حدیث میں سے ہیں۔[1] اس روایت پر مرسل ہونے کے علاوہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جن کے نزدیک حدیثِ مرسل، حجت نہیں بھی ہے، ان کے ہاں بھی اگر مرسل کی تائید کسی ضعیف حدیث سے ہو رہی ہو تو وہ

---

حَدَّثَنَا أَبُو الْجَوَّابِ، حَدَّثَنَا عَمَّارٌ يَعْنِي ابْنَ رُزَيْقٍ، عَنْ عَمَّارٍ الدُّهْنِيِّ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ، فَقَالَ لَهُ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ أَمَّنَنَا مِنْ أَنْ يَظْلِمَنَا، وَلَمْ يُؤْمِنَّا مِنْ أَنْ يَفْتِنَنَا أَرَأَيْتَ إِنْ أَدْرَكْتُ فِتْنَةً؟ قَالَ: عَلَيْكَ بِكِتَابِ اللهِ، قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ كُلُّهُمْ يَدْعُونَ إِلَى كِتَابِ اللهِ؟ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «إِذَا اخْتَلَفَ النَّاسُ كَانَ ابْنُ سُمَيَّةَ مَعَ الْحَقِّ» البیہقی، **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**، جماع أبواب إخبار النبي ﷺ، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِخْبَارِهِ عَنِ الْفِئَةِ الْبَاغِيَةِ مِنْهُمَا بِمَا جَعَلَهُ عَلَامَةً لِمَعْرِفَتِهِمْ، (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۰۵ھ)، ۶: ۴۲۰۔

۱- ابو الجواب سے روایت کرتے ہیں محمد اسحاق الصاغانی، ان کے بارے میں **تہذیب الکمال** میں ہے: أحد الثقات الحفاظ الرحالين، وأعيان الجوالين، یہ امام بخاری کے علاوہ صحاح ستہ والوں کے استاذ ہیں۔ ان سے روایت کرتے ہیں ابو العباس محمد بن یعقوب، ان کے بارے میں ابن عساکر لکھتے ہیں کہ مشہور محدث ہیں، ابن نقطہ نے **التقييد لمعرفة رواة السنن والمسانيد** میں لکھا ہے کہ سمع الكثير وطاف بالبلاد، حدث عنه الحفاظ، امام شافعی کے معروف صاحب ربیع بن سلیمان وغیرہ کے شاگرد ہیں، امام حاکم اور حافظ ابن مندہ وغیرہ کے استاذ ہیں۔ ان سے نیچے روایت کرنے دو حضرات جلیل القدر ائمہ اور امام بیہقی کے براہِ راست استاذ ہیں۔ ان میں سے ایک امام حاکم تو اتنے معروف ہیں کہ حدیث کا عام طالب علم بھی ان کے نام سے واقف ہے۔

قابلِ قبول ہو جاتی ہے، یہاں دو صحیح سندوں سے مروی مرسل روایت کی تائید ضرار بن صرد والی متصل مگر کسی قدر ضعیف روایت سے ہو رہی ہے، جس میں سالم بن ابی الجعد علقمہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن مسعود سے، تو اس سے ارسال والا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے؛ اس لیے مرسل کو حجت ماننے اور نہ ماننے والے تقریباً سب کے ہاں قابل قبول ہے۔ اگلی حدیث کا مضمون بھی یہی ہے، اس کو اس کے ساتھ ملالیں تو اور زیادہ تقویت ہو جاتی ہے۔ اس سے پچھلی حضرت حذیفہؓ کی حدیث کا مضمون بھی یہی تھا۔

## حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے کی بات ہے، کیوں کہ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے ہو گیا تھا۔ إن الفتنة قد وقعت، فحدثني ما سمعت النبيﷺ يقول. فتنے واقع ہوگئے ہیں (یعنی اس کے آثار پیدا ہوگئے ہیں) آپ نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنا ہے وہ مجھے بتایئے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ بہت بڑے فقیہ ہیں، لیکن ان چیزوں کے زیادہ ماہر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں، اس لیے اپنی معلومات کو تازہ کرنے کے لیے ان سے مذاکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: لو لم يأتيكم اليقين كتاب الله، سمعت رسول الله ﷺ يقول لابن سمية: ويح ابن سمية تقتله الفئة الباغية.[1]،

---

[1] - ابو العباس شہاب الدین احمد بن ابو بکر البوصیری(۸۴۰ھ)، **إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة**،كتاب المناقب،منقبة عمر بن عبد العزيز، رقم:۶۸۹۸۔ (بوصیری، نویں صدی ہجری کے بڑے محدث ہیں، یہ قصیدہ بردہ والے نہیں ہیں۔)

بوصیری نے ابو یعلی کے حوالے سے یہ حدیث ذکر کی ہے۔ خود **مسند أبو یعلی** کے اندر تو نہیں ملی، تاہم حافظ ابن کثیر نے **جامع المسانید والسنن** میں ابو یعلی کی پوری سند نقل کی ہے، اس میں مسلم بن کیسان الأعور ہیں[1] اور وہ ضعیف ہیں۔ اس میں بھی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ وہی کہہ رہے کہ اختلاف کی صورت میں تم نے دیکھنا یہ ہے کہ عمار کدھر جا رہے ہیں۔

ابھی تک یہ عرض کیا گیا کہ ان معاملات کے سب سے بڑے عالم اور رازدانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی رائے کیا تھی؟ اس سلسلے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔ ان کو اگر ملایا جائے تو یہ بات بہت واضح اور مسلم ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ہے، بلکہ یہ اشارہ دے کر گئے ہیں کہ عمار جدھر جائیں تم نے بھی ادھر جانا ہے اور عمار ظاہر ہے کہ حضرت علی کے ساتھ ہیں۔

## ۲- حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث

اب کچھ احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں:

۱- ان میں سے ایک تو وہی حدیث ہے جو ابھی گزر چکی کہ أبو الیقظان علی الفطرة حتی لایموت أو ینسیه الهرم. یہ پہلے اس حوالے سے نقل کی گئی ہے کہ حضرت حذیفہ نے اسے فتن پر منطبق کیا ہے۔

---

۱- ابن کثیر، **جامع المسانید والسنن**، أحادیث حذیفة، حبة العربي عنه، رقم: ۲۰۶۳۔

۲- ایک اور مشہور حدیث ہے اور بالکل صحیح ہے۔ یہ حدیث **مشکوۃ المصابیح** میں بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إني لَسْتُ أَدْرِي مَا بَقَائِي فِيكُمْ، فَاقْتَدُوا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي، وَأَشَارَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ، وَاهْتَدُوا بِهَدْيِ عَمَّارٍ، وَتَمَسَّكُوا بِعَهْدِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ».[1] مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کب تک تمھارے درمیان رہنا ہے؟ اب کیا کرنا ہے؟ تو آپ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں اور ان تین باتوں میں مختلف حوالوں سے چار شخصیات کا ذکر ہے۔ فرمایا: ۱-ان دو شخصیات کی پیروی کرنا جو میرے بعد ہیں: ابو بکر و عمر؛ ۲- عمار کے طریقے سے رہ نمائی حاصل کرنا؛ یہ دیکھنا کہ عمار کدھر جارہے ہیں۔ ۳- ابنِ ام عبد (حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) جو کچھ تمھیں بتاتے ہیں، اس کی پیروی کرو۔ یہ متن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ دونوں سے مروی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والی حدیث سندا صحیح ہے، اگرچہ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے لیکن دیگر بہت سے محدثین نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ایسا کئی جگہ ہوتا ہے کہ باقی محدثین کسی حدیث کو صحیح قرار دے رہے ہوتے ہیں، لیکن امام ترمذی اسے صرف حسن قرار دینے پر اکتفا فرماتے ہیں۔ اسی مضمون کی حدیث امام ترمذیؒ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے، اس کی سند میں اگرچہ کچھ کلام ہے لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والی حدیث بے غبار ہے۔ حضرت

---

۱ - ابو بکر احمد بن محمد بن ہارون بن یزید الخلّال البغدادی الحنبلی، **السنة**، ت، عطیہ الزہرانی، جامع أمر الخلافة بعد رسول اللہ ﷺ، رقم: ۳۳۵۔

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث إذا اختلف الناس؛ فابن سمية مع الحق. میں اگر تھوڑا بہت ضعف تھا بھی تو بات وہی ہے جو احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہو رہی ہے۔

۳- جنگِ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مد مقابل تھیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، لیکن ایک دوسرے کے مناقب دونوں بیان کر رہے ہیں۔ عمار کی منقبت کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کر رہی ہیں اور اس جنگ کے زمانے میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ خطبوں میں (جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت پر لوگوں کو ابھار رہے ہیں۔) کہ رہے ہیں کہ إنها زوجة نبيكم في الدنيا و الآخرة. کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس دنیا میں بھی اور جنت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں، لیکن اس خلافت کے معاملے میں تم نے کس کے ساتھ ہونا ہے، یہ اور مسئلہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں حدیث نقل کر رہی ہیں۔ یہ صحابہ کا انصاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ما خير عمار بين أمرين إلا اختار أرشدهما.[1] یہ حدیث سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے اور مختلف

---

۱ - یہ حدیث ترمذی میں بھی ہے۔ البانی نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ متعدد حضرات نے اس کو روایت کیا ہے۔ (ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، **سنن الترمذي**، ت، احمد محمد شاکر، محمد فؤاد عبد الباقی، ابراہیم عطوہ عوض، أبواب المناقب، باب مناقب عمار بن ياسر وكنيته أبو اليقظان رضي الله عنه، رقم:۳۷۹۹۔)

حضرات نے اس کو روایت کیا ہے کہ جب بھی عمار کے سامنے دو راستے آتے ہیں تو وہ اس کو اختیار کرتا ہے جس میں زیادہ رشد وہدایت ہوتی ہے۔ اس مضمون کی حدیث حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ اس مجموعۂ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشد وہدایت کی علامت قرار دیا ہے، بلکہ **صحیح بخاری** میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں تو یہ آتا ہے: الذي أجاره الله من الشيطان على لسان نبيه.[1] کہ اللہ کے نبی نے جس کے بارے میں کہا کہ اس پر شیطان کا اثر نہیں ہو سکتا۔ یہی بات ترمذی کی ایک روایت میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے نقل فرمائی۔ امام ترمذی نے اس کی سند کو حسن صحیح کہا ہے۔

---

[1] - **صحيح البخاري** میں ہے: حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ، عَنِ الْمُغِيرَةِ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ، قَالَ: قَدِمْتُ الشَّأْمَ، فَقُلْتُ: مَنْ هَا هُنَا؟ قَالُوا أَبُو الدَّرْدَاءِ، قَالَ: «أَفِيكُمُ الَّذِي أَجَارَهُ اللهُ مِنَ الشَّيْطَانِ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟» حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، عَنْ مُغِيرَةَ، وَقَالَ: الَّذِي أَجَارَهُ اللهُ عَلَى لِسَانِ نَبِيِّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِي عَمَّارًا. (**صحيح البخاري**، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، رقم: ۳۲۸۷۔)

## ۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہادی ہونے کے حوالے سے بعض احادیث

بعض احادیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سچائی کی اور خاص طور پر ہدایت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ یوں تو تمام ہی صحابہ ہدایت یافتہ جماعت ہیں، لیکن ان کی اپنی اپنی امتیازی خصوصیات بھی ہیں۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کا زہد ہے، ابن مسعود و معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما وغیرہ کا تفقہ ہے، ابی بن کعب کی قراءت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بنیادی خوبی ہدایت ہے۔ وہ ہادی ہیں۔ اللہ نے ان کے اندر ہدایت کی صلاحیت سب سے زیادہ رکھی ہے۔ یہ بات کثیر احادیث سے ثابت ہے۔ ان میں سے چند ایک یہاں ذکر کی جائیں گی، لیکن احادیث سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے بعض لوگوں کو اس طرح کی باتیں سن کر اجنبیت سی محسوس ہو کہ حق علی کے ساتھ ہے یا علی حق کے ساتھ ہے، لیکن اس میں کوئی اجنبیت کی بات نہیں، ایک تو اس لیے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا صحابہ کی مختلف خصوصیات ہیں، ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت اگر ہدایت کو بتایا گیا ہو تو کوئی نئی بات نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی جب شوریٰ مقرر کی تو ان چھے حضرات کی ممکنہ حکم رانی کے بارے میں مختلف تبصرے کیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق ایک بات یہ کہی کہ اگر اسے خلیفہ بنایا گیا تو وہ لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لے کر چلے گا۔[1] اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ حضرت

---

۱۔ ابنِ سعد لکھتے ہیں: ”فلما خرجوا من عند عمر قال عمر: لو ولوها الأجلح سلك بهم الطريق. فقال له ابن عمر: فما يمنعك يا أمير المؤمنين؟ قال: أكره أن أتحملها حيا وميتا.“ (ابو عبداللہ محمد بن سعد، **الطبقات الکبریٰ**، محمد عبدالقادر عطا (**بیروت**: دار الكتب العلمية، ۱۹۹۰ء)، ۳: ۲۶۰۔)؛ ابنِ عبدالبر لکھتے ہیں: ” إن ولوها الأَجْلَح سلك بهم الطريق المستقيم- يَعْنِي عليا. (ابو عمر یوسف بن عبداللہ القرطبی، **الاستيعاب في معرفة**

علی رضی اللہ عنہ خلافت کا دور آنے سے پہلے حالات بہت الجھ چکے ہوں گے، اس لیے اللہ نے اپنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ کہلوادیا کہ علی حق وصواب کی نشانی ہے؛ اس لیے کہ پہلے گزر چکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے فتن کے بارے میں بہت اہتمام سے باتیں فرمائیں اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح کے حالات میں کیا کرنا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ ارشادات بھی اسی کا حصہ ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بکثرت نقل کرتے ہیں کہ ایک فتنہ ہو گا جس میں یہ شخص -یعنی عثمان- حق پر ہو گا۔ اس طرح کی متعدد روایتیں، ان میں سے مرۃ بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث جو ترمذی میں ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فتن کا ذکر فرمایا ان کا قریب ہونا بیان فرمایا۔ منہ پر رومال ڈالے ایک شخص گزرے تو آپ نے فرمایا کہ یہ شخص اس دن ہدایت پر ہو گا، میں نے اٹھ کر دیکھا تو وہ عثمان تھے۔ میں نے مزید تسلی کے لیے ان کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے پوچھا: یہی؟

---

**الأصحاب**، ت، *علی محمد البجاوی* (بیروت: دار الجیل، ۱۹۹۲ء)، ۳: ۱۱۵۴۔)؛ *محب الدین الطبری* لکھتے ہیں: " وعن عمر أنه قال حين طعن وأوصى: إن ولوها الأجلح سلك بهم الطريق المستقيم يعني عليًا أخرجه أبو عمر. وعن عمرو بن ميمون قال: كنت عند عمر إذ ولى الستة الأمر، فلما جاوزوا أتبعهم بصره، ثم قال: لئن وليتم هذا الأجلح ليركبن بكم الطريق يعني عليا أخرجه ابن الضحاك. وفي لفظ: إن ولوها الأصيلع يحملهم على الحق ،وإن السيف على عنقه. أخرجه القلعي، وقد تقدم في فصل مقتل عمر." (*ابوالعباس احمد بن عبداللہ، محب الدین الطبری*، **الرياض النضرة في مناقب العشرة** (بیروت: دار الكتب العلمية)، ۳: ۲۲۸۔)

آپ نے فرمایا: ہاں یہی۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی بات صادر ہو سکتی ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیوں نہیں؟

### ۱- علی کو ہدایت یافتہ ہدایت دینے والا پاؤ گے

ایک حدیث ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی، اس میں آتا ہے: قيل لرسول الله: من نؤمر بعدك؟ قال: إن تؤمروا أبا بكر تجدوه أميناً زاهداً في الدنيا راغباً في الآخرة، وإن تؤمروا عمر تجدوه قوياً أميناً لا يخاف في الله لومة لائم، وإن تؤمروا علياً- ولاأراكم فاعلين- تجدوه هادياً مهدياً. يأخذ بكم الطريق المستقيم. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: آپ کے بعد ہم کس کو امیر مقرر کریں؟ اور ایک روایت میں ہے کہ یارسول اللہ، اپنے بعد کسی کو نائب بنادیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، کیوں کہ میں اگر خود کسی کو متعین کروں گا، تو اس کی نافرمانی کا گناہ میری نافرمانی کے برابر ہو گا۔ یہ تو امت کو مشکل میں ڈالنے والی بات ہے، البتہ آپؐ نے چند شخصیات کا نام لے کر ان کے اوصاف کا ذکر کیا کہ ان میں یہ یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: إن تؤمروا أبا بكر تجدوه أمينًا زاهدًا في الدنيا راغبًا في الآخرة. ابو بکر کو امیر بناؤ گے تو اسے امانت دار، دنیا سے بے رغبت اور آخرت میں رغبت کرنے والا پاؤ گے۔ اس زہد کا یہ عالم ہے کہ اپنے کفن کے لیے بھی نئے کپڑے گوارا نہیں کیے۔ کفن کے لیے اپنے استعمال شدہ کپڑوں کے بارے میں وصیت کر کے گئے کہ وہ ہو گا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہتے ہیں اس نے خلافت چھین لی۔ خلافت چھین کر اس نے کیا کرنا ہے؟ حضرت ابو بکر کا اپنا پھیلا ہوا کاروبار تھا، لیکن

خلافت کی ذمے داریوں کی خاطر اپنا کاروبار چھوڑ دیا۔ مشکل وقت میں خلافت کا معاملہ سنبھالا۔ نصوص کو تو چھوڑیں، الزام دیتے وقت بات کم از کم عقل میں تو آنی چاہیے۔ ویسے کہنے کو شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں شریعت کے مصادر میں سے عقل بھی ایک مصدر ہے؛ قرآن، سنت، اقوالِ ائمہ اور عقل، لیکن عقل آپ کے ہاں مصدر ہے تو اس قسم کے امور میں یہ غیر عقلی بات باعث تعجب ہے۔ بہر حال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ الفاظ فرمائے جو ان کی انتہائی شرافت کا پتا دیتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:إن تؤمروا عمر تجدوه قويًا أمينًا لايخاف في الله لومة لائم. وإن تؤمروا عليًا ولاأراكم فاعلين تجدوه هاديًا مهديًا يأخذبكم الطريق المستقيم.[1]

(اگر تم عمر کو امیر بناؤ گے تو اسے مضبوط اور امانت دار پاؤ گے جو اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا۔ اگر تم علی کو امیر بناؤ–اور مجھے نہیں لگتا کہ تم ایسا کروگے–تو اسے ہدایت دینے والا، ہدایت یافتہ پاؤ گے جو تمھیں سیدھی راہ کی طرف لے جائے گا۔)

اس حدیث کی سند پر بعض لوگوں نے اشکال کیا ہے، لیکن وہ اشکال اتنا وزنی نہیں ہے۔ یہ حدیث اول تو صحیح ہے، نہیں تو حسن سے کم بہر حال نہیں ہے۔ خصوصا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے راوی زید بن یثیع ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں۔ یہ ہیں تو ثقہ راوی، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے **تقريب التهذيب** اور ذہبی نے **الكاشف**

---

[1] -ابوعبداللہ احمد بن حنبل، **مسند الإمام أحمد بن حنبل**، ت، شعیب الارنؤوط ودیگر، مسند علي بن أبي طالب، رقم:۸۵۹۔

میں انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ امام ترمذی نے کتاب الحج میں ان کی ایک حدیث روایت کر کے اسے حسن صحیح کہا ہے، لیکن امام دَارَقُطنی نے یہ کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ان سے یہ حدیث مرسلاً مروی ہے، یعنی زید بن یثیع، جو کہ تابعی ہیں، نے کسی صحابی کا حوالہ نہیں دیا۔ گویا دَارَقطنی کے نزدیک بھی یہ مرسلِ صحیح ہے، لیکن مرسل ہونا کسی حدیث کو رد کرنے کا باعث نہیں ہوتا، خصوصاً جب کہ اس کی تائید ایک ضعیف روایت سے ہو رہی ہے، جو مسندِ بزار اور مستدرکِ حاکم وغیرہ میں موجود ہے۔[1] اور اس میں ابو وائل (شقیق بن سلمہ) اس حدیث کو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں۔ پھر جن لوگوں نے حدیث کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے، اس کی وجہ بھی وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ زید بن یثیع کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، کبھی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اور کبھی صحابی کے حوالے کے بغیر، لہٰذا انھوں نے تیسری قسم کی روایت کو ترجیح دی۔ ہم جانتے ہیں کہ ارسال (صحابی کے حوالے کے بغیر حدیث بیان کرنا) کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ تابعی نے وہ حدیث متعدد صحابہ سے سنی ہوتی ہے۔ جب کسی نے ایک شخص سے بات سنی ہو تو اس شخص کا حوالہ دے دیا جاتا ہے، اگر متعدد لوگوں سے سنی ہو تو بعض اوقات کسی کا بھی حوالہ نہیں دیا جاتا۔ یہاں بھی ارسال کی وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ بہر حال سوائے اس کے کہ بعض محدثین کے ہاں اس روایت کا مرسل ہونا راجح ہے، اس کی سند پر کوئی اور قابلِ ذکر

---

۱- ابن کثیر نے یہ حدیث **مسند بزار** کے حوالے سے ان کی پوری سند کے ساتھ ذکر کی ہے، دیکھیے: **جامع المسانید والسنن رقم: ٢٣٦٥ ۔**

اعتراض نہیں ہے۔ ہیثمی نے بھی اس حدیث کے لیے متعدد حوالے دیے ہیں اور کہا ہے کہ بزار کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اس طرح کے معاملات میں کسی حدیث کو قبول کرنے کا معیار کیا ہے؟ یہاں آکر بعض اوقات لوگ معیار بہت سخت کر دیتے ہیں۔ **صحیح مسلم** کی حدیث کو بھی رد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، لیکن اگر معیار سخت ہی کرنا ہے تو پھر بحیثیت مجموعی مکمل معیار کو سخت کرنا ہوگا، یعنی ہر جگہ پھر صرف اسی معیار کی حدیث کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ درست نہیں کہ ہماری تحریر و تقریر میں نہ معلوم کتنی اس سے بھی کہیں زیادہ کم زور حدیثیں بڑے وثوق سے بیان ہوتی ہیں، ان پر بات کرنے کی تو کبھی زحمت نہ ہو، بلکہ خود بھی اس میں شریک ہوں اور یہاں آکر نقدِ حدیث کا سارا جوش ظاہر ہو جائے۔

اس حدیث کی تشریح میں حضرت مولانا ادریس کاندھلوی ؒ کی **مشکوۃ المصابیح** پر **التعلیق الصبیح** شرح قابلِ ملاحظہ ہے۔ انھوں نے اس کی تشریح میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی ؒ کی بہت خوب صورت تقریر نقل کی ہے جس کا کچھ حصہ آگے آرہا ہے۔[1] جیسا کہ پہلے عرض کیا، اس حدیث کی سند میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، اصل میں بعض لوگوں کو جو اشکال ہوا ہے وہ لاأراکم فاعلین (تم علی کو بناؤ گے نہیں۔) کے الفاظ سے ہوا ہے کہ یہ متن عجیب سا لگ رہا ہے۔ اس وقت اس کی تفصیلی تشریح میں تو نہیں جاتا، البتہ یہ بات تو ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا دور جب آتا ہے تو اس میں رکاوٹیں کھڑی تو ہوئی ہیں اور

---

۱- ملاحظہ ہو: مولانا محمد ادریس کاندھلوی، التعلیق الصبیح (لاہور: المکتبۃ العثمانیۃ) ۷:۳۷۹۔

اس کا ذکر بھی حدیثوں میں آتا ہے، اس لیے اس سیاق میں دیکھیں تو یہ کوئی اجنبی بات نہیں ہے۔

یہاں اس حدیث کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ ابو بکرؓ کی خصوصیات ذکر کی گئیں، عمرؓ کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں، جو بہت اعلیٰ خصوصیات ہیں۔ علیؓ کی جو خصوصیات ذکر کی گئی ہیں، یہ ہیں کہ وہ ہادی ہے، مہدی ہے اور تمھیں طریقِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک بڑی خصوصیت ہدایت کے راستے پر چلنا اور لوگوں کو سیدھے راستے پر چلانا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کی تقریر لمبی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صفات بیان کر کے امت پر چھوڑ دیا کہ کس زمانے میں کن صفات کی ضرورت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد خلافت چوں کہ بلافصل تھی، اس لیے خلیفہ وہ شخص ہونا چاہیے، جس میں نبوت کے بنیادی اوصاف پائے جاتے ہوں اور نبوت کا بنیادی وصف تعلق مع اللہ اور انقطاع عن الدنیا ہوتا ہے، اس لیے وہ اس وقت زیادہ موزوں تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کو ذرا استوار کیا، پاؤں پر کھڑا کر دیا، اب اس کو آگے پھیلانا تھا، اندرونی اور بیرونی طور پر اصلاحات لانی تھیں۔ اس کے لیے ایک دبنگ بندے کی ضرورت تھی۔ امت نے اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا جو قوی، امین اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کی پرواہ نہ کرنے والے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کا ذکر کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں محسوس کی گئی کہ (حضرت نانوتویؒ کی تشریح کے مطابق) کہ وہ در حقیقت دورِ فاروقی کا دوسرا رخ ہے، کیوں کہ سختی کے بعد نرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو فتن عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اب الجھے ہوئے معاملات ہیں، پتا ہی نہیں چل رہا کہ کیا ہو رہا ہے، کیا نہیں ہو رہا اور کرنا

کیا ہے؟ اس حالت میں ضرورت تھی اس شخصیت کی جس کا سب سے بڑا وصف ہدایت ہو، اس پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کیا جاسکتا ہو کہ یہ جدھر جارہا ہے، ٹھیک جارہا ہے۔ تو اس موقع پر امت نے انتخاب کیا اس شخصیت کیا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تجدوه هاديًا مهديًا يأخذبكم الطريق المستقيم.

## ۲- حق اس کے ساتھ ہے، حق اس کے ساتھ ہے

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے۔ ابو یعلیٰ موصلی وغیرہ نے اسے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

كُنَّا عِنْدَ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نَفَرٍ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ، فَخَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخِيَارِكُمْ؟»، قَالُوا: بَلَى، قَالَ: «خِيَارُكُمُ الْمُوفُونَ الْمُطَيَّبُونَ، إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْخَفِيَّ التَّقِيَّ»، قَالَ: وَمَرَّ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ: «الْحَقُّ مَعَ ذَا، الْحَقُّ مَعَ ذَا».[1]

ہم مہاجرین وانصار کے ساتھ بیٹھے تھے کہ نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں سے سب سے اچھے لوگ کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا ضرور بتایئے۔ آپ نے فرمایا: وہ پاکیزہ لوگ ہیں، عہد کا پاس کرنے والے ہیں، وہ تم میں سب سے اچھے ہیں۔ اللہ اس بندے کو پسند کرتے ہیں جو مخفی رہنا چاہتا ہو، زیادہ شہرت نہ چاہتا ہو اور زیادہ متقی ہو۔ اسی دوران میں حضرت

---

۱- ابو یعلی احمد بن علی الموصلی (۳۰۷ھ)، **مسند أبي يعلى**، ت، حسین سلیم احمد، من مسند أبي سعيد الخدري، رقم: ۱۰۵۲۔

علی رضی اللہ عنہ کا سامنے سے گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق اس کے ساتھ ہے، حق اس کے ساتھ ہے۔

**مسند أبي يعلى** کے محقق حسین سلیم اسد کہتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک راوی صدقہ بن ربیع کو ابنِ حبان اور ہیثمی نے ثقہ قرار دیا ہے اور باقی سب راوی ثقہ ہیں۔ ہیثمی نے **مجمع الزوائد** میں بغیر کسی اشتثنا کے کہا ہے: رجاله ثقات. یہ حدیث حسن سے کم بہر حال نہیں ہے۔ جب کہ یہی مضمون دیگر حدیثوں سے بھی ثابت ہو رہا ہے۔

### ۳- علی حق پر ہے

حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث ہے۔ آپ سے اس حوالے سے متعدد روایات ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذکر کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے، امِ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ علي على الحق، من اتبعه اتبع الحق، ومن تركه ترك الحق. لیکن وہ فرماتی ہیں کہ یہ میری رائے نہیں ہے، بلکہ عهد معهود قبل يومنا هذا.[1] یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمودہ بات ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کا یہ عہد ہے۔ اس کی سند بھی بحیثیت مجموعی قابلِ قبول ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے کہا ہے اس کی دو سندوں میں سے ایک کے راوی ثقہ ہیں، بس اس میں مالک بن جعونہ ایک راوی ہیں جن کا مجھے پتا نہیں ہے، لیکن

---

۱ - سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی (۳۶۰ھ)، **المعجم الكبير**، ت، حمدی بن عبد المجید السلفی، مسند النساء، أزواج رسول الله ﷺ، أم سلمة واسمها هند بنت أبي أمية بن حذيفة بن المغيرة بن عبد الله بن عمرو بن مخزوم بن نقطة بن مرة بن كعب بن لؤي بن غالب، رقم: ۷۵۸۔

مالک بن جعونہ براہِ راست حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، یعنی وہ تابعی ہیں۔ طبقہ تابعین کے بارے میں خصوصاحنفیہ کا رجحان یہ ہے کہ ان میں اصل عدالت ہوتی ہے، لہذا جب تک جرح ثابت نہ ہو جائے اس کی روایت کو قبول کیا جاتا ہے۔[1]

## ۴- علی قرآن کے ساتھ ہے

حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک اور روایت ہے۔ مستدرک حاکم اور دیگر کتابوں میں ہے۔ اس میں ہے کہ ابو ثابت مولیٰ ابی ذر کہتے ہیں کہ جنگِ جمل میں، مَیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ دوسرے فریق میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ظہر تک تو میری یہ کیفیت رہی، ظہر کی نماز کے بعد اللہ نے مجھے شرحِ صدر دے دیا اور پھر میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال کیا۔ فارغ ہو کر مدینے آیا اور حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھیں بتایا کہ میں نے اس طرح سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا وہ کام ہے جس کی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تاکید کر کے گئے تھے۔ حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: أحسنت. سمعتُ رسول الله يقول:علي مع القرآن والقرآن مع علي، لن يتفرقا حتى يردا عليّ

---

۱- نیز دولابی (جو تقریباامام نسائی کے معاصر محدث ہیں) کی **الكنى والأسماء** میں یہی حدیث ایک ضعیف سند کے ساتھ ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ عیاض بن عیاض کہتے ہیں کہ میں نے جب یہ حدیث مالک بن جعونہ سے سنی تو ان سے قسم دے کر پوچھا کہ کیا واقعی تم نے خود ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سنی ہے تو انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ میں نے ام المؤمنین سے خود سنی ہے۔ پھر میں مالک بن جعونہ کی قوم کے پاس ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے گیا تو انھوں نے بھی مالک کی تعریف کی۔ (ابو بشر محمد بن احمد الدولابی، حرف القاف، من كنيته أبو قيس، **الكنى والأسماء**، رقم: ۱۶۲۹۔

الحوضَ.[1] حاکمؒ نے اس کو صحیح الإسناد کہا ہے اور اس کے ایک راوی ابو سعید التیمی کے بارے میں کہا ہے: ثقة مأمون. حافظ ذہبیؒ نے بھی **تلخیص المستدرک** میں اس کو صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے **إتحاف المهرة** میں حاکم کی یہ پوری بات کسی اعتراض کے بغیر نقل کی ہے۔ ابو سعید تیمی پر اگرچہ بعض حضرات نے جرح کی ہے، لیکن یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ صفین میں تھے، امام بخاری نے **التاریخ الکبیر** میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے، جس کا مطلب یہ کہ یہ تابعین میں سے ہیں، جن حضرات سے ان پر جرح منقول ہے، انھوں نے اس کی کوئی وجہ ذکر نہیں کی۔ نویں صدی ہجری کے معروف حنفی عالم قاسم قُطلُوبُغا نے ان کا ذکر اپنی کتاب **الثقات ممن لم يقع في الكتب الستة** میں کیا ہے۔ اس کی سند پر مزید بات ہو سکتی ہے، لیکن خوفِ طوالت سے اسے ترک کیا جاتا ہے، تاہم یہ بات ایک اور حدیث سے بھی ثابت ہو رہی ہے اور وہ بالکل صحیح ہے، جس کا ذکر بعد میں آتا ہے۔

---

[1] - **المستدرك على الصحيحين**، ت، مصطفی عبد القادر عطا، کتاب معرفة الصحابة رضي الله عنهم «أما الشيخان فإنهما لم يزيدا على المناقب، وقد بدأنا في أول ذكر الصحابي بمعرفة نسبه ووفاته، ثم بما يصح على شرطهما من مناقبه مما لم يخرجاه فلم أستغن عن ذكر محمد بن عمر الواقدي وأقرانه في المعرفة»، وأما قصة اعتزال محمد بن مسلمة الأنصاري عن البيعة، رقم: ۴۶۲۸۔

## ۵- حدیثِ سعد: علی حق کے ساتھ ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے۔ اس کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں کہ ایک راوی ہیں سعد بن شعیب؛ ان کا پتا نہیں کہ کیسے ہیں، باقی راوی صحیح کے ہیں۔ تاہم کسی حدیث میں مجہول راوی کا ہونا اتنی بڑی بات نہیں ہوتی۔ کسی حدیث میں متہم بالکذب راوی[1] کا ہونا بڑی خطرناک بات ہوتی ہے، کیوں کہ اس کی دوسرے طرق سے بھی تائید نہیں ہوتی۔ مجہول راوی والی حدیث کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مضمون دوسری احادیث میں آجائے تو وہ قابلِ قبول بن جاتی ہے۔ یہ علمِ حدیث کے اصول ہیں اور میں نے پہلے عرض کیا کہ جو اصول ایک جگہ اپنانے ہیں، وہی دوسری جگہ بھی اپنانے ہوں گے۔ اگر کسی معاملے میں آپ کے اصول اتنے سخت ہیں کہ آپ امام بخاریؒ سے بھی دو قدم آگے نکلنا چاہتے ہیں، تو پھر پورے ذخیرۂ حدیث پر اس کا اطلاق کرنا ہو گا۔

### جملۂ معترضہ

اصل حدیث جس کا یہاں ذکر مقصود ہے اس سے پہلے بطور تمہید یہاں یہ ذہن میں رکھیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ذہنی طور پر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگوں میں شرکت نہیں کی، بلکہ سیاسی طور پر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی بڑائی ہے، جب کہ دوسرے فریق کی یہ بات **صحیح مسلم** میں موجود ہے (اس کی جو بھی شرح شارحین کرتے ہیں، وہ ایک الگ بحث ہے۔) کہ حضرت

---

۱- وہ راوی جس پر جھوٹ بولنے کی تہمت ہو۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا: ما منعك أن تسب أبا تراب.[1] سبّ کا جو بھی ترجمہ کریں، کم از کم ترجمہ تنقید تو بنتا ہی ہے، یعنی آپ ابوتراب پر تنقید کیوں نہیں کرتے؟ مطلب یہ کہ ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ، جن کو اپنے برحق ہونے کا یقین ہے، لیکن انھوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اس طرح کی بات نہیں کی، بلکہ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا بھی کہ فلاں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ہمارا ساتھ نہیں دیا تو ہمارے خلاف بھی نہیں ہے، کوئی بات نہیں۔

علی بہت عظیم انسان ہیں اور واقعات کو اگر دیکھا جائے تو ان کے ہاں جو عظمتیں نظر آتی ہیں اور جو توازن ملتا ہے، وہ بہت غیر معمولی ہے۔ جس طرح کے حالات کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سامنا کرنا پڑا،اس طرح کے انتہائی غیر معمولی حالات کا سامنا کرتے ہوئے ردعمل میں انسان غیر متوازن ہو ہی جاتا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل کہیں ایسا نہیں نظر آتا۔ ہر بات نپی تلی نظر آتی ہے۔ کوئی چیز جذبات کے تابع نہیں ہے۔

حضرت سعدؓ نے وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین باتیں حضرت علیؓ کے بارے میں نقل کی ہیں، وہ بھی اسی موقع کی ہیں۔ لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ، وَيُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُولُهُ.[2] (میں کل جھنڈا اس شخص کو دوں گا، جو اللہ اور اس کے رسول سے

---

[1] - **صحيح مسلم**،كتاب فضائل الصحابة رضي الله تعالى عنهم،باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه،رقم:۲۴۰۴۔

[2] - یہ الفاظ حدیث کے مختلف مجموعوں جیسے **صحيح البخاري**،**صحيح ابنِ حبان**،**سنن سعيد بن منصور**، **السنن الكبرى** (نسائی)، **المعجم الكبير** (طبرانی)اور دیگر

محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔) یہ اعتماد کی بہت بڑی سند ہے۔ دوسری بات یہ کہ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ مدینہ منورہ میں چھوڑ کر جاتے ہوئے فرمایا:أنت مني بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لانبي بعدي.(تمھاری میرے ساتھ وہ نسبت ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام کی

---

مجموعوں میں مختلف صحابہ سے الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے الفاظ **السنن الكبرى** (نسائی) میں اس طرح آئے ہیں:"كُنْتُ جَالِسًا فَتَنَقَّصُوا عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ: لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَهُ خِصَالٌ ثَلَاثَةٌ، لَأَنْ تَكُونَ لِي وَاحِدَةٌ مِنْهُنَّ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ، سَمِعَتْهُ يَقُولُ: «إِنَّهُ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي» وَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: «لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ، وَيُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُولُهُ» وَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: «مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ»"یعنی میں بیٹھا ہوا تھا کہ بعض لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص شان میں باتیں کیں تو کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ علی کے تین اوصاف ہیں اور ان میں سے ایک بھی میرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: وہ میرے لیے ایسے ہی ہیں، جیسے ہارون موسیٰ کے لیے، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں کل جھنڈا اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے اور میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی مولا ہے۔(ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب النسائی،**السنن الكبرى**، ت، حسن عبد المنعم شلبی،كتاب الخصائص،ذكر منزلة علي بن أبي طالب رضي الله عنه من الله عز وجل،رقم:۸۳۴۳۔)

تھی، مگر یہ کہ ہارون علیہ السلام بھی نبی تھے، جب کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔) تیسرے آیت مباہلہ والا واقعہ ذکر کیا۔

یہ بات ذرا طویل ہو گئی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی جو حدیث پیش کرنا مقصود تھی **مجمع الزوائد** میں اس کے الفاظ ہیں:

وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيِّ أَنَّ فُلَانًا دَخَلَ الْمَدِينَةَ حَاجًّا، فَأَتَاهُ النَّاسُ يُسَلِّمُونَ عَلَيْهِ، فَدَخَلَ سَعْدٌ، فَسَلَّمَ، فَقَالَ: وَهَذَا لَمْ يُعِنَّا عَلَى حَقِّنَا عَلَى بَاطِلِ غَيْرِنَا. قَالَ: فَسَكَتَ عَنْهُ [سَاعَةً]. فَقَالَ: مَا لَكَ لَا تَتَكَلَّمُ؟ فَقَالَ: هَاجَتْ فِتْنَةٌ، وَظُلْمَةٌ. فَقَالَ لِبَعِيرِي: اخْ اخْ، فَأَنَخْتُ حَتَّى انْجَلَتْ. فَقَالَ رَجُلٌ: إِنِّي قَرَأْتُ كِتَابَ اللهِ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَى آخِرِهِ فَلَمْ أَرَ فِيهِ اخْ اخْ. [قَالَ فَغَضِبَ سَعْدٌ] فَقَالَ: أَمَا إِذْ قُلْتُ ذَاكَ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يَقُولُ: «عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ أَوِ الْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ حَيْثُ كَانَ». قَالَ: مَنْ سَمِعَ ذَلِكَ؟ قَالَ: قَالَهُ فِي بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ. قَالَ: فَأَرْسَلَ إِلَى أُمِّ سَلَمَةَ فَسَأَلَهَا، فَقَالَتْ: قَدْ قَالَهُ رَسُولُ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فِي بَيْتِي. فَقَالَ الرَّجُلُ لِسَعْدٍ: مَا كُنْتَ عِنْدِي قَطُّ أَلْوَمَ مِنْكَ الْآنَ. فَقَالَ: وَلِمَ؟ قَالَ: لَوْ سَمِعْتُ هَذَا مِنَ النَّبِيِّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - لَمْ أَزَلْ خَادِمًا لِعَلِيٍّ حَتَّى أَمُوتَ.[1]

---

۱ - ہیثمی، **مجمع الزوائد**، كتاب الفتن، باب فيما كان في الجمل وصفين وغيرهما، رقم: ۱۲۰۳۱۔ علامہ ہیثمیؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس حدیث کی سن میں سعد بن شعیب ہے جسے میں نہیں جانتا، جب کہ اس کے باقی افراد صحیح کے ہیں۔

محمد بن ابراہیم التیمی کہتے ہیں کہ کوئی فلاں شخصیت کا حج کے سلسلے میں مدینہ منورہ آنا ہوا، لوگ ان کے پاس سلام کرنے کے لیے آئے تو سعد بن ابی وقاص بھی آئے اور سلام کہا۔ ان صاحب نے کہا کہ اس شخص نے دوسروں کے باطل پر ہمارے حق کی مدد نہیں کی۔ سعد کچھ دیر خاموش رہے تو انھوں نے کہا: آپ بولتے کیوں نہیں؟ انھوں نے کہا فتنہ بھڑکا اور اندھیرا چھایا۔ کہنے والے نے میرے اونٹ سے کہا: اخ اخ، تو میں نے اسے بٹھادیا اور وہ بیٹھ گیا۔ (دراصل حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مسلمانوں کی باہمی جنگ میں کسی کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، مسلمان کی تلوار صرف کافر کے خلاف استعمال ہونی چاہیے) اس پر مجلس میں موجود ایک آدمی نے کہا: میں نے اللہ کی کتاب شروع سے آخر تک پڑھی ہے، لیکن مجھے اس میں کہیں اخ اخ کے الفاظ نظر نہیں آئے (یعنی الگ تھلگ ہونے اور گوشہ نشینی کی بات مجھے قرآن میں نہیں ملی، اس لیے آپ کو ہمارا ساتھ دینا چاہیے تھا)۔ اس پر سعد کو غصہ آیا اور کہا: ارے تونے وہ بات کہی ہے؟ میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علی، حق کے ساتھ ہے یا یہ فرمایا کہ حق، علی کے ساتھ ہے، وہ جہاں بھی ہو (یعنی غنیمت سمجھو کہ میں نے الگ تھلگ ہونے کی راہ اختیار کی ہے، اگر گوشہ نشینی اختیار نہ کرتا اور کسی کا ساتھ ہی دیتا تو تمھارا نہیں علی کا ساتھ دیتا)۔ اس شخص نے کہا: یہ بات کسی اور نے بھی سنی؟ سعد نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ام سلمہ کے گھر میں فرمائی تھی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف آدمی بھیجا گیا اور ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: ہاں یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں فرمائی تھی۔ اس آدمی نے حضرت سعد سے کہا: آپ پہلے میرے نزدیک اتنا قابلِ ملامت نہیں تھے، جتنے اب ہو۔ انھوں نے کہا: کیوں؟ اس نے کہا کہ اگر میں یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیتا تو مرتے دم تک علی کا خدمت گزار ہوتا۔

(ویسے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا تعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نیاز مندی کا تھا، خود من كنت مولاه فعلي مولاه والی حدیث روایت کرتے ہیں، البتہ قتال کے معاملے میں ان کی خاص رائے تھی، صحابہ کے مواقف ہمارا موضوع نہیں ہے، تاہم آگے چل کر بہت مختصر سی بات ان شاء اللہ اس پر کر لیں گے)۔ 'حق علی کے ساتھ ہے۔' والی بات ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی دیگر روایتوں میں بھی ہے۔ یہ ساری روایتیں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ سندوں میں جہاں معمولی کلام ہے، اس کے باوجود ایک دوسری کی تائید کے باعث بات ثابت ہو جاتی ہے۔

یہاں سوال ہوگا کہ پھر حضرت سعدؓ نے حضرت علیؓ کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ جواب یہ ہے کہ جس کا ساتھ نہیں دیا تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کون ہوتے ہیں سوال کرنے والے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سارے جایا کرتے تھے سوائے غزوۂ تبوک کے (جہاں نہ جانے والوں پر عتاب ہوا ہے، اگرچہ نہ جانے والے بھی اسے غیر حق نہیں سمجھتے تھے۔)؟ اس لیے تخلف (پیچھے رہنے) کی وجہ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مزید تفصیل آگے عرض کریں گے کہ قتال سے پیچھے رہنے والوں کی وجوہات کیا تھیں۔[1] تاہم یہاں اتنا ذہن میں رکھیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان میں شامل تھے جنھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے میں تو کوئی تردد نہیں تھا، تاہم ان کا اجتہاد یہ تھا کہ مسلمان کی تلوار مسلمان کے خلاف کسی صورت میں بھی نہیں چل سکتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنے اجتہاد پر عمل کرنے سے زبردستی روکا نہیں، تاہم بعد

---

۱- ملاحظہ ہو مشاجرات کی بحث میں عنوان: ''متخلفین کا نقطۂ نظر''

میں اس بات پر اتفاق ہوگیا ہے کہ یہ اجتہاد درست نہیں تھا (جیسا کہ بالکل آخر میں "متخلفین کا نقطۂ نظر" کے عنوان سے آئے گا)۔

## ۶- علی کو چھوڑنے والا مجھے چھوڑنے والا ہے

حضرت ابو ذر غِفاری رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: يَا عَلِيُّ، مَنْ فَارَقَنِي فَارَقَ الله، وَمَنْ فَارَقَكَ يَا عَلِيُّ فَارَقَنِي.[1](اے علی، جو مجھ سے جدا ہوا، وہ اللہ سے جدا ہوا اور اے علی، جو تجھ سے جدا ہوا، وہ مجھ سے جدا ہوا۔)

اس حدیث کو امام احمدؒ نے بھی فضائل الصحابہ میں روایت کیا ہے، ہیثمی نے اسے بزار کے حوالے سے نقل کر کے کہا ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں، حاکم نے اپنی **المستدرک** میں کہا ہے حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه. ، البتہ یہاں ذہبی نے حاکم سے اتفاق نہیں کیا، جس پر آگے بات کرتے ہیں۔

اسی حدیث کے لفظ دوسری روایت میں آتے ہیں: من أطاعني فقد أطاع الله، ومن عصاني فقد عصى الله، ومن أطاع عليا فقد أطاعني، ومن عصى عليا فقد عصاني.[2] حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی ان کی

---

۱- نفس مرجع، باب مناقب علي بن أبي طالب، باب حالته في الآخرة، رقم:۱۴۷۷۔

۲- **المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة الخ، وأما قصة اعتزال محمد بن مسلمة الخ، رقم:۴۶۱۷۔

موافقت کی ہے۔[1] گویا من فارق عليا فقد فارقني والے لفظوں پر تو ذہبی کو اشکال ہے من عصا عليا فقد عصاني کے مضمون پر ذہبی کو بھی کوئی اشکال نہیں۔

قدیم علمانے یا تو اس حدیث کو صحیح کہا ہے یا اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔ پرانے علما میں صرف ذہبی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اس حدیث کی پہلی روایت کو "منکر" کہا ہے، جب کہ اسی حدیث کو، جو دوسرے لفظوں سے ہے، کو ذہبی نے بھی صحیح تسلیم کیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہبی کی اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ انھیں پہلی روایت کے لفظوں کے ساتھ اس حدیث کا مضمون عجیب سا لگا ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ محدثین جہاں راوی کے ضعف کی وجہ سے حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، وہیں بعض اوقات کسی راوی کو اس وجہ سے ضعیف قرار دیتے ہیں کہ اس نے فلاں عجیب وغریب حدیث روایت کی ہے، لیکن یہ بات تب قابلِ قبول ہوتی ہے جب کہ یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ یہ مضمون شریعت کے عمومی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا، اگر حدیث کی ایسی بے تکلف تشریح ہو جائے جس کے مطابق وہ معنی درست ہو تو یہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں اس حدیث کی سند پر کوئی بڑا اعتراض موجود نہیں ہے[2] اور معنی بھی درست ہے۔ اس طرح کی بات پر حیرت کی

---

۱۔ نفسِ مرجع۔

۲۔ امام بخاری نے **التاريخ الكبير** اور ابن ابی حاتم نے **الجرح والتعديل** میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اور کوئی تبصرہ نہیں کیا، دیگر کئی حضرات نے بھی ایسا ہی کیا ہے، مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی نے **الإصابة** میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔ عبد الرؤوف مناوی نے **فيض القدير** میں اسے ذکر کر کے ہیثمی کا رجاله ثقات والا تبصرہ نقل کیا ہے۔ عموماً قدیم علمانے یا تو اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے یا اسے ذکر کر کے خاموشی اختیار کی ہے۔ ذہبی کے حکم کی جب تک دلیل سامنے نہ آجائے اسے قبول نہیں کیا

جاسکتا۔ یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ ذہبی کو دراصل خاص لفظ والی روایت پر کلام ہے، یعنی وہ کسی راوی کی بات ہی نہیں کرنا چاہ رہے، لیکن البانی اس کھوج میں لگے ہیں کہ ذہبی نے کون سے راوی کی وجہ سے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے۔ البانی نے پہلے یہ کہا ہے کہ اس سند میں کوئی ایسا راوی نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث کو ضعیف کہا جاسکے، سوائے معاویہ بن ثعلبہ کے (جو ابوذر غفاریؓ سے روایت کررہے ہیں)، پھر کہا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کے ضعیف ہونے کی وجہ داود بن ابی عوف ابو الجحاف ہوں جو معاویۃ بن ثعلبہ سے روایت کررہے ہیں، لیکن البانی کی دونوں باتیں ناقابل قبول ہیں۔ جہاں تک معاویہ بن ثعلبہ کا تعلق ہے تو یہ اجل تابعین میں سے ہیں، جس کی ایک دلیل ان کا حضرت ابوذرؓ سے روایت کرنا ہے، حالاں کہ حضرت ابوذرؓ کا انتقال عہد عثمانی میں ہوا ہے۔ یہ اتنے قدیم تابعی ہیں کہ بعض کو ان کے صحابی ہونے کا اشتباہ ہو گیا ہے، جب کہ ابو الجحاف پر صرف تشیع کا الزام ہے، اور یہ اتنا بڑا الزام نہیں ہے۔ اس دور کا تشیع ویسے بھی بعد کے تشیع سے بہت مختلف تھا۔ دوسرے اصول یہ ہے کہ اہل بدعت کے بارے میں یہ خطرہ نہ ہو کہ اس نے اپنے مذہب کی حمایت میں جھوٹ بولا ہوگا تو اس کی روایت قابلِ قبول ہوتی ہے؛ چناں چہ اکثر محدثین نے ان کے تشیع کے باوجود ان کی توثیق کی ہے۔ امام احمد اور یحیٰ بن معین نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے صالح الحدیث۔ نسائی نے کہا ہے لیس به بأس۔ خود ذہبی نے "من تُكلِّم فيه وهو موثق" میں ذکر کیا ہے، یعنی ایسے راوی جن پر اگرچہ کلام کی گئی ہے، لیکن ان کی روایت قابل قبول ہے۔ سفیان خود جلیل القدر امام بھی ہیں اور ابو الجحاف کے شاگرد بھی ہیں، وہ انھیں زیادہ جانتے ہوں گے، اس لیے ان کی رائے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کان یوثقه ویعظمه، یعنی سفیان انھیں قابلِ اعتماد اور عظیم شخص قرار دیتے تھے۔ اسی طرح انھوں کہا وکان مَرْضیا، یہ پسندیدہ آدمی تھے۔ ان حضرات بالخصوص سفیان کی رائے کے مقابلے میں بعض متاخرین جیسے ابن عدی وغیرہ کی جرح مبہم (بغیر وجہ ذکر کیے) قابل قبول نہیں ہے، اس لیے اس حدیث کو بہت زیادہ بھی نیچے لایا جائے تو بھی حسن سے کم کسی صورت نہیں ہے، ذہبی کو بھی سند کے کسی راوی پر اشکال نہیں بلکہ انہیں حدیث کے لفظ عجیب لگ رہے ہیں (اس لیے البانی کی یہ بحث کہ ذہبی نے کس راوی کی وجہ سے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے، غیر متعلق ہے)۔

ضرورت نہیں ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہبی کو من فارقک فارقني کے لفظوں پر اعتراض ہے، لیکن اگر مفارقت کو معصیت کے معنی پر محمول کر لیا جائے یعنی علی کی نہ ماننا رسول اللہ ﷺ کی نہ ماننا ہے، خاص طور پر ان کے دورِ حکومت تو اس معنی پر ذہبی کو بھی کوئی اشکال نہیں لگتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ومن يطع الأمير فقد أطاعني ومن يعص الأمير فقد عصاني، اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امیر کی اطاعت مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے برابر اور اس کی نافرمانی آپ ﷺ کی نافرمانی کے برابر ہو گئی ہے۔ اگر یہ حدیث کہ میرے بعد ابو بکر و عمر کی اقتدا کرو، درست ہو سکتی ہے تو اس مضمون پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کہ میرے بعد علی کی مان کر چلنا۔ بہر کیف یہ حدیث اول تو صحیح ہے، وگرنہ حسن تو بہر حال ہے۔ من فارقک والے لفظ نظر انداز بھی کر دیں تب بھی من عصا عليا والے لفظ تو بہر حال ثابت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کی مان کر چلنے کی ترغیب رسول اللہ ﷺ دے کر گئے ہیں۔

پہلے یہ بات کہی گئی تھی کہ علی کو ہدایت کی نشانی قرار دیا گیا ہے اور اسی کے تسلسل میں یہ روایات ہیں کہ حق، علیؓ کے ساتھ ہے۔ وہ ایک الگ بحث ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج کیا، ان کا کیا مرتبہ ہو گا؟ اس کی تاویل و توجیہ اور ان کی غلط فہمی اور ان کی طرف سے عذر اور اجتہاد کیا تھا؟ وہ ایک الگ سوال ہے۔ اس پر اس طرح سے بات کرنا کہ ان کا مقام و مرتبہ بھی محفوظ رہ جائے، وہ ایک الگ بحث ہے۔ باتوں کو خلط نہیں کرنا چاہیے۔ کسی عمل کا بذاتِ خود کوئی حکم ہونا اور بات ہے اور کسی متعین شخص پر حکم لگانا اور

بات ہے۔ شراب پینا سخت گناہ ہے، لیکن کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ یہ شراب ہے، اس پر یہ حکم لاگو نہیں ہو گا۔ رمضان کا روزہ چھوڑنا سنگین گناہ ہے، بذاتِ خود اس پر وعیدیں ہیں، لیکن کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ چاند نظر آگیا ہے اور رمضان شروع ہو گیا ہے، اس پر یہ وعیدیں صادق نہیں آئیں گی۔ یعنی بعض اوقات کسی چیز کا جو نفسِ حکم ہوتا ہے وہ کسی عذر کی وجہ سے بعض اوقات کسی شخص پر لاگو نہیں ہوتا۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر صرف یہ دیکھنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علیؓ کو کس انداز سے حق و صداقت کی نشانی بنا کر پیش کر رہے ہیں؟

### ۷- اے اللہ حق اس کے ساتھ گھمادے

ایک اور حدیث ہے جو **مشكوة المصابيح** میں بھی ترمذی کے حوالے سے ہے، لیکن کافی ضعیف ہے اور وہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے لیے دعا کی کہ

> رَحِمَ اللهُ أَبَا بَكْرٍ زَوَّجَنِيَ ابْنَتَهُ، وَحَمَلَنِي إِلَى دَارِ الهِجْرَةِ، وَأَعْتَقَ بِلاَلاً مِنْ مَالِهِ، رَحِمَ اللهُ عُمَرَ، يَقُولُ الحَقَّ وَإِنْ كَانَ مُرًّا، تَرَكَهُ الحَقُّ وَمَا لَهُ صَدِيقٌ، رَحِمَ اللهُ عُثْمَانَ، تَسْتَحْيِيهِ المَلاَئِكَةُ، رَحِمَ اللهُ عَلِيًّا، اللَّهُمَّ أَدِرِ الحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ..[1]

---

۱ - ابو عیسی محمد بن عیسی الترمذی، **سنن الترمذي**، ت، بشار عواد معروف، أبواب المناقب، باب مناقب علي بن أبي طالب، رقم:۳۷۱۴۔ امام ترمذی اس کے بارے میں کہتے ہیں: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ، لاَ نَعْرِفُهُ إِلاَّ مِنْ هَذَا الوَجْهِ.

اللہ ابو بکر پر رحم کرے، انھوں نے مجھے اپنی بیٹی نکاح میں دی ،مجھے دار ہجرت لے گئے اور بلال کو اپنے مال سے آزاد کیا۔ اللہ عمر پر رحم کرے کہ وہ حق بات کہتا ہے چاہے کڑوی ہو۔ ان کے حق بات کہنے نے انھیں اس حال میں چھوڑا کہ ان کا کوئی دوست نہیں رہا۔ اللہ عثمان پر رحم کرے کہ اس سے ملائکہ بھی حیا کرتے ہیں۔ اللہ علی پر رحم کرے۔ اے اللہ حق کو اسی طرف پھیر دے، جس طرف وہ پھرے۔)اس حدیث کی سند خاصی ضعیف ہے۔

## ۸- علی ہادی ہے

قرآنِ کریم میں سورۂ رعد میں ایک آیت ہے: إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ.[۱](آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک ہادی ہوتا ہے۔)اس آیت میں کسی متعین شخصیت کی بات نہیں ہو رہی، یہ ایک عمومی ضابطے کا بیان ہے کہ اللہ نے ہر قوم کے لیے ایک ہادی بنایا ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ آیت بعض اوقات عام ہوتی ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ یا صحابہ اس کے مصداق کے طور پر چند لوگوں کو ذکر کر دیتے ہیں، لیکن مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آیت اس میں منحصر ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی ایک حدیث ہے۔ سعید بن جبیر، حضرت ابنِ عباس سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أنا المنذر و علي الهادي.[۲](میں منذر ہوں اور علی ہادی ہیں۔) یہاں ہادی کا لفظ عام ہے۔ اس سے مراد

---

۱ - الرعد ۱۳:۷۔

۲ - یہ حدیث سورۂ رعد کی مذکورہ تفسیر میں کئی کتبِ تفسیر میں آئی ہے جیسے **تفسیر الطبري**،**تفسیر ابن کثیر**،ابنِ جُزَیّ کی تفسیر **التسهيل لعلوم التنزيل**، تفسیر **روح المعاني** وغیرہ۔

حضرت علی نہیں ہیں، گذشتہ امتوں میں بھی جو ہادی آئے ہیں، وہ بھی اس میں شامل ہیں، آج بھی جو لوگ انسانیت کے لیے ہدایت کا ذریعہ بن رہے ہیں، اس میں شامل ہیں، لیکن حضرت علی کے بارے میں اگر یہ کہا اور انھوں اس کے مصداق کے طور پر ذکر کیا تو اس سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاص اوصاف میں سے ہے۔ اس کی سند پر کچھ کلام ہے، لیکن بحیثیت مجموعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن سے کم نہیں ہے۔ میں نے حدیث کے سافٹ ویئر جوامع الکلم میں اسے دیکھا جس سے اندازہ ہوا کہ کل تیرہ سندوں کے ساتھ یہ حدیث منقول ہے جن میں سے دس ضعیف ہیں اور تین حسن ہیں۔

اس ساری بحث سے حضرت علیؓ کے اوصاف میں ان کا ہادی ہونا اور حق کی نشانی ہونا بہت بڑی خصوصیت ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس سے آپ خلفاے ثلاثہؓ کی خلافت بھی ثابت کر سکتے ہیں اور حضرت علیؓ کی خلافت کو بھی۔ حضرت علیؓ کے حق کی نشانی ہونے کے مقدمے کو سنی بھی مانتا ہے اور شیعہ بھی مانتا ہے۔ اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ جو حق کی نشانیاں ہیں، انھیں علیؓ نے بھی مانا، اس لیے علیؓ کی اس معاملے میں اتباع ضروری ہے۔ معتدل اہلِ سنت تو مکمل طور پر علیؓ کے ساتھ ہیں۔ بہر حال یہ ان ساری احادیث کا لبِ لباب ہے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا یہ ساری حدیثیں اپنے معنی اور مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کر رہی ہیں۔

### ۹- حدیث غدیر سے حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ کی تائید

ایک حدیث حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی پہلے نقل کی گئی حدیث علي مع القرآن کے سلسلے میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور حدیث ملا کر دیکھی جا سکتی ہے اور وہ بڑی مشہور حدیث ہے جسے ”حدیثِ غدیر“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسے مستقل موضوع بنا کر بات

کرنے کی ضرورت ہے، لیکن یہاں تھوڑاسا اشارہ کروں گا۔ امید ہے اشارے سے بات واضح ہو جائے گی، کیوں کہ خصوصیت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں بھی حدیثیں موجود ہیں، ان کی طرف ہم نے آنا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر غدیرِ خُم جگہ پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں دو تین باتیں ارشاد فرمائیں۔ مثلاً ایک بات یہ ارشاد فرمائی: من كنت مولاه فعلي مولاه.[1] (جس کے لیے میں مرکزِ محبت ہوں (یہ اسمِ ظرف ہے۔)، علی بھی اس کے لیے محبت کا مرکز ہے۔)

ولاء محض محبت کو نہیں کہتے بلکہ یہ محبت سے ذرا آگے کی چیز ہے، یعنی کسی کی پارٹی کا حصہ ہونا اور اہلِ سنت والجماعت کی ایک ہی پارٹی ہے، جدھر علی، ادھر سنی۔

حدیثِ غدیر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اور باتیں بھی ارشاد فرمائیں۔ یہ فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جارہاہوں۔ اگر تم انھیں تھامے رکھو گے تو کبھی گم راہ نہیں ہو گے: ایک کتاب اللہ ہے اور ایک میری عترت میرے اہلِ بیت ہیں۔ یہ حدیث متعدد صحابہ

---

۱ - حدیثِ غدیر کئی کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ مولانا محمود اشرف عثمانی اس کی سند کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''راجح قول کے مطابق حدیث صحیح ہے اور متعدد طرق سے مروی ہے جن میں سے بعض اسانید اصطلاحاً ''صحیح'' اور بعض ''حسن'' کے درجے کی ہیں اور متعدد طریق سے مروی ہونے کی بنا پر یہ حدیث مشہور کے زمرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ ''(محمود اشرف عثمانی، **عقیدۂ امامت اور حدیثِ غدیر** (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۶ء)، ۴۷۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ خطبۂ غدیر کے دو حصے ہیں جنھیں ''حدیثِ ثقلین'' اور ''حدیثِ موالات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں بعض جگہ اکٹھے اور بعض جگہ الگ الگ آتے ہیں اور دونوں محدثانہ نقطۂ نظر کے مطابق ثابت ہیں۔

سے منقول ہے اور صحیح حدیث ہے بلکہ متعدد حضرات نے اسے متواتر یا حدیثِ مشہور بھی قرار دیا ہے۔

**صحیح مسلم** میں خطبۂ غدیر کا ذکر ہے، لیکن اس میں وہ الفاظ (الفاظِ موالات) موجود نہیں ہیں، جو اوپر ذکر ہوئے، البتہ اس میں یہ الفاظ آتے ہیں:

أَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ: أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللهِ فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ فَخُذُوا بِكِتَابِ اللهِ، وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ " فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللهِ وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: «وَأَهْلُ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي» فَقَالَ لَهُ حُصَيْنٌ: وَمَنْ أَهْلُ بَيْتِهِ؟ يَا زَيْدُ أَلَيْسَ نِسَاؤُهُ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ؟ قَالَ: نِسَاؤُهُ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، وَلَكِنْ أَهْلُ بَيْتِهِ مَنْ حُرِمَ الصَّدَقَةَ بَعْدَهُ، قَالَ: وَمَنْ هُمْ؟ قَالَ: هُمْ آلُ عَلِيٍّ وَآلُ عَقِيلٍ، وَآلُ جَعْفَرٍ، وَآلُ عَبَّاسٍ قَالَ: كُلُّ هَؤُلَاءِ حُرِمَ الصَّدَقَةَ؟ قَالَ: نَعَمْ.[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس خطبے میں فرمایا میں تمھارے اندر دو وزنی چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ان میں سے پہلی کتاب اللہ ہے، جس میں نور اور ہدایت ہے۔ لہذا کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو، پھر آپ نے اسی کی تفصیل کرتے ہوئے کتاب اللہ کی ترغیب پر گفت گو فرمائی۔ پھر فرمایا میرے اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کی یاد دہانی کراتا ہوں، میں تمھیں اپنے اہل بیت کے بارے میں

---

[1] - **صحیح مسلم**، كتاب فضائل الصحابة رضي الله تعالى عنهم، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه، رقم: ۲۴۰۸۔

اللہ کی یاد دہانی کراتا ہوں، میں تمھیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دہانی کراتا ہوں۔ اس پر حصین بن سبرہ نے حضرت زید بن ارقمؓ سے پوچھا، آپ ﷺ کے اہل بیت کون ہیں، کیا آپ کی بیویاں اہل بیت میں داخل نہیں؟ حضرت زید بن ارقمؓ نے فرمایا (ویسے تو) آپ کی بیویاں بھی آپ کے اہل بیت میں شامل ہیں (لیکن یہاں اس خطاب میں اہل بیت سے مراد کچھ اور ہیں) اہل بیت وہ ہیں جنھیں زکوۃ سے محروم رکھا گیا ہے۔ حصین نے پوچھا وہ کون ہیں آپ نے فرمایا علی، عقیل، جعفر اور عباس کی اولاد ہیں۔ انھوں نے کہا کیا ان سب پر صدقہ حرام کیا گیا ہے؟ فرمایا جی ہاں!

## حدیثِ غدیر کا انکار درست نہیں

اس حدیث پر آج کل بعض لوگوں کی طرف سے بڑی بحث کی گئی ہے۔ قریب زمانے کے بعض سنی علمانے اس پر اس انداز سے بحث کی ہے کہ محدثانہ اعتبار سے وہ مناسب بحث نہیں ہے؛ گویا ایک طرح سے حدیث کے انکار کی کوشش ہے۔ ان کا مقصد درست ہے۔ وہ درحقیقت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہلِ تشیع کا اس حدیث سے امامت ثابت کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات تو واقعی ٹھیک ہے کہ اس حدیث سے واقعتاً اس طرح کی امامت ثابت نہیں ہوتی، لیکن اس کے لیے اس حدیث کا انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ میرے اہلِ بیت کو لازم پکڑو۔ اب اہلِ بیت کون ہیں؟ اہلِ بیت کے مختلف مفہوم آپ لے سکتے ہیں لیکن جو بھی مفہوم لیں اس سے بارہ ائمہ کی مزعومہ امامت ثابت نہیں ہوتی۔ ردِ تشیع اس وقت میرا موضوع نہیں، لیکن اجمالاً بات کر رہا ہوں۔

## حدیثِ غدیر سے شیعہ کا نظریۂ امامت ثابت نہیں ہوتا

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے **صحیح مسلم** کی روایت میں تھوڑی سی وضاحت کی ہے، لیکن اس کی تفصیل کو ترک کیا جاتا ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ زید بن ارقم کے نزدیک

اہل بیت سے مراد رسول اللہ ﷺ کا عشیرہ اور قبیلہ ہے جس کے افراد پر زکوۃ لینا حرام ہے، یعنی بنوہاشم کے کچھ خان دان۔ اس کی مزید وضاحت یا تخصیص کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس سے آپ کے عشیرہ کے وہ افراد مراد ہیں جو اُس دور میں موجود تھے یا بعد کے بہت قریب دور میں تھے، اس لیے کہ مقصدِ حدیث رسول اللہ ﷺ کے بعد کے کچھ عرصہ میں اہلِ بیت کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اس سے منع کرنا تھا۔ اس لیے ان خان دانوں کے قیامت تک کے لوگ مراد نہیں ہیں۔ چونکہ اہل بیت کے ساتھ لفظ عترت یعنی نسل اور اولاد کا آتا ہے اس لیے اس کا دائرہ مزید محدود کرکے کہہ سکتے ہیں وہ اہلِ کساء ہیں، یعنی جن کو چادر میں لے کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا۔ یعنی حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم۔ خواہ یہاں آپ کا عشیرہ مراد لیں یا آپ کی عترت، اس میں دو احتمال ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ عہدِ رسالت میں موجود حضرات کی بات ہورہی ہے یا قیامت تک ان کی نسل کے لوگوں کی۔ اگر پہلا مفہوم مراد لیں تو پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی امام ہونا چاہیے۔ علی بھی امام ہیں اور علی کے زمانے میں حضرت حسن، حسین کو بھی امام ہونا چاہیے اگر اس سے امامت ثابت ہورہی ہے۔ اس تشریح کے مطابق سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس میں علی و حسنین، تین افراد کی امامتیں تو ثابت ہوئیں، لیکن باقی نو کی امامتیں کہاں گئیں؟ اگر اس سے مراد قیامت تک رسول اللہ ﷺ کی نسل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی آپ کی نسل سے ہے، اسے معصوم مان لیا جائے، حالاں کہ یہ بات بداہتاً غلط ہے۔ اس لیے حدیث کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ امام جعفر صادق مثلا ان کے ہاں امام ہیں، ان کے زمانے میں ان کے بھائی بھی موجود تھے، ان کے عم زاد بھی موجود تھے۔ وہ بھی عترتي اور أهل بيتي کے مفہوم میں آتے ہیں۔ وہ امام کیوں نہیں ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا

کہ امامت آپ کہیں اور سے ثابت کر رہے ہیں اور نام اس حدیث کا لے رہے ہیں۔ بہر حال اس حدیث کا بارہ اماموں کے تصور کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا، اس لیے اہلِ تشیع کا رد کرنے کے لیے اس حدیث کا انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

## حدیثِ غدیر کے حوالے سے ایک اشکال اور اس کا ازالہ

اس حدیث پر ایک اشکال اِس دور کے بعض علما کو ہوا ہے (یہ اشکال پہلے نہیں ہوا۔)، وہ یہ کہ اس حدیث میں لفظ 'تمسک' آیا ہے۔ اگر اہلِ بیت کے لیے بھی 'تمسک' مان لیا جائے تو پھر اس کا مطلب ہے وہ بھی شریعت میں حجت ہیں اور یہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی کو حجت ماننے والی بات ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کا ذکر قرآن میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ سوال ہمارے بعض مناظر علما نے اٹھایا ہے؛ تاہم میں یہاں توجہ ایک اور حدیث کی طرف دلاؤں گا اور وہ حدیث بھی صحیح ہے۔ حدیث غدیر کی طرح **صحیح مسلم** میں تو نہیں ہے، لیکن باقی کتابوں مثلاً ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ وہ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا جس سے دلوں میں خوف پیدا ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ، یہ تو لگ رہا ہے کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، تو اب ہم نے کیا کرنا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر کچھ باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک بات یہ تھی:عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين. تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ.اگر تمسک کے ساتھ 'علیکم' اور 'عضوا عليها بالنواجذ' کے دو تاکیدی الفاظ خلفاے راشدین کے بارے میں بولے جا رہے ہیں، جو کہ غیر نبی ہیں تو اگر وہاں اشکال نہیں ہے تو یہاں کیوں اشکال ہے؟ اگر وہ بات

قرآن میں ہونا ضروری تھی تو یہ بات بھی قرآن میں ہونی چاہیے۔ اصل میں یہ دونوں باتیں رسول اللہ ﷺ نے اہلِ بیت اور خلفاے راشدین کے لیے بطور مصادرِ شریعت بیان ہی نہیں کی ہیں۔ خلفاے راشدین حجت ہیں، اس لیے کہ وہ کبار فقہاے صحابہ میں سے ہیں، ورنہ فقہِ حنفی میں کئی ایسے فیصلے موجود ہیں، جن میں خلفاے راشدین کے قضایا موجود ہیں، لیکن حنفیہ نے اختیار نہیں کیے اور ترجیح کسی اور کو دی ہے۔ وہ خلفاے راشدین کے فیصلوں کو باقی دلیلوں کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں، صرف اسی کو لے کر باقی دلائل کو نظر انداز کر دیں، ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ممتدۃ الطہر ہے، یعنی وہ عورت جو ہے تو بالغ لیکن اس عمر کو نہیں پہنچی جس میں مخصوص ایام آنا بند ہو جاتے ہیں۔ درمیانی عمر میں ماہواری آنے کا سلسلہ رک گیا۔ اگر ماہواری آ رہی ہوتی تو اس کی عدت ماہواری کے حساب سے ہوتی، اب اس کی عدت کیسے گزرے گی۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ موجود ہے کہ وہ نو مہینے گزارے گی، اگر اس دوران میں اس کا حمل واضح ہو جائے تو بچے کی ولادت سے اس کی عدت ختم ہو گی، اگر نو مہینے میں حمل واضح نہ ہو تو تین مہینے مزید گزار لے گی تو اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔ جب کہ حنفیہ کہتے ہیں کہ جب تک وہ سنِ ایاس (ماہواری بند ہونے کی عمر) تک نہیں پہنچتی، مثلاً پچیس سال کی عمر میں حیض رک جائے اور طلاق بھی ہو جائے، تو اسے سنِ ایاس تک جانا ہو گا، پھر تین مہینے کی عدت گزارے گی۔ اگرچہ بعد کے حنفیہ نے اس میں مالکیہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ مالکیہ کا قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مطابق ہے، لیکن حنفیہ نے یہ کہا ہے کہ قرآن میں چوں کہ دو ہی عدتیں ہیں: یا تو ثلثة قروء ہے یا ثلثة أشهر ہے جو حیض سے ناامید ہو جانے والیوں کی عدت ہے، اس لیے ان دو کے علاوہ کوئی اور عدت نہیں ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں رسول اللہ ﷺ کے بعد آنے والے واقعات کے حوالے سے ہیں۔ یایوں کہہ لیجیے کہ سیاسی معاملات کے حوالے سے ہیں۔ سیاسی حوالے سے خلفاے راشدین کی ایک خاص نوعیت کی حجیت ہے، اس لیے کہ ان کی خلافتوں کے ذریعے متعدد مقاصدِ نبوت کی تکمیل مقصود تھی؛ چناں چہ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں: فقلنا يا رسول الله وعظتَنا موعظةَ مودع فما ذا تعهد إلينا؟قال: أوصيكم بتقوى الله. لقد تركتم على البيضاء. ليلُها كنهارها لايزيغ عنها بعد ومن يعش منكم بعدي فسيرى اختلافا كثيرا [1] اور رسول اللہ ﷺ کے بعد کے اختلافات اعتقادی نہیں تھے، فلاں جبری ہے، فلاں قدری۔ یہ اعتقادی اختلافات تو بہت بعد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دور کے اختلافات جن کے اثرات اب تک برقرار ہیں سیاسی نوعیت کے تھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ میرے بعد جسے زندگی ملی وہ کئی اختلافات دیکھے گا، ان اختلافات میں معیار کیا ہو گا، آپ نے فرمایا:

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم و محدثات الأمور، وإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة وأوصيكم بالسمع والطاعة وإن أمر عليكم عبد حبشي. [2]

---

۱-حوالہ آگے آرہا ہے۔

۲ - صہیب عبد الجبار کی کتاب **الجامع الصحيح للسنن والمسانيد** (۱:۳۴۹) میں اس حدیث کا جامع متن دیکھا جاسکتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو: وہی مصنف، **المسند الموضوعي الجامع للكتب العشرة**، ۱:۲۷۴۔

اس حدیث کا پورا سیاق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سیاسی پہلو زیادہ اہم ہے کہ خلفاے راشدین کو لازم پکڑنا اور صرف ان کے زمانے میں ہی نہیں، بلکہ بعد میں بھی اور اگر اچھی حکم رانی کرنی ہے تو تمھارے سامنے نمونہ خلفاے راشدین ہیں۔ اسی طرح ان اختلافات کے بارے میں بھی جب بھی رائے قائم کرنی ہو خلفاے راشدین کے طریقے کو مد نظر رکھو۔ حضرت علی بھی خلیفہ راشد ہیں؛ اس لیے ان کی سنت بھی حجت اور اس کے لزوم کا حکم ہے، فقہ کے بعض ابواب میں فقہانے حضرت علی کو خصوصی طور پر اسوہ قرار دیا ہے۔

### حدیثِ غدیر سے مستفاد دو امور

خیر! ضمناً یہ بات واضح کرنا مقصود تھی کہ حدیث غدیر میں 'تمسک' کا لفظ کوئی اتنا بڑا سوال نہیں ہے، لیکن اس سے ہٹ کر دو باتیں حدیثِ غدیر سے واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں، جن سے اہل سنت میں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ایک یہ کہ اگر تمسک سے لازم پکڑنے کا معنٰی لیں، تو تمام اہلِ بیت (قیامت تک رسول اللہ ﷺ کی اولاد) مراد نہیں ہیں، بلکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو موجود تھے، وہ مراد ہیں، یعنی اہلِ کساء۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ گویا یہ کہ رہے ہیں کہ جدھر یہ ہوں، تم نے ادھر رہنا ہے۔ کئی احادیث میں پہلے بیان کر چکا ہوں، جن سے یہ واضح ہے کہ خاندانِ رسول ہدایت کی علامت ہے اور حدیثِ غدیر سے بھی یہی بات نکل رہی ہے کہ یہ شخصیات ہیں، جنھیں لازم پکڑو۔ ان کے بارے میں گویا یہ ضمانت ہے کہ یہ غلطی پر نہیں ہوں گے۔ اختلافات میں یہ بھی ایک نشان تھا۔ اگر یہ بات کہ اختلافات میں خلفاے راشدین کو حق کی نشانی کہا جا سکتا ہے اور اس سے نہ ختمِ نبوت پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ قرآن میں نہ ہونے کا اشکال

ہو تا ہے، تو وہی بات بعینہ اگر ان چند شخصیات کے بارے میں کہ دی جائے کہ ان سے تمسک کرو، یہ قرآن سے الگ نہیں ہوں گے تو اس پر بھی کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں اہلِ بیت کے حقوق کا بیان ہے۔ اس حدیث میں ان حقوق کی نزاکت کو بیان کیا گیا ہے۔ أذكّركم الله في أهل بيتي، أذكركم الله في أهل بيتي ، أذكركم الله في أهل بيتي .بہت تاکید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ بار بار کہ رہے ہیں کہ میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں، اللہ کا خوف دلاتا ہوں۔ تو کیا یہ ان کے حقوق کا خیال رکھنا شمار کیا جائے گا کہ وہ جس وقت اپنے آپ کو بطور خلیفہ پیش کر رہے ہیں (جو انھوں نے ابو بکر، عمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں نہیں کیا، بلکہ جب لوگوں نے خود بطور خلیفہ بیعت کی اور بیعت ہو گئی اور اس کے بعد اپنے آپ کو بطور خلفیہ پیش کیا[1])، تو اس وقت بھی آپ ان کا ساتھ دینے اور اطاعت کو ایک امرِ مطلوب سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوں تو کیا یہ أذكركم الله في أهل بيتي پر عمل بنتا ہے؟

اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ دورِ صدیقی، دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں کہیں نہیں ملتا کہ حضرت علیؓ نے اس حدیث کا کسی بھی سیاق میں حوالہ دیا ہو یا بطور دلیل پیش کیا ہو، البتہ خود اپنے دورِ خلافت میں حضرت علیؓ نے اس حدیث کی طرف توجہ دلائی اور اس پر

---

۱- آگے آئے گا کہ امام احمد نے حضرت علی کی خلافت کی حقانیت پر اس بات کو اہم دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ پہلوں کی اطاعت کی اور اب خود کو خلیفہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں (عہد علوی کے داخلی قتال کے عنوان سے ذرا پہلے امام احمد کی یہ بات آرہی ہے)۔ یہی بات بہت تفصیل سے حضرت علیؓ نے بصرہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرمائی، جس کا ذکر داخلی قتال کی بحث کے آخر میں آئے گا۔

بعد میں مسلمان ہونے والوں کے سامنے شہادتیں پیش کیں۔ ابو الطفیل، جو سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں وہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے لوگوں کو کوفے کے میدان میں جمع کیا اور اللہ کا واسطہ دے کر فرمایا کہ تم میں سے جس نے غدیر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہو کہ میں جس کا مولی ہوں علی بھی اس کا مولی ہے وہ کھڑا ہو جائے، چناں چہ اس مجلس میں تیس صحابہ نے کھڑے ہو کر اس بات کی گواہی دی۔[1] اس طرح کا واقعہ متعدد حضرات حضرت علیؓ سے روایت کر رہے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے۔ **مسند أحمد** کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے بارہ بدری صحابہ نے گواہی دی کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے ارشاد خود سنا ہے۔[2] علامہ ہیثمی نے یہ روایت **مسند أحمد** ہی کے حوالے سے نقل کر کے کہا ہے: رجاله ثقات.[3] زید بن یثیع کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت علیؓ پر بعض لوگوں کے کچھ اعتراض کیے تو اس موقع پر بھی حضرت علی نے ممبر پر لوگوں سے اس حدیث کے بارے میں شہادت لی۔[4] حضرت علیؓ اپنے دورِ خلافت میں خود پر ہونے والے اعتراضات کے سیاق میں اور اپنی حمایت میں یعنی اپنی صحت کی دلیل کے طور پر اس حدیث کو پیش کر رہے، جب

---

۱- احمد بن حنبل، **فضائل الصحابة** (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۹۸۳ء) ۲: ۶۸۲، رقم: ۱۱۶۷۔

۲- **مسند أحمد**، رقم: ۶۷۰۔

۳- ہیثمی، **مجمع الزوائد**، کتاب المناقب، باب قوله من كنت مولاه الخ، رقم: ۱۴۶۲۴۔

۴- ابن ابی شیبہ، **الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار**، كتاب الفضائل، فضائل علي بن أب طالب رضي الله عنه، رقم: ۳۲۰۹۱۔

کہ پچھلے ادوار میں وہ اس انداز سے یہ حدیث پیش کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بات کہاں منطبق ہوتی ہے اور کہاں منطبق نہیں ہوتی۔ اہلِ تشیع کا دعوی ہے کہ وفاتِ نبوی کے فوراً بعد اس حدیث کے خلاف عمل شروع ہو گیا تھا، لیکن خود حضرت علیؓ کا طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ اہل تشیع کا یہ دعوی غلط ہے۔ دوسری طرف بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اگر یہ حدیث ماننی بھی پڑے تو گھما پھرا کر اسے ایسا الجھا دیا جائے کہ حدیث کے صرف لفظ رہ جائیں، اس کا کوئی عملی تقاضا، کوئی مصداق اور کسی امرِ واقعہ پر انطباق کی کوئی شکل باقی نہیں نہ رہے، جب کہ حضرت علیؓ کا انداز بتا رہا ہے کہ اس حدیث سے پہلے تین خلفا کی خلافت کی نفی کرنا جس طرح غلط ہے، اسی طرح خود حضرت علیؓ کے دور میں ان پر کیے جانے والے اعتراضات کا رد اس حدیث سے کرنا درست ہے اور یہ امر حدیث کے مفہوم میں داخل ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض صحابہ اس وقت حالات کی گرد کی وجہ سے بعض حقیقتوں کا ادراک نہ کر سکے، بعض باتوں کی طرف ان کی توجہ مبذول نہ ہو سکی، اہل السنت والجماعت نے ہمیشہ ان کے لیے التماسِ عذر کا راستہ اختیار کیا ہے کہ ان کا عذر تلاش کر لیا جائے، لیکن یہ عذر اس وقت کے حالات کے ابہام کی وجہ سے تھا، اٹھنے والی گرد کی وجہ سے تھا (جیسا کہ مشاجرات کے عنوان کے تحت مزید وضاحت کریں گے کہ جب واقعات ہو رہے ہیں اس وقت درست نتیجے تک نہ پہنچنے میں آدمی معذور ہوتا ہے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان واقعات کے بعد طویل عرصہ حیات نصیب ہوئی اور ان سے رجوع کی واضح روایات ثابت ہیں۔ اب اس طرح کا کوئی ابہام موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ اس زمانے میں نصرت اور مدد کے مستحق تھے۔ اس حدیث سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علی

رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت تھے، وہ کہتے ہیں میری مدد کرو۔ آپ کہتے ہیں بس علی ویسے ہی کہ رہے تھے ، اس کی خاص ضرورت نہیں تھی، الجھاؤ کا وہ خاص مرحلہ گزرنے کی بعد یہ بات کہنا حدیثِ غدیر وغیرہ کے تقاضوں سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی۔

بات ذرا لمبی ہوگئی، اصل مقصود یہ عرض کرنا تھا کہ پہلے حضرت ام سلمہ کی ایک حدیث گزری ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے:علي مع القرآن والقرآن مع علي لن يتفرقا حتى يردا عليّ الحوض. کہ قرآن اور علی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، اس کی تایید حدیث غدیر سے بھی ہو رہی ہے، اس لیے کہ اس موقع پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ میری عترت اور قرآن ایک ساتھ رہیں گے، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حدیثِ غدیر کا موضوع نہ تو اپنے فوری بعد خلافت یا امامت کا اعلان کرنا ہے کہ یہ مقصود ہوتا تو واضح لفظ اسی سے متعلق ہوتے، نہ ہی مصادرِ شریعت کا بیان یہاں مقصود ہے کہ شریعت کے مسائل کن دلائل سے اخذ کرنے ہیں، اسی لیے حضرت علیؓ نے وضاحت سے یہ فرمادیا کہ ہم بھی انھیں دلائل کے پابند ہیں جن کی باقی امت پابند ہے یعنی قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔ اگر یہاں مصادرِ شریعت کا بیان مقصود ہوتا تو اس کی بہتر جگہ خطبہ حجۃ الوداع تھی۔ خود ان حضرات نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ ہمیں بذاتِ خود مصدرِ شریعت بنایا گیا ہے، بلکہ جب بھی استدلال کیا، عام ادلۂ شرعیہ سے ہی کیا۔ اس حدیث کا اصل مقصود جیسا کہ متعدد علماے اہل السنت نے من كنت مولاه فعلي مولاه سے خلافت بلافصل پر استدلال کے رد میں بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے بعض واقعات پیش آچکے تھے کہ کچھ لوگوں نے خدا واسطے کی مد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں باتیں شروع کر دیں تھی۔ ان باتوں کا سرچشمہ

منافقین ہوں گے، اس لیے کہ بغضِ علی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے، اور منافقین اس دور میں موجود تھے۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ منافقین کی اڑائی ہوئی بات سے سیدھے سادے مخلصین بھی متاثر ہو جاتے ہیں، جیسا کہ واقعہ افک میں ہوا۔ اگر کوئی مخلص صحابی اس طرح کی بات سے متاثر ہوا بھی تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ایک آدھ جملہ فرمانے سے ہی ان کا ذہن درست ہو گیا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ بھی علم یا اندازہ تھا کہ میرے بعد بھی میرے خاندان سے خدا واسطے کے بیر کی یہ بیماری، جسے بعد میں ناصبیت کا نام دیا گیا، موجود رہے گی۔ **صحیح البخاري** میں حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کا ارشاد آتا ہے ارقبوا محمدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم في أهل بيته، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے خانوادے کے بارے میں خود آپ کی ذاتِ مبارکہ کو مد نظر رکھو، غالباً حضرت صدیق اکبرؓ، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس نوعیت کے ارشادات ہی کی طرف متوجہ فرمانا چاہ رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے جو یہ بات ارشاد فرمائی تو اس کی کوئی وجہ محسوس کی ہو گی۔ اب ظاہر ہے جو حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یا ان کے خاندان پر اعتراض کرے گا وہ یہ کہہ کر تو نہیں کرے گا کہ مجھے ان سے کوئی بیر ہے، بلکہ اس کے لیے کوئی خوب صورت عنوان ہی اختیار کرے گا کہ جی یہ تو فلاں فلاں غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کا مقام بہت اونچا سہی ہم ان کی مخالفت ان کی فلاں غلطیوں کی وجہ سے کر رہے ہیں، چناں چہ آں حضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ پر اعتراض یہ کہہ کر کیا گیا کہ انھوں نے خمس کے معاملے میں فلاں غلطی کی ہے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اعتراض کو غلط اور حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کے عمل کو درست قرار دیا۔ تو اس پس منظر میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جہاں اور باتیں ارشاد فرمائیں یہ بھی گارنٹی دی کہ یہ قرآن کے ساتھ رہیں گے، جو انھیں قرآن سے ہٹا ہوا سمجھیں گے یا غلط کار کہیں گے، غلطی ان کی اپنی ہو گی۔ اگر حدیثِ غدیر کا یہ

پس منظر ذہن میں ہو کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی زندگی میں اور اس سے بھی زیادہ اپنے بعد علی اور ان کے خاندان پر اعتراضات ہوتے نظر آرہے تھے تو ایک طرف تو اس سے اہل تشیع کی طرف سے پیدا کی گئی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں دوسرے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں عترت اور اہل بیت سے مراد سارے اہل بیت اور قیامت تک کی ساری نسل نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں آپ ﷺ کو اپنے زمانے اور اس سے اگلے زمانے میں لوگوں کے اعتراضات کے خدشات تھے۔ اس کو سمجھنے کی آسانی کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ مراد عترت کے وہ افراد ہیں جو عہدِ رسالت میں موجود تھے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ یہاں اہلِ کساء کی بات ہو رہی ہے۔ اہل کساء میں خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر اعتراض کر کے ایمان ہی نہیں بچتا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رسول اللہ ﷺ کے فوراً بعد وصال ہو گیا تھا، نیز خاتون کا سیاسی معاملات سے تعلق نہیں ہوتا۔ اب زیادہ تر اعتراضات حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما پر کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی تو اس عظیم قربانی کی ستائش کے بجائے بعض لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بہت سخت سست کہا۔ تو رسول اللہ ﷺ دنیا سے جاتے ہوئے یہ بتا کر گئے ہیں کہ تمھیں کوئی کہے کہ علی، حسن یا حسین نے فلاں قدم غلط اٹھایا ہے تو سمجھ لینا کہنے والے کو غلطی لگی ہو گی، یہ لوگ قرآن سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔

تقریباً ان آٹھ نو احادیث سے بطور قدرِ مشترک یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح متعدد صحابہ کی مختلف خصوصیات بیان کی گئی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اہم صفت آپ کا ہادی ہونا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی تعیین فرمائی تو بعض روایات کے مطابق سب کے بارے میں کچھ مختصر تبصرے بھی فرمائے،

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ اگر انھیں والی بنایا گیا تو لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لے کر چلیں گے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس خاص وصف پر احادیث، اقوالِ صحابہ اور بزرگانِ دین کے اقوال کی روشنی میں مستقل کام ہو سکتا ہے۔

---

۱- عنوان "حضرت علی کے ہادی ہونے کے حوالے سے بعض احادیث" کے تحت شروع شروع میں ایک حاشیے میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے۔ نیز حضرت عمر کے خطبہ کے تحت بھی **فتح الملهم** کا حوالہ گزر چکا ہے

# خلافتِ علی رضی اللہ عنہ سے متعلق احادیث

بعض احادیث ایسی ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی خبر بھی دی ہے اور آپؓ کی شہادت کی بھی۔ اس سلسلے میں بعض احادیث یہاں درج کی جاتی ہیں:

## ۱- حضرت ابو فضالہ کی حدیث

حضرت فُضالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ ان کے بیٹے فضالہ بن ابی فضالہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں اپنے والد کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے گیا۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ سے باہر کسی جگہ ینبوع کے قریب قیام پذیر تھے۔ حضرت ابو فضالہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ یہاں قیام پذیر ہیں، اگر یہاں آپ کا آخری وقت آ گیا تو آپ کا جنازہ کون پڑھے گا؟ مدینے میں آپ کا انتقال ہوا تو وہاں انصار و مہاجرین آپ کا جنازہ پڑھیں گے۔ یہاں آپ بیماری کی حالت میں ہیں، آپ کو مدینہ چلنا چاہیے تا کہ آپ کا انتقال مدینے میں ہو۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: إِنِّي لَسْتُ مَيِّتًا مِنْ مَرَضِي هَذَا – أَوْ مِنْ وَجَعِي هَذَا. (میرا انتقال اس بیماری میں نہیں ہو گا۔) ایک دوسری روایت میں ہے: إن رسول الله عهد إلي أن لا أموت حتى أؤمر. (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ میں تب تک نہیں مروں گا جب تک مجھے امیر یعنی خلیفہ نہ بنا دیا جائے۔) (پھر میرے سر کے

خون سے میری داڑھی رنگین ہو گی۔)[1] اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ بعد میں ابو فضالہ حضرت علیؓ کے ساتھ صفین میں شہید میں ہوئے[2]۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ حضرت ابو

---

[1] - یہ حدیث **مجمع الزوائد** اور **إتحاف الخیرۃ** وغیرہ میں آئی ہے۔ **مجمع الزوائد** کے الفاظ ہیں:
وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ أَبِي فَضَالَةَ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ: خَرَجْتُ مَعَ أَبِي عَائِدًا لِعَلِيٍّ وَكَانَ مَرِيضًا، فَقَالَ لَهُ أَبِي: مَا يُقِيمُكَ بِهَذَا الْمَنْزِلِ لَوْ هَلَكْتَ بِهِ لَمْ يَلِكَ إِلَّا أَعْرَابُ جُهَيْنَةَ، فَلَوْ دَخَلْتَ الْمَدِينَةَ كُنْتَ بَيْنَ أَصْحَابِكَ، فَإِنْ أَصَابَكَ مَا تَخَافُ أَوْ نَخَافُ عَلَيْكَ وَلِيَكَ أَصْحَابُكَ. وَكَانَ أَبُو فَضَالَةَ مِنْ أَهْلِ بَدْرٍ. فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ: إِنِّي لَسْتُ مَيِّتًا مِنْ مَرَضِي هَذَا - أَوْ مِنْ وَجَعِي هَذَا - إِنَّهُ «عَهِدَ إِلَيَّ النَّبِيُّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - إِنِّي لَا أَمُوتُ حَتَّى - أَحْسَبُهُ - قَالَ: أُضْرَبُ أَوْ تُخَضَّبُ هَذِهِ مِنْ هَذِهِ» - يَعْنِي ضَارِبَهُ - فَقُتِلَ أَبُو فَضَالَةَ مَعَهُ بِصِفِّينَ.رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَأَحْمَدُ بِنَحْوِهِ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ.(ہیثمی، **مجمع الزوائد**، باب مناقب علي بن أبي طالب رضي الله عنه، باب وفاته رضي الله عنه، رقم:۱۴۷۷۹۔)، جیسا کہ واضح ہے، علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کی سند کے رجال کو ثقہ قرار دے رہے ہیں، البتہ کتاب الخلافۃ ،باب الخلفاء الأربعۃ میں ہیثمی نے کہا ہے اس میں عبد اللہ بن محمد بن عقیل حسن الحدیث ہیں اور باقی سب راوی ثقہ ہیں۔**إتحاف** کی حدیث بھی اسی معنیٰ میں ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں:إني لست بميت من وجعي هذا إن رسول الله -ﷺ- عهد إلي أن لا أموت حتى أؤمر.(بوصیری، **إتحاف الخیرۃ المھرۃ**،کتاب المناقب، ما جاء في قتله رضي الله عنه، رقم:٦٦٩٦؛ بوصیری نے لکھا ہے کہ اس کی سند پر کلام ہے، لیکن ہیثمیؒ کی روایت اس کی تائید کر رہی ہے۔)

[2] - یہ حدیث **مجمع الزوائد** اور **إتحاف الخیرۃ** وغیرہ میں آئی ہے۔**مجمع الزوائد** کے الفاظ ہیں:
وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ أَبِي فَضَالَةَ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ: خَرَجْتُ مَعَ أَبِي عَائِدًا لِعَلِيٍّ وَكَانَ

فضالہ بدری صحابی ہیں۔[1] یہ اس لیے ذکر کیا کہ بعض شخصیات کو یہ شدید غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے کہ حضرت خزیمۃ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی بدری صحابی صفین میں شریک نہیں ہوا۔ امر واقعہ میں یہ شدید غلط فہمی ہے۔

---

مَرِيضًا، فَقَالَ لَهُ أَبِي: مَا يُقِيمُكَ بِهَذَا الْمَنْزِلِ لَوْ هَلَكْتَ بِهِ لَمْ يَلِكَ إِلَّا أَعْرَابُ جُهَيْنَةَ، فَلَوْ دَخَلْتَ الْمَدِينَةَ كُنْتَ بَيْنَ أَصْحَابِكَ، فَإِنْ أَصَابَكَ مَا تَخَافُ أَوْ نَخَافُ عَلَيْكَ وَلِيَكَ أَصْحَابُكَ. وَكَانَ أَبُو فَضَالَةَ مِنْ أَهْلِ بَدْرٍ. فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ: إِنِّي لَسْتُ مَيِّتًا مِنْ مَرَضِي هَذَا - أَوْ مِنْ وَجَعِي هَذَا - إِنَّهُ «عَهِدَ إِلَيَّ النَّبِيُّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - إِنِّي لَا أَمُوتُ حَتَّى - أَحْسَبَهُ - قَالَ: أُضْرَبُ أَوْ تُخَضَّبُ هَذِهِ مِنْ هَذِهِ» - يَعْنِي ضَارِبَهُ - فَقُتِلَ أَبُو فَضَالَةَ مَعَهُ بِصِفِّينَ.رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَأَحْمَدُ بِنَحْوِهِ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ.(ہیثمی، **مجمع الزوائد**، باب مناقب علي بن أبي طالب رضي الله عنه، باب وفاته رضي الله عنه، رقم:۱۴۷۷۹۔)، جیسا کہ واضح ہے، علامہ ہیثمیؒ اس حدیث کی سند کے رجال کو ثقہ قرار دے رہے ہیں، البتہ کتاب الخلافة، باب الخلفاء الأربعة میں ہیثمی نے کہا ہے اس میں عبد اللہ بن محمد بن عقیل حسن الحدیث ہیں اور باقی سب راوی ثقہ ہیں۔**إتحاف** کی حدیث بھی اسی معنیٰ میں ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: إني لست بميت من وجعي هذا إن رسول الله - ﷺ - عهد إلي أن لا أموت حتى أؤمر.(بوصیری، **إتحاف الخيرة المهرة**، كتاب المناقب، ما جاء في قتله رضي الله عنه، رقم:٦٦٩٦؛ بوصیری نے لکھا ہے کہ اس کی سند پر کلام ہے، لیکن ہیثمیؒ کی روایت اس کی تائید کر رہی ہے۔)

[1] - ابن حجر، **الإصابة في تمييز الصحابة** (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۱۵ھ)، ۷:۲۶۷، ترجمہ رقم:۱۰۳۹۴۔

## ۲- ابو سنان دؤلی کی حدیث

اسی سے ملتے جلتے مضمون کی روایت ابو سنان الدؤلی سے بھی مروی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کیا ہمیں آپ کی اس بیماری سے خدشہ محسوس ہو رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے، اس لیے کہ میں نے سچی اور تصدیق کی ہوئی ذات یعنی رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تمھیں یہاں اور یہاں ضرب لگے گی اور یہ فرماتے ہوئے کن پٹیوں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں سے خون بہہ کر تمھاری ڈاڑھی کو رنگین کر دے گا۔ اس حدیث کو ابن ابی عاصم اور حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے بخاری کی شرط پر صحیح کہا ہے۔[1]

---

۱- ابو عبد اللہ الحاکم، **المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة، ذكر إسلام أمير المؤمنين علي رضي الله عنه، رقم: ۴۵۹۰؛ ابو بکر بن ابی عاصم، **الآحاد والمثاني**، العشرون المبشرون بالجنة، ومن ذكر علي بن أبي طالب الخ، رقم: ۱۷۴؛ **السنن الكبرى**، جماع أبواب صفة قتل العمد الخ، بَابُ مَنْ زَعَمَ أَنَّ لِلْكِبَارِ أَنْ يَقْتَصُّوا قَبْلَ بُلُوغِ الصِّغَارِ، رقم: ۱۶۰۶۹؛ حاکم کے لفظ یہ ہیں: أن أبا سنان الدؤلي حدثه، أنه عاد عليا رضي الله عنه في شكوى له أشكاها، قال: فقلت له: لقد تخوفنا عليك يا أمير المؤمنين في شكواك هذه، فقال: لكني والله ما تخوفت على نفسي منه، لأني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم الصادق المصدوق، يقول: «إنك ستضرب ضربة ها هنا وضربة ها هنا - وأشار إلى صدغيه - فيسيل دمها حتى تختضب لحيتك، ويكون صاحبها أشقاها، كما كان عاقر الناقة أشقى ثمود» هذا حديث صحيح على شرط البخاري، ولم يخرجاه."

## ۳- عراق جاؤگے تو تلوار کا شکار بنوگے

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے اور متعدد روایتیں اس سے ملتی جلتی ہیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ (عراق) جانے کا ارادہ کیا تو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے منع کیا۔ انھوں نے ایک بات کہی جو اس روایت میں تو نہیں، مگر دوسری روایتوں میں ہے کہ خلافت اگر ایک مرتبہ مدینے سے نکل گئی تو پھر مدینے میں واپس نہیں آگے گی۔ (اس سے معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن سلام بھی آپ کو خلیفہ مان رہے ہیں۔) اِس روایت میں یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ سے نکل رہا تھا، میرے پاؤں پائے دان میں تھے، عبد اللہ بن سلام نے مجھ سے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا عراق۔ انھوں نے کہا: أما إنك إن جئتها ليصيبك بها ذباب السيف. اگر آپ عراق میں گئے تو وہاں آپ تلوار کا نشانہ بنیں گے۔ (یہ بات آپ کو ہوسکتا ہے کتبِ سابقہ کے ذریعے معلوم ہوئی ہو۔) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: وأيم الله لقد سمعت رسول الله ﷺ يقوله. میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ راوی کہ رہے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہورہی تھی کہ اس آدمی کو پتا بھی ہے کہ میں نے مرنا ہے، پھر بھی جارہا ہے۔[1] اس حدیث کو حمیدی اور ابو یعلی نے اپنی اپنی مسند میں روایت

---

۱- **مسند الحميدي** کے لفظ یہ ہیں: حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ، ثنا سُفْيَانُ، ثنا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ أَعْيَنَ سَمِعَهُ مِنْ أَبِي حَرْبِ بْنِ أَبِي الْأَسْوَدِ الدِّيلِيِّ يُحَدِّثُهُ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُولُ: أَتَانِي عَبْدُ اللهِ بْنُ سَلَامٍ وَقَدْ أَدْخَلْتُ رِجْلِي فِي الْغَرْزِ فَقَالَ لِي: أَيْنَ تُرِيدُ؟ فَقُلْتُ: الْعِرَاقَ فَقَالَ: «أَمَا إِنَّكَ إِنْ جِئْتَهَا لَيُصِيبُكَ بِهَا ذُبَابُ السَّيْفِ» فَقَالَ عَلِيٌّ: «وَايْمُ اللهِ

کیا ہے۔ ابو یعلی کے محقق حسین سلیم اسد نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ شعیب ارنوؤط نے **صحیح ابن حبان** کی تعلیق میں اسے حسن قرار دیا ہے۔ میری رائے میں یہ حدیث حسن ضرور ہے، نیز اس مضمون کی تائید اور متعدد حدیثوں سے ہو رہی ہے۔[1]

---

لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟ قَبْلَهُ يَقُولُهُ» [ص:181] فَقَالَ أَبُو حَرْبٍ فَسَمِعْتُ: أَبِي يَقُولُ: فَعَجِبْتُ مِنْهُ وَقُلْتُ: رَجُلٌ مُحَارِبٌ يُحَدِّثُ بِمِثْلِ هَذَا عَنْ نَفْسِهِ.(ابو بکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، **مسند الحميدي**، رقم:۵۳۔)

۱- اس حدیث کی سند کے مدارِ اسناد سفیان بن عیینہ ہیں، وہ اسے عبد الملک بن اعین سے روایت کرتے ہیں۔ عبد الملک بن اعین پر اگرچہ کلام موجود ہے، لیکن بحیثیت مجموعی وہ قابل قبول راوی ہیں، اس لیے ان کی حدیث حسن سے کم نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نے **تقريب** میں ان پر بحث کا خلاصہ ان لفظوں میں نکالا ہے" صدوق، شيعي." ذہبی نے ان کا ذکر اپنی کتاب **من تُكلم فيه وهو موثق** میں کیا ہے۔ اس کتاب میں ذہبی نے کن راویوں کا ذکر کیا ہے؟ وہ خود بتاتے ہیں: فهذا فصل نافع في معرفة ثقات الرواة الذين تكم فيهم بعض الأئمة بما لا يرد أخبارهم وفيهم بعض اللين وغيرهم أتقن منهم وأحفظ فهؤلاء حديثهم إن لم يكن في أعلى مراتب الصحيح فلا ينزل عن رتبة الحسن۔ یعنی اس میں انھوں نے وہ راوی ذکر کیے ہیں جن پر اگرچہ کلام ہے، لیکن کوئی ایسی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے ان کی حدیث کو رد کیا جا سکے۔ زیادہ سے ان میں کسی قدر کم زوری ہوتی ہے، اس لیے ان کی حدیث حسن سے کم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حاکم نے اس حدیث کو جہاں صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے، وہاں اگرچہ ذہبی سے حاکم نے اتفاق نہیں کیا، لیکن عبد الملک بن اعین کی وجہ سے انھوں نے اس حدیث کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ انھوں نے سفیان بن عیینہ سے روایت کرنے والے ابراہیم بن بشار کی وجہ سے اعتراض کیا ہے کہ وہ مناکیر روایت کرتے ہیں، لیکن ذہبی کا یہ اعتراض حیران کن ہے۔ اس لیے کہ سفیان بن عیینہ سے تو کئی حضرات یہ حدیث روایت کر رہے ہیں جن میں ایک بڑا نام حمیدی کا ہے، خود **مسند الحميدي** میں یہ

## ۴- حضرت جابر بن سمرۃ کی حدیث

ایک اور روایت حضرت جابر بن سمُرہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: إِنَّكَ مُؤَمَّرٌ مُسْتَخْلَفٌ، وَإِنَّكَ مَقْتُولٌ، وَهَذِهِ مَخْضُوبَةٌ مِنْ هَذَا، لِحْيَتُهُ مِنْ رَأْسِهِ.[1] (تمھیں امیر و خلیفہ بھی بنایا جائے گا اور تمھیں شہید بھی کیا جائے گا اور یہ (داڑھی) اس (سر کے خون) سے رنگین ہو گی۔) سر سری رائے میں مجھے یہ حدیث سنداً ضعیف لگ رہی ہے۔

## ۵- لوگ تعلق نہیں نبھائیں گے

ایک اور روایت ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

حدیث موجود ہے۔ بظاہر ذہبی کو اس کا مضمون عجیب سا لگا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس موضوع کی حدیثیں ذہبی جیسے محدثین کے ہاں کیسے شدید نقد سے گزری ہیں، اس لیے جہاں اس موضوع کی کسی حدیث کو وہ صحیح یا حسن کہہ دیں تو بڑی اہم بات ہوتی ہے۔

۱ - ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (۳۶۰ھ)، **المعجم الأوسط**، ت، طارق بن عوض بن محمد، باب المیم، من اسمه محمد، رقم: ۷۳۱۸۔

إن الأمة ستغدر بك بعدي. وأنت تعيش على ملتي وتقتل على سنتي ، من أحبك أحبني ومن أبغضك أبغضني وإن هذه ستخضب من هذا.(۱)

(لوگ میرے بعد تجھ سے تعلق نہیں نبھائیں گے (اور اس میں تمھارا قصور نہیں ہو گا اس لیے کہ) تم میری ملت پر جیو گے اور میری سنت پر قائم رہتے ہوئے تمھارا قتل ہو گا۔ جس نے تم سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے تم سے بغض رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ اور یہ داڑھی اس سر کے خون سے رنگین ہو گی۔)

یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تین حضرات روایت کرتے ہیں۔ پہلے حیان اسدی، ان کی روایت کو ذہبی نے **تلخیص المستدرک** میں حاکم سے اس سے کا صحیح ہونا نقل کیا ہے اس کا مطلب ہے حافظ ذہبی نے بھی حاکم کی موافقت کی ہے۔ دوسرے ثعلبہ بن یزید حمانی، ان کی روایت کے بارے میں بوصیری نے **إتحاف الخیرة المهرة** میں کہا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اسے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ثعلبہ بن یزید کے بارے میں محدثین کا کچھ اختلاف ہے،(۲) لیکن ایسے مختلف فیہ کی روایت کو صحیح کے بجائے حسن شمار کر لیا جاتا ہے،

---

۱ - اس حدیث کو حاکم، ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ بوصیریؒ اپنی کتاب **إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة** میں کہتے ہیں: رواه أبو بكر بن أبي شيبة بإسناد حسن.

۲- اگرچہ بعض حضرات، مثلاً ذہبی، نے ان پر غالی شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کے پولیس آفیسر تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو حضرت علیؓ کے انھیں کسی منصب پر فائز کرنے کے بعد کسی کی بلا دلیل جرح میں کوئی وزن باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ غالی تھا یا کیا تھا۔ ذہبی

خصوصا اس لیے کہ یہ طبقہ تابعین سے ہیں اور جنھوں نے جرح کی ہے انھوں نے کوئی قابل قبول وجہ بیان نہیں کی۔ تیسرے ابو ادریس الأودی، جن کی روایت **مسند الحارث** میں ہے، ان کی سند پر کسی کا کلام نظر سے نہیں گزرا۔ ابو ادریس اودی تابعین میں سے ہیں، امام بخاری نے **التاریخ الکبیر** میں ان سے نقل کیا ہے: نظرتُ إلی عليّ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی حضرت علی سے ملاقات بھی ہے۔ ابن حبان نے انھیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک طبقۂ تابعین میں عدالت اصل ہے۔ البانی نے تسلیم کیا ہے کہ اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس میں ہشیم بن بشیر مدلس ہیں۔ ہشیم اونچے درجے کے محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ محض تدلیس کا اعتراض اتنا بڑا نہیں ہے، وہ تعدد طرق سے بھی زائل ہو جاتا ہے۔ تعدد طرق کی سب سے اعلی شکل یہ ہوتی ہے کہ خود صحابی سے ہی روایت کرنے والے متعدد ہو جائیں۔ یہاں یہی شکل ہے، وگرنہ عموما چند طبقوں میں ایک ایک راوی ہوتا ہے اس سے نیچے تعدد طرق شروع ہوتا ہے۔ بہر حال اسانید وغیرہ پر تفصیلی کلام ہمارا موضوع نہیں ہے، اس سے بات طویل ہو جائے گی۔ اتنا کافی ہے کہ بوصیری اور ذہبی جیسوں نے اس کے ایک طریق کو حسن اور ایک کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن چوں کہ البانی نے اس پر مذکورہ اعتراض کیا ہے، اس لیے مختصرا کچھ عرض کر دیا۔

سند پر اعتراض نہ ہونے کے باوجود بعض حضرات کو اس میں اس لیے نکارت محسوس ہوئی یا اسے قبول کرنے میں تردد ہوا کہ کہیں اسے عہدِ رسالت کے فورا بعد پر محمول کر کے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت غصب ہوئی ہے، لیکن اس دور پر اسے اس

---

کا صاحب شرطة علي بھی کہنا اور غالی بھی کہنا بذاتِ خود عجیب لگتا ہے۔ بہر حال یہاں یہ اس روایت کے نقل کرنے میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ ان کے دو متابع موجود ہیں۔

لیے محمول نہیں کر سکتے کہ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود کو خلافت کے لیے پیش ہی نہیں کیا تھا نہ اس معاملے میں اپنی مدد ہی کی دعوت دی تھی۔ یہ حدیث اگر اس دور پر محمول کی جائے، جب آپ کی خلافت منعقد ہو گئی تھی اور آپ خود کو خلیفہ قرار دیتے تھے، تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

یہ بات پہلے بھی عرض کی ہے کہ ایک بات یہ ہے کہ کسی بات کی فی نفسہ حیثیت کیا ہے؟ اور ایک یہ ہے کہ کوئی کرنے کا کام کسی سے چھوٹا تو اس پر کیا حکم لگے گا؟ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ وہ کام کسی عذر سے بھی چھوٹ سکتا ہے۔ ہمارا موضوع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کھڑے ہونے والے صحابہ نہیں ہیں۔ (ان کے حوالے سے آخر میں تھوڑی سی بات آئے گی۔) ہمارا موضوع خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی احادیث کی روشنی میں سمجھ میں آنے والی پوزیشن ہے۔ حضرت علیؓ کی دعوت یہ تھی کہ اس معاملے میں ان کی مدد کی جائے، تاکہ خلافت کا ادارہ دوبارہ مستحکم ہو سکے۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ سمجھنا بجا تھا۔

لوگ بڑے عجیب انداز سے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت پر تو اتفاق ہی نہیں ہوا۔ ایک تو امر واقعہ کے اعتبار سے یہ بات غلط ہے۔ واقعۂ تحکیم تک حضرت علیؓ کی خلافت سے کسی نے اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے متبادل خلافت کا دعویٰ کیا۔ دوسرے یہ کہ آپ کو دور ہی فتنوں کا ملا، آپ کے خلافت سنبھالنے سے پہلے حالات خراب ہو چکے تھے اور تیسرے یہ کہ احادیث بہت واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ اگر کوئی علیؓ کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا تو اس میں علیؓ کی غلطی نہیں ہے۔

## ٦- کینے ظاہر ہوں گے

اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث ہے۔ اگرچہ حاکم اور ذہبی نے اس کے کچھ حصے کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن میرے خیال میں اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے، تاہم بادی النظر میں اپنے بنیادی مضمون کے اعتبار یہ حسن ضرور ہو گی۔ اس کے الفاظ ہیں:

وعن علي بن أبي طالب قال: بينا رسول الله - ﷺ - آخذ بيدي ونحن نمشي في بعض سكك المدينة إذ أتينا على حديقة، فقلت: يا رسول الله، ما أحسنها من حديقة! فقال: " إن لك في الجنة أحسن منها ". ثم مررنا بأخرى، فقلت: يا رسول الله، ما أحسنها من حديقة! قال: " لك في الجنة أحسن منها ". حتى مررنا بسبع حدائق، كل ذلك أقول: ما أحسنها، ويقول: " لك في الجنة أحسن منها ". فلما خلا لي الطريق اعتنقني ثم أجهش باكيا، قلت: يا رسول الله، ما يبكيك؟ قال: " ضغائن في صدور أقوام لا يبدونها لك إلا من بعدي ". قال: قلت: يا رسول الله، في سلامة من ديني؟ قال: " في سلامة من دينك.[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور ہم مدینہ کی بعض گلیوں میں محوِ خرام تھے کہ ہمارا گزر ایک باغ پر ہوا۔ میں نے کہا: یارسول اللہ، یہ کتنا خوب صورت باغ ہے، تو آپ نے فرمایا: تمھارے لیے جنت میں اس سے بھی خوب صورت باغ ہے۔ پھر ہمارا گزر ایک دوسرے باغ پر سے ہوا تو میں نے کہا: یارسول اللہ، یہ کتنا خوب

---

[1] - **مجمع الزوائد**،باب مناقب علي بن أبي طالب رضي الله عنه،باب بشارته بالجنة،رقم: ١٤٦٩٠۔

صورت باغ ہے۔ آپ نے فرمایا: تمھارے لیے جنت میں اس سے بھی خوب صورت باغ ہے۔ اسی طرح ہم سات باغوں پر سے گزرے۔ میں ہر بار کہتا کہ یہ کس قدر خوب صورت ہے اور آپ یہ فرماتے کہ تیرے لیے جنت میں اس سے زیادہ خوب صورت باغ ہے۔ جب ہم راستے میں تنہا ہوئے تو آپ نے مجھے گلے لگا لیا اور آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ، کس بات نے آپ کو رلا دیا؟ آپ نے فرمایا: بعض لوگوں کے دلوں میں کینے مخفی ہیں، جن کا اظہار وہ میرے بعد ہی کریں گے۔ حضرت علی کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ، کیا یہ سب کچھ میرے دین کی سلامتی کی حالت میں ہو گا؟ فرمایا: ہاں تیرے دین کی سلامتی کی حالت میں۔

گویا اس موقع پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فکر ہے کہ مخالفت کے ماحول میں کہیں مجھ سے کوئی دینی بے اعتدالی نہ ہو جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تسلی کرا رہے ہیں کہ میرا دین تو سلامت رہے گا نا۔ ایسے موقع پر اتنی زیادہ سچی زبان سے اپنی مظلومیت کا تصدیق نامہ سنتے ہی نہ معلوم ان پر کیا کیفیت طاری ہوئی ہو گی! اس کے باوجود اپنے عمل کی درستی کی فکر اس غلبۂ حال میں بھی پس منظر میں نہیں گئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص نے جب اپنے مدمقابل لوگوں کے بارے میں قدم اٹھائے ہوں گے تو کتنے سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر اٹھائے ہوں گے۔

جس طرح سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ غدیر اور دیگر مواقع پر اپنے اہل خانہ کے حق کی نزاکت کو بیان فرمایا اور جس طرح علمائے اہلِ سنت نے اس کا پس منظر بیان فرمایا، جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا، اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کس طرح عہدِ رسالت ہی میں اس ذہنیت کے لوگ موجود تھے، جو علی کو بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے کسی فرد کو آگے آتا ہوا گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مولی اور منہ بولے

بیٹے زید بن حارثہ کو امیر بنا کر بھیجا، اس پر لوگوں نے باتیں بنانی شروع کر دیں، پھر آخری لشکر کا امیر اسامہ بن زید کو بنایا تو بھی باتیں بنانا شروع کر دیں۔ صحیحین کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرمانا پڑا کہ پہلے تم نے اس کے باپ کے امیر بننے پر اعتراض کیا تھا، حالاں کہ وہ امیر بننے کا اہل تھا اور مجھے انتہائی محبوب تھا اور ان کے بعد یہ اسامہ بھی مجھے محبوب ہے۔[1] تو خدا واسطے کا بیر کہ بس اس خاندان کا کوئی بندہ آگے نہیں آنا چاہیے خود عہدِ رسالت میں بھی موجود تھا، یہی بیماری بعد میں کیا گل کھلائے گی؟ رسول اللہ ﷺ ان روایات میں اسی کو بیان فرما رہے ہیں۔ یہ لوگ بنیادی طور پر منافق قسم کے ہوں گے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ نے حضرت علی سے فرمایا: ستلقى جهدا وبلاء. (تجھے مشقت و آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا۔) اور یہ بات حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہت مشکلات کا سامنے کرنا پڑا اور اسی وجہ سے آپ کے حوالے سے اس طرح کی احادیث بھی زیادہ آئی ہیں۔ سابق خلفا کے زمانے میں وہ حالات ہی نہیں تھے۔ جن حالات کا حضرت علیؓ کو سامنا کرنا پڑا، وہ آپ کے اپنے لائے ہوئے نہیں تھے، اس لیے علیؓ کی پوزیشن رسول اللہ

---

[1]- **صحيح البخاري**، كتاب أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب زيد بن حارثة، رقم: ٣٧٣٠؛ **صحيح مسلم**، كتاب فضائل الصحابة رضي الله عنهم، باب فضائل زيد بن حارثة وأسامة بن زيد رضي الله عنهما، رقم: ٢٤٢٦۔

ﷺ خود واضح کر رہے ہیں، تاکہ بعد والوں کو اشتباہ نہ ہو کہ علی تو ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔[1]

---

۱ - **مجمع الزوائد** میں یہ مکمل روایت اس طرح ہے: «وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَ: بَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ - ﷺ - آخِذٌ بِيَدِي وَنَحْنُ نَمْشِي فِي بَعْضِ سِكَكِ الْمَدِينَةِ إِذْ أَتَيْنَا عَلَى حَدِيقَةٍ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا أَحْسَنَهَا مِنْ حَدِيقَةٍ! فَقَالَ: " إِنَّ لَكَ فِي الْجَنَّةِ أَحْسَنَ مِنْهَا ". ثُمَّ مَرَرْنَا بِأُخْرَى، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا أَحْسَنَهَا مِنْ حَدِيقَةٍ! قَالَ: " لَكَ فِي الْجَنَّةِ أَحْسَنُ مِنْهَا ". حَتَّى مَرَرْنَا بِسَبْعِ حَدَائِقَ، كُلُّ ذَلِكَ أَقُولُ: مَا أَحْسَنَهَا، وَيَقُولُ: " لَكَ فِي الْجَنَّةِ أَحْسَنُ مِنْهَا ". فَلَمَّا خَلَا لِيَ الطَّرِيقُ اعْتَنَقَنِي ثُمَّ أَجْهَشَ بَاكِيًا، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا يُبْكِيكَ؟ قَالَ: " ضَغَائِنُ فِي صُدُورِ أَقْوَامٍ لَا يُبْدُونَهَا لَكَ إِلَّا مِنْ بَعْدِي ". قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، فِي سَلَامَةٍ مِنْ دِينِي؟ قَالَ: " فِي سَلَامَةٍ مِنْ دِينِكَ». (ہیثمی، **مجمع الزوائد**، باب مناقب علي بن ابي طالب رضي الله عنه، باب بشارته بالجنة، رقم: ۱۴۶۹۰۔) اس کی سند کے حوالے سے فرماتے ہیں: رَوَاهُ أَبُو يَعْلَى وَالْبَزَّارُ، وَفِيهِ الْفَضْلُ بْنُ عُمَيْرَةَ، وَثَّقَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَضَعَّفَهُ غَيْرُهُ، وَبَقِيَّةُ رِجَالِهِ ثِقَاتٌ. امام بوصیریؒ شافعی **إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة** میں یہ رایت نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: رَوَاهُ أَبُو يَعْلَى الْمَوْصِلِيُّ وَالْبَزَّارُ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. (اسے ابویعلیٰ موصلی، بزار اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔) (البوصیری، **إتحاف الخيرة المهرة**، كتاب المناقب، باب فيما اشترك فيه أمير المؤمنين علي بن أبي طالب وغيره من الفضل رضي الله عنهم، رقم: ۲۲۵۳۔)

## ۷۔ تمھیں مشکلات کا سامنا ہوگا

باغ والے مضمون کی حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی طبرانی نے بھی **المعجم الکبیر** میں روایت کی ہے، لیکن اس کی سند میں کافی ضعف ہے، البتہ ابن عباس ہی سے اس سے ملتے جلتے مضمون کی ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: أما إنك ستلقى بعدي جهدا، تمھیں میرے بعد تکالیف کا سامنا کرنا ہوگا۔ خلفاے ثلاثہ کے ادوار میں تو حضرت علیؓ کا وقت عافیت میں گزرا، اس لیے یہاں حضرت علیؓ کا دورِ خلافت ہی مراد ہو سکتا ہے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کیا یہ سب کچھ میرے دین کی سلامتی کے ساتھ ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں، تمھارے دین کی سلامتی کے ساتھ ہوگا۔ ابن عباس کی اس دوسری حدیث کو حاکم نے مستدرک میں روایت کرکے شیخین کی شرط کے مطابق صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بھی موافقت کی ہے۔ البتہ البانی نے اس پر اشکال کیا ہے کہ باقی راوی تو واقعی اس کے صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں، البتہ سہل بن المتوکل ایک راوی مجہول ہیں، لیکن سہل بن المتوکل کو ابن حبان نے **الثقات** میں ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر وہ اسماعیل بن ابی اویس سے روایت کریں تو عجیب وغریب روایتیں نقل کرتے ہیں۔ اور یہ حدیث وہ اسماعیل سے نہیں، احمد بن یونس سے روایت کر رہے ہیں جو کہ خود اونچے درجے کے محدثین میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کو مجموعی طور پر کم از کم حسن کہا جاسکتا ہے، خصوصاً پہلی روایت کے ساتھ ملا کر۔ تاریخی طور پر بھی یہ بات ثابت ہے کہ حضرت علی کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ امام احمد کے صاحب

زادے عبد اللہ نے **کتاب السنة** میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے اپنی مشکلات کا تذکرہ شروع کیا تو آپ رو پڑے۔[1]

## مشاجراتِ صحابہ میں نزاکت کی وجہ

یہ موضوع حساس ضرور ہے، لیکن حضرت علیؓ کے حوالے سے حساس نہیں۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ حضرت علیؓ بھی اسی طرح اور انھی اصولوں پر خلیفہ ہیں، جن پر پہلے حضرات خلیفہ ہیں۔ یہ مسئلہ حساس دو پہلوؤں سے ہے: ایک یہ کہ جب آپ واقعات کی ان تفصیلات میں جاتے ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں تو بہت زیادہ الجھاؤ سامنے آتا ہے، اس لیے ان متضاد اور الجھی ہوئی تاریخی روایات پر انحصار کرنے کے بجاے بہتر راستہ یہ ہے کہ احادیث مبارکہ، کبارِ صحابہ کے ارشادات اور اہل السنت والجماعت کے عمومی مزاج کو سامنے رکھ کر ایک لائن متعین کرلی جائے۔ اگر تاریخی تفصیلات میں جانا ہی ہو (اگرچہ یہ خاصا پھسلن والا میدان ہے) تو تاریخ کو پرکھتے ہوئے اس لائن کو ضرور مدِّ نظر رکھا جائے۔ اس مسئلے کے نازک ہونے کی جو دوسری وجہ ہے، وہ یہ ہے کہ جو دوسری طرف لوگ تھے، ان کی پوزیشن کس طرح متعین کریں اور ان کا عذر کیسے بیان کیا جائے کہ ان کے بارے میں بد زبانی یا بد گمانی تک نوبت نہ پہنچے۔ یہ نازک معاملہ ہے جو ہماری گفت گو کا براہِ راست تو موضوع نہیں ہے، مگر آخر میں اس پر بھی بقدرِ ضرورت بات ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔

---

۱- عبد اللہ بن احمد، **السنة**، رقم: ۱۳۱۴۔ کتاب کے محقق محمد بن سعید القحطانی نے اس کی سند پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں شریک بن عبد اللہ ہیں، جو اگرچہ قابل اعتماد ہیں، لیکن ان سے غلطیاں ہو جاتی ہیں، لیکن اس کی وجہ سے روایت میں زیادہ ضعف پیدا نہیں ہوتا، چناں چہ امام بخاری نے بھی بعض جگہوں پر شریک کی روایات لی ہیں۔

## بعد کے سیاسی حالات کے بارے میں عمومی پیشین گوئیاں

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد کے زمانے میں پیش آنے والے حالات کے بارے میں عمومی باتیں بھی بہت سی ارشاد فرمائیں، جنھیں محدثین عموماً فتن، ملاحم اور علاماتِ قیامت کے عنوانات کے تحت ذکر کرتے ہیں۔ ایسی احادیث تین طرح کی ہیں: بعض احادیث میں بالکل قربِ قیامت کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض میں امت کے ایسے حالات بیان کیے گئے ہیں جو آپ کے بعد کسی بھی دور میں پائے جاسکتے ہیں۔ تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے کچھ عرصے بعد کے حالات سے ہے۔ ایسی احادیث بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان میں کئی حدیثیں ہمارے موضوع سے بھی تعلق رکھتی ہیں، یہاں ان میں سے صرف دو تین احادیث ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

### ۱- خلافت علی منہاج النبوۃ اور اس کے بعد بادشاہت

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک مشہور حدیث ہے اور بعض دیگر صحابہ سے بھی الفاظ کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد کے مراحل کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت تم نبوت اور رحمت میں ہو، اس کے بعد خلافت اور رحمت ہوگی اور بعض روایات میں خلافۃ علی منہاج النبوۃ کے الفاظ آتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ملک عاضّ ہوگا یا ملک عضوض، یعنی خلافت علی منہاج النبوۃ کے بجائے بادشاہت ہے، لیکن اس کے لیے وہ سخت الفاظ نہیں ہیں، جو آگے آرہے ہیں، بلکہ

فرمایا کہ یہ کاٹنے والی بادشاہت ہوگی۔ کاٹنے کی جو تشریح دیگر متعدد روایات سے سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ یہ دور بالکل ہی غلط تو نہیں ہوگا، وگرنہ تو اس سے اگلے دور کو الگ سے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، البتہ اس میں کچھ کام غلط یا نامناسب بھی ہوں گے۔ اس کے بعد کے لیے فرمایا کہ ملکا جبرية کا دور ہوگا اور ایک روایت میں آتا ہے کہ پھر اس کے بعد دوبارہ خلافت علی منہاج النبوت ہوگی۔ دوبارہ خلافت کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے اور ایک قول ہے کہ یہ حضرت مہدی کی بات ہو رہی ہے۔[1]

---

۱ - حضرت حذیفہ کی اس حدیث پر **مسند أحمد** کے الفاظ ہیں: حدثنا سليمان بن داود الطيالسي، حدثني داود بن إبراهيم الواسطي، حدثني حبيب بن سالم، عن النعمان بن بشير، قال: كنا قعودا في المسجد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، وكان بشير رجلا يكف حديثه، فجاء أبو ثعلبة الخشني، فقال: يا بشير بن سعد أتحفظ حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم، في الأمراء؟ فقال حذيفة: أنا أحفظ خطبته، فجلس أبو ثعلبة، فقال حذيفة: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " تكون النبوة فيكم ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافة على منهاج النبوة، فتكون ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء الله أن يرفعها، ثم تكون ملكا عاضا، فيكون ما شاء الله أن يكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون ملكا جبرية، فتكون ما شاء الله أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافة على منهاج نبوة " ثم سكت، قال حبيب: " فلما قام عمر بن عبد العزيز، وكان يزيد بن النعمان بن بشير في صحابته، فكتبت إليه بهذا الحديث أذكره إياه، فقلت له: إني أرجو أن يكون أمير المؤمنين، يعني عمر، بعد الملك

## ۲- خیر وشر کے مختلف مراحل کی پیش گوئی

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث ہے جو صحیحین سمیت متعدد کتابوں میں ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں شر کے بارے میں پوچھا کرتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ، پہلے ہم شر (زمانۂ جاہلیت) میں تھے اور اب یہ خیر آگئی ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی شر ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں ہوگا۔ **سنن أبي داود** کی روایت میں ہے کہ پوچھا: ما العصمة فيها؟ (اس میں بچاؤ کی صورت کیا ہوگی؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: السيف. (تلوار)۔ شر کے مفہوم میں باہمی جنگیں بھی داخل ہیں۔ کلامِ عرب میں یہ استعمال عام ہے، جیسے حماسی شاعر کا قول ہے:

إذا الشر أبدى ناجذيه لهم　　　طاروا إليه زرافات ووحدانًا

(جب جنگ ان کے لیے اپنے دانت کھولتی ہے تو وہ اس کی طرف انفرادی طور پر اور جتھوں کی صورت دوڑ پڑتے ہیں۔)

پھر پوچھا کہ اس شر کے بعد کوئی خیر ہوگا؟ فرمایا کہ خیر ہوگا، لیکن فيه دخن. (وہ خیر شفاف نہ ہوگی، اس میں کدورت ہوگی۔) اس ملاوٹ والے خیر کے بعد آنے والے شر کے

---

العاض والجبرية، فأدخل كتابي على عمر بن عبد العزيز فسر به وأعجبه. (احمد بن حنبل، **مسند أحمد**، مسند الكوفيين، حديث النعمان بن بشير عن النبي ﷺ، رقم: ۱۸۴۰۶؛ محقق نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔)

بارے میں فرمایا کہ بہت خطرناک شر ہو گا، دعاة على أبواب جهنم. یہاں لوگوں کی بہت بری خصلتوں کا بیان ہے۔[1]

ان مراحل کی احوال وواقعات پر تطبیق کے حوالے سے ہمارے متعلق حصہ صرف پہلا ہی ہے یعنی خلافت ورحمت اور خلافت علی منہاج النبوت والا مرحلہ؛ تاہم ان مراحل پر کسی

---

۱ - یہ حدیث، الفاظ کے کچھ کچھ فرق کے ساتھ مختلف مجموعہ ہائے حدیث میں موجود ہے، جن میں **صحيح البخاري، صحيح مسلم،سنن ابن ماجه،المستدرك على الصحيحين،مستخرج أبي عوانة، مسند البزار** وغیرہ شامل ہیں۔ بخاری کے الفاظ ہیں:حدثنا محمد بن المثنى، حدثنا الوليد بن مسلم، حدثنا ابن جابر، حدثني بسر بن عبيد الله الحضرمي، أنه سمع أبا إدريس الخولاني، أنه سمع حذيفة بن اليمان، يقول: كان الناس يسألون رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الخير، وكنت أسأله عن الشر، مخافة أن يدركني، فقلت: يا رسول الله، إنا كنا في جاهلية [ص:٥٢] وشر، فجاءنا الله بهذا الخير، فهل بعد هذا الخير من شر؟ قال: «نعم» قلت: وهل بعد ذلك الشر من خير؟ قال: «نعم، وفيه دخن» قلت: وما دخنه؟ قال: «قوم يهدون بغير هديي، تعرف منهم وتنكر» قلت: فهل بعد ذلك الخير من شر؟ قال: «نعم، دعاة على أبواب جهنم، من أجابهم إليها قذفوه فيها» قلت: يا رسول الله صفهم لنا، قال: «هم من جلدتنا، ويتكلمون بألسنتنا» قلت: فما تأمرني إن أدركني ذلك؟ قال: «تلزم جماعة المسلمين وإمامهم» قلت: فإن لم يكن لهم جماعة ولا إمام؟ قال: «فاعتزل تلك الفرق كلها، ولو أن تعض بأصل شجرة، حتى يدركك الموت وأنت على ذلك».(**صحيح البخاري** ،كتاب الفتن، باب كيف الأمر إذا لم تكن جماعة، رقم: ۷۰۸۴۔)

قدر نظر ڈال لینا مناسب ہو گا۔ ان احادیث سے پہلا مرحلہ جو معلوم ہو رہا ہے وہ عہدِ رسالت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور کے تو کیا ہی کہنے جب جناب رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس امت کی قیادت فرما رہے تھے۔ اس کے بعد اس خلافت کا دور ہے جو نبوت ہی کے منہاج پر ہو گی، جسے اصطلاح میں خلافتِ راشدہ کہا گیا ہے۔ اس کے نبوت کے منہاج پر ہونے سے معلوم ہوا کہ اس دور میں کسی کا حق تلف کیا گیا نہ کسی کی خلافت غصب کی گئی۔ اگر نعوذ باللہ یہ مان لیا جائے کہ خلافت حق کسی اور کا تھا اور غصب کر کے فلاں کو دے دی گئی، یا رسول اللہ ﷺ کی صراحت اور وصیت کی مخالفت کر کے کسی اور کو دے دی گئی تو وہ خلافت نبوت کے طریقے پر نہیں کہلا سکتی، جب کہ ان حدیثوں میں خلافت علی منہاج النبوۃ اور خلافۃ ورحمۃ وغیرہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد دو مزید ادوار کا ذکر ہے تیسرے اور چوتھے کا۔ چوتھے دور کے لیے الفاظ بہت سخت استعمال ہوئے ہیں، مثلاً حضرت حذیفہؓ کی پہلی حدیث میں اسے جبریت والی بادشاہت کہا گیا ہے۔ **مشكاة المصابيح** میں بیہقی کے حوالے سے مذکور حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت معاذؓ کی روایت میں لفظ ہیں "جبرية وعتوًا وفسادًا في الأرض." اور ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے محرمات کو حلال کاموں کی طرح کریں گے۔ حضرت حذیفہؓ کی دوسری حدیث میں جو تعبیرات آئی ہیں وہ یہ ہیں "جہنم کے دروازوں پر کھڑے لوگ جہنم کی طرف بلا رہے ہوں گے، جو ان (حکم رانوں) کی بات مانے گا اسے دوزخ میں پھینک دیں گے"، "ہماری ہی نسل میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبانیں بولتے ہوں گے لیکن شیاطین ہوں گے انسانی لبادے میں"۔ (اس سے ایک بار پھر ثابت ہوا کہ حالات کی خرابی کے اصل ذمہ دار بیرونی عناصر نہیں اندرونی عناصر ہیں۔ بیرونی عناصر والی بات بھی

ثانوی درجے میں درست ہوسکتی ہے، لیکن اس کی حیثیت محض ایک مؤرخانہ تجزیے کی ہے۔)

چوتھے مرحلے کے بارے میں جو تعبیرات کی سختی ہے وہ تیسرے (خلافت علی منہاج النبوۃ کے فورا بعد والے) کے بارے میں نہیں ہے۔ میں نے چوتھے مرحلے کی تعبیروں کا پہلے ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان لوگوں کی غلطی واضح ہوسکے جو چوتھے مرحلے کے ان اوصاف کو تیسرے مرحلے کے لیے بھی ثابت کرتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر جبر اور فساد کا دور تھا، اگر ایسا ہی ہوتا تو یہ دو مرحلے الگ الگ نہ ہوتے۔

تیسرے (خلافتِ نبوت) کے فوری بعد والے مرحلے کے لیے لفظ ہیں ملکٌ عاض، حضرت حذیفہؓ کی ایک روایت میں ہے تعرِف منهم وتنكر ان کے اچھے کام بھی دیکھو گے نامناسب بھی، هدنةٌ على دخن وجماعةٌ أقذاء مصالحت ہوگی کچھ کدورتوں کے ساتھ اور اجتماعیت ہوگی کچھ تکلیف دہ چیزوں کے ساتھ۔ قوم يستنون بغير سنتي ويهتدون بغير هديتي[1] ان میں کچھ لوگ ہوں گے (یعنی سارے نہیں) جو میری سنت کے علاوہ کو راستہ بنائیں گے اور میری ہدایت کے علاوہ کسی اور چیز سے راہ نمائی حاصل کریں گے۔

اگرچہ ان حدیثوں کی مکمل تشریح یہاں مقصود نہیں، لیکن حضرت حذیفہؓ کی دوسری حدیث کے بارے میں ایک بات کا ذکر یہاں مفید ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ کی اس حدیث میں

---

[1] - **صحيح مسلم**، كتاب الإمارة، باب الأمر بلزوم الجماعة عند ظهور الفتن، رقم: ۱۸۴۷۔

خیر وشر کے مختلف مراحل بیان ہوئے ہیں۔ ایک پہلا شر ہے جو جاہلیت میں تھا، اس کے بعد پہلا خیر ہے جو عہد رسالت سے شروع ہوا۔ اس کے بعد پھر شر ہو گا، یہ دوسرا شر ہے۔ اس کے بعد پھر خیر ہو گا، یہ دوسرا خیر ہے۔ اسی کے بارے میں وہ تعبیرات آئی ہیں جو ابھی ذکر ہوئیں، مثلاً هدنة على دخن وغیرہ۔ اس کے بعد پھر شر ہو گا جو بہت برا ہو گا۔ پہلی خیر (عہد رسالت سے شروع ہونے والی خیر) کے بعد جو دوسرا شر ہے اس کے بارے میں ابوداود کی روایت میں یہ بھی ہے کہ میں نے پوچھا یارسول اللہ، اس میں بچاؤ کا ذریعہ کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا تلوار۔ اس شر کا مصداق کیا ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں: مثلاً ایک رائے یہ ہے کہ اس شر سے مراد عہد صدیقی میں اٹھنے والے فتنے ہیں جیسے مرتدین، مانعین زکوۃ وغیرہ۔ اس کے بارے میں یہ بات تو درست ہے کہ اس میں نجات کا راستہ تلوار تھا، لیکن ان فتنوں کے خاتمے کے بعد کے دور پر وہ الفاظ منطبق نہیں ہوتے جو حدیث میں دوسری خیر کے لیے آئے ہیں، مثلاً هدنة على دخن، جماعة أقذاء، قوم يستنون بغير سنتي، تعرف منهم وتنكر، ان میں سے کوئی بات بھی عہد صدیقی کے باقی ماندہ حصے یا اس کے بعد کے دور پر منطبق نہیں ہوتی، اس لیے میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ پہلا شر تو جاہلیت کا ہے، اس کے بعد پہلا خیر عہد رسالت سے شروع ہوتا ہے اور عہد صدیقی اور عہد فاروقی سے ہوتا ہوا عہد عثمانی کے ابتدائی بڑے حصے تک کو شامل ہے۔ یہ اسی خیر کا امتداد ہے جو خالص خیر ہے۔ دوسرا شر جو شروع ہوتا ہے یہ عہد عثمانی کے آخر سے ہوتا ہے، جب فتن کھل کر سامنے آ گئے، اس لیے کہ دروازہ ٹوٹے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ یہ دور ۴۰ھ تک اس وقت تک چلتا ہے، جب حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی۔ یہ دور شر کا دور اس معنی میں نہیں ہے کہ حکم ران برے ہیں یا ان کا نظم حکومت کا معیار کم ہے، بلکہ اس معنی میں کہ یہ

اندرونی خلفشار کا دور ہے۔ ایسا خلفشار جس میں دار الخلافۃ کے اندر خلیفۂ راشد کی عمل داری کو ختم کر دیا گیا اور انھیں ظلماً شہید کر دیا گیا، اس کے بعد بھی خلیفۂ راشد کو مسلسل جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور کے بارے میں یہ بات بھی منطبق ہوتی ہے العصمة فيها السيف، اس لیے کہ اس دور میں حضرت علیؓ نے مختلف گروہوں کے ساتھ جنگیں کیں، اور اس دور کے اختتام کے بعد والے دورِ خیر (جو صلح حسنؓ سے شروع ہوتا ہے، جو حدیث کے مطابق ملا جلا خیر ہے، مکمل خیر نہیں ہے۔) پر وہ الفاظ بھی منطبق ہو جاتے ہیں جو حدیث کے اگلے حصے میں بیان ہوئے ہیں، جن کا ذکر ابھی ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے اگرچہ قتال نہیں کیا، لیکن وہ اس دورِ شر کا آغاز تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس شر کا عروج تھا۔ حضرت علیؓ نے بھی خوارج کے خلاف قتال بہت بعد میں کیا تھا، حالاں کہ یہ لوگ موجود پہلے بھی تھے، لیکن قتال کی وجوہ مکمل طور پر بعد میں پیدا ہوئیں۔ ایک فقیہ خلیفہ کسی گروپ کے خلاف ایکشن اس بنیاد پر نہیں لیتا کہ وہ اچھے یا برے لوگ ہیں، بلکہ ایکشن تب لیتا ہے جب ایکشن کی وجہ پیدا ہو جائے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی قتال کے حوالے سے پالیسی میں فرق کے بارے میں شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی رائے ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ بہر حال دونوں حضرات نے اپنے اپنے وقت کے حساب سے درست فیصلہ کیا۔ اس بات کو مدّ نظر رکھ کر عہد علوی کے داخلی قتالوں کے بارے میں جو حدیثیں آرہی ہیں، یہ حدیث ان کے ساتھ بالکل ایک لائن میں نظر آرہی ہے۔

## ۳۔ خلافت تیس سال ہو گی

اوپر کی حدیثوں سے معلوم ہوا کہ خلافت ورحمت کا دور ہو گا، اس کے بعد بادشاہت کا دور ہو گا، ان دونوں ادوار کے درمیان زمانی طور پر حد فاصل کیا ہے، کب ایک

دور ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہوتا ہے؟ یہ بات اگرچہ تاریخ کے مطالعہ سے بھی واضح ہو جاتی ہے؛ تاہم اس بارے میں صریح حدیث بھی موجود ہے۔ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی ایک معروف حدیث ہے کہ الخلافة من بعدي ثلاثون سنة. خلافت میرے بعد تیس سال ہو گی اور اس کے بعد اللہ جس کو چاہیں گے، بادشاہت عطا کریں گے۔ حضرت سفینہؓ نے پھر کچھ سال شمار کر کے بتائے کہ خلفاے اربعہ کے اتنے اتنے سال ہوں گے۔[1]

اس جزوی گنتی میں جانے کے بجائے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال کب ہوا؟ آپ کا انتقال ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوا ہے۔ ربیع الاول ۴۱ھ تک تیس سال بنتے ہیں۔ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی ہے۔ جب آپؓ زخمی ہوئے تو لوگوں نے کہا

---

۱۔ یہ حدیث مختلف مجموعہ ہاے حدیث میں موجود ہے۔ **صحیح ابن حبان** کے الفاظ ہیں: "أَخْبَرَنَا أَبُو يَعْلَى، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ الْجَوْهَرِيُّ، أَخْبَرَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُمْهَانَ، عَنْ سَفِينَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: «الْخِلَافَةُ بَعْدِي ثَلَاثُونَ سَنَةً، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا»، قَالَ: أَمْسِكْ خِلَافَةَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَنَتَيْنِ، وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَشْرًا، وَعُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ، وَعَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سِتًّا، قَالَ عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ: قُلْتُ لِحَمَّادِ بْنِ سَلَمَةَ: سَفِينَةُ الْقَائِلُ: أَمْسِكْ؟ قَالَ: «نَعَمْ»." (ابوحاتم محمد بن حبان الدارمی، **صحیح ابن حبان**، ت، شعیب الارنؤط، كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة، رجالهم ونسائهم بذكر أسمائهم رضوان الله عليهم أجمعين، ذكر الخبر الدال على أن الخليفة بعد عثمان بن عفان كان علي بن أبي طالب رضوان الله عليهما ورحمته وقد فعل، رقم: ۶۹۴۳۔ علامہ البانیؒ نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔)

کہ آپ اپنے بعد حضرت حسنؓ کو اپنا نائب بنا دیں۔ حضرت علیؓ نے انکار فرمایا اور کہا کہ یہ بات میرے بعد لوگ مشورے سے طے کریں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اللہ کو آپ کیا جواب دیں گے؟ فرمایا کہ یہی کہ دوں گا کہ جس طرح اللہ کے نبی نے کسی کو مقرر نہیں کیا، میں نے بھی نہیں کیا۔ (اور یہ روایت غالباً شیعہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔) حضرت علیؓ کی یہ بات اس امر کی دلیل بھی ہے کہ امامت منصوص نہیں ہوتی۔ حضرت علیؓ بھی لوگوں کے مقرر کرنے سے بنے ہیں۔ بعد میں لوگوں نے مشورے سے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آخر یہ ہوا کہ ربیع الاول ۴۱ھ میں (تقریباً چھ مہینے بعد) حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جو بات چیت آخر میں جا کر چلی، وہ پایۂ تکمیل تک پہنچی اور ربیع الاول ۴۱ھ میں حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کر لی۔ اس کے بعد باقاعدہ طور پر حضرت معاویہؓ کا دور شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت سے حضرت معاویہؓ بھی اہل السنت والجماعت کے نزدیک امیر المؤمنین ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال سے لے کر اس مرحلے تک کل تیس سال بنتے ہیں۔ حضرت حسنؓ کا دور عبوری دور ہے یا حضرت علیؓ کے دور کا تکملہ اور تتمہ ہے، اس لیے حضرت حسن کے دور کو مستقل شامل کیے بغیر کہہ دیا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین چار ہیں۔ خلافتِ رحمت اور خلافت علی منہاج النبوۃ میں حضرت علیؓ کا دور بھی جب شامل ہوا تو وہ بھی خلیفۂ برحق اور خلیفہ راشد ہیں۔

حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر جو صلح کی ہے، اس کے بارے میں بخاری کی ایک مشہور حدیث ہے کہ إن ابني هذا سيد کہ میرا یہ بیٹا سید ہے اور اللہ اس کے

ذریعے مسلمانوں کے دو طائفوں کے درمیان صلح کروادے گا۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ نے جو صلح کی ہے، وہ کوئی غلط کام نہیں ہے، بلکہ وہ کام ہے جس پر رسول اللہ ﷺ پیشگی شاباش دے کر گئے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ اس وقت خلیفہ تھے۔ حضرت حسنؓ، تسلسل ہیں حضرت علیؓ کا، لہٰذا حضرت علیؓ کی خلافت کا برحق ہونا حدیثِ صلح سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

## شاہ عبد العزیزؒ اور صلحِ حسن کی حکمت

بلکہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے تو صلحِ حسن کی حکمت ہی اس چیز کو بیان کیا ہے کہ حضرت حسن کو اندازہ تھا کہ خلافت کا دور ختم ہو چکا ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

> اور جب دین کے تمام ظاہری و باطنی امور میں کسی کو پیشوائی نصیب ہو تو وہ خلافتِ حقہ کا مستحق ہے۔ یہ خلافت صرف پانچ [ابو بکر، عمر، عثمان، علی، حسن[2]] حضرات میں منحصر ہے۔ اہلِ سنت کا یہ خیال محض ہوائی نہیں ارشاداتِ قرآنی پر مبنی ہے، مثلاً وَجَعَلْنَاهُم أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا ---۔ اور اس کی وجہ کہ

---

[1] - یہ حدیث متعدد مجموعہ ہائے حدیث میں موجود ہے۔ بخاری میں ایک طویل روایت ہے جس میں اس کے الفاظ اس طرح آتے ہیں کہ ابو بکرہ نے کہا: "رَأَيْتُ رَسُولَ اللهَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى المِنْبَرِ وَالحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ إِلَى جَنْبِهِ، وَهُوَ يُقْبِلُ عَلَى النَّاسِ مَرَّةً، وَعَلَيْهِ أُخْرَى وَيَقُولُ: «إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَّ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ المُسْلِمِينَ»." (**صحيح البخاري**، كتاب الصلح، باب قول النبيﷺ للحسن بن علي رضي الله عنهما، رقم: ۲۷۰۴۔)

[2] ۔ یعنی ابتدائی دور کے اعتبار سے۔ وگرنہ تو مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام بھی امام ہوں گے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کیوں کی جب کہ اس وقت آپ کی ذاتِ عالی صفات استحقاقِ امامت میں مخصوص وممتاز تھی، اور فریقِ ثانی کی بے استحقاقی [امامت کے لیے نہ کہ ریاست کے لیے] واضح اور روشن تھی، یہ ہے کہ حضرت امامؓ واقف تھے اور جانتے تھے کہ خلافت کا زمانہ ختم ہوا، کٹ کھنے بادشاہوں [ملک عضوض] کا وقت آپہنچا اور ظلم و ستم گری کا دور دورہ شروع ہوا۔ اگر میں بھی ریاست کا مدعی بنارہا اور تقدیر میں چوں کہ ہے نہیں تو ریاست انتظام پذیر نہ ہوگی اور فتنہ وفساد، غضب وعناد رونما ہوں گے اور امامت کے جو مصالح ملحوظ و منظور ہونے چاہییں، وہ یکسر فوت ہو جائیں گے؛ لہٰذا مجبوراً ریاست وسیادت سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور امورِ ریاست حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیے جو اس وقت ریاست کی اہلیت رکھتے تھے۔ ۔ ۔ چوں کہ مدتِ امامت جو پورے تیس سال تھی وہ ختم ہو چکی آپ نے اس کو ترک ہی فرمادیا۔[1]

## خاندانِ نبوت کی اطاعت و قیام دونوں میں اسوہ اور امام احمدؒ کا ایک ارشاد

اس صلح کے بعد ایک مرتبہ پھر اس خاندان نے اطاعتِ امیر کرکے دکھائی۔ اس خاندان کی سیرت کے دونوں پہلو بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں: اطاعت کرنا بھی اور اطاعت کرانے کے لیے یا باطل حکومت کا بطلان واضح کرنے کے لیے نکلنا بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مسلسل بے مثال اطاعت اور تعاون کا نمونہ قائم کرکے دکھایا، حضرت حسنؓ کی صلح سے لے کر حضرت معاویہؓ کے انتقال تک بھی

---

۱- **تحفہ اثنا عشریہ** اردو، ۳۵۹۔ شاہ صاحب کی اس عبارت کے بعض پہلو ممکن ہے از قبیلِ نکتہ محسوس ہوں، تاہم یہ واضح ہے کہ خلافت کے زمانی فریم کو وہ پوری طرح تسلیم کرتے ہیں۔ تیس سالہ دور محض حکومت کا نہیں امامت اور دینی پیشوائی کا بھی ہے، یہ لوگ سیاسی معاملات میں اسوہ اور حجت ہیں۔

اپنے عمل سے بتایا کہ ایک حکومتِ منعقدہ کے ساتھ کیسے چلا جاتا ہے، حالاں کہ اس دور میں بہت سی باتوں کو یہ حضرات درست نہیں سمجھتے تھے، لیکن اطاعت کر کے دکھائی۔ اب یہ لوگ جب اپنی اطاعت کرانے کی بات کر رہے ہیں، تو یقیناً کسی مضبوط بنیاد پر کھڑے ہو کر ہی کر رہے ہیں۔ اسے مشکوک اور تماشا سا بنا دینا بد ترین قسم کی فکری دھاندلی ہے۔ یہ بات صرف میں نہیں کہہ رہا، امام احمد بن حنبلؒ سے بھی اس سے ملتی جلتی بات نقل کی گئی ہے۔ ابن عساکر نے اپنی **تاریخ دمشق** میں امام احمد سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی بھی "الراشدین المہدیین" میں سے ہیں۔ (غالباً وہ حدیثِ عرباض کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حضرات میں سے ہیں جن کی سنت سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے۔) اس کے بعد انھوں نے دوسری روایت امام احمدؒ سے نقل کی کہ ان سے پوچھا گیا خلافت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، یعنی خلفا کون کون ہیں؟ امام احمدؒ نے فرمایا ابو بکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم۔ کسی نے عرض کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حضرت سفینہ کی حدیث کے پیش نظر کہہ رہے ہیں (جس میں ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال ہو گی)۔ امام احمدؒ نے فرمایا یہ بھی ہے، مگر اس کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے کہ میں نے علیؓ کو ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے زمانے میں دیکھا کہ وہ خود کو نہ امیر المؤمنین کہلاتے ہیں، نہ خود جمعہ اور حدود قائم کرتے ہیں، یعنی رعایا کے ایک فرد کی طرح زندگی گزارتے ہیں، پھر عثمانؓ کی شہادت کے بعد دیکھتا ہوں وہ سب کچھ کر رہے ہیں، یعنی بطور حاکم زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی اطاعت کروا رہے ہیں تو اس سے میں سمجھا کہ حضرت علیؓ کے لیے اب وہ چیز ثابت ہو چکی ہے جو پہلے ثابت نہیں تھی۔[1]

---

1- ابن عساکر کی عبارت یہ ہے:

ثم ذكر حديث حماد بن سلمة عن سعيد بن جمهان عن سفينة في الخلافة فقال أحمد: عليٌ عندنا من الراشدين المهديين ، وحماد بن سلمة عندنا ثقة، وما نزداد فيه كل يوم إلا بصيرة. . .قال: سمعت الميموني يعني عبد الملك بن عبد الحميد يقول: سمعت أحمد بن حنبل وقيل له إلى ما تذهب في الخلافة قال: أبو بكر وعمر وعثمان وعليّ. قال: فقيل له: كأنك تذهب إلى حديث سفينة؟ قال: أذهب إلى حديث سفينة، وإلى شئ آخر ، رأيت عليا في زمن أبي بكر وعمر وعثمان لم يتسمَّ أميرَ المؤمنين ولم يُقم الجمعة والحدود ، ثم رأيته بعد قتل عثمان قد فعل ذلك ، فعلمت أنه قد وجب له في ذلك الوقت ما لم يكن قبل ذلك.(*ابو القاسم على بن الحسن بن ہبۃ اللہ المعروف بابن عساکر*، **تاریخ دمشق**، *عمرو بن غرامۃ العمروی*، حرف العین، عثمان بن عفان،(*بیروت*: دار الفکر،۱۹۹۵ء)،۳۹:۵۰۸۔

# عہدِ علوی کے داخلی قتال

باقی خلفا کے زمانے میں بیرونی قتال ہوئے ہیں، حضرت علیؓ کے زمانے میں داخلی قتال زیادہ ہوا ہے۔ اس کو حضرت علیؓ کے ایک نقص کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ نقص نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی ایک اُسوہ ہے، کیوں کہ اندورونی طور پر بھی فوجی کارروائیاں ہمیشہ کرنی پڑتی ہیں، بغاوتیں کچلنی پڑتی ہیں، اس کے لیے بھی کوئی نمونہ ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ ممکن نہیں تھا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کوئی بغاوت کرتا تو وہ محض باغی نہ ہوتا، بلکہ وہ تو کافر ہو جاتا، اس لیے فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ باغیوں کے معاملے میں سب سے بڑا اسوہ اور نمونہ حضرت علیؓ ہیں اور بُغاۃ کے معاملے میں تقریباً تمام احکام فقہانے حضرت علیؓ کے طرزِ عمل ہی سے مستنبط کیے ہیں۔ (1)

---

1 - یہاں علامہ ابنِ تیمیہؒ کے **مجموع الفتاوی** کا ایک اقتباس وضاحت کے لیے پیش کرنا مناسب ہوگا۔وہ کہتے ہیں:وهذا أيضا يدل على صحة إمامة علي ووجوب طاعته وأن الداعي إلى طاعته داع إلى الجنة والداعي إلى مقاتلته داع إلى النار - وإن كان متأولا - وهو دليل على أنه لم يكن يجوز قتال علي وعلى هذا فمقاتله مخطئ وإن كان متأولا أو باغ بلا تأويل وهو أصح (القولين لأصحابنا وهو الحكم بتخطئة من قاتل عليا وهو مذهب الأئمة الفقهاء الذين فرعوا على ذلك قتال البغاة المتأولين... المنصوص عن أحمد تبديع من توقف في خلافة علي وقال: هو أضل من حمار أهله وأمر بهجرانه ونهى عن مناكحته ولم يتردد أحمد ولا أحد من أئمة السنة في أنه ليس غير علي أولى بالحق منه ولا شكوا في ذلك.(یہ (حدیثِ عمارؓ) حضرت علیؓ کی امامت اور ان کی اطاعت کے واجب ہونے پر بھی

علامہ سرخسیؒ نے **المبسوط** میں بھی اور **شرح السیر الکبیر** میں بھی جہاد کی فرضیت اور اس کے تا قیامت باقی رہنے کی بات کرتے ہوئے سفیان بن عیینہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالی کی چار تلواریں ہیں: ایک رسول اللہ ﷺ کی تلوار ہے جس سے مشرکین کے ساتھ قتال کیا گیا اور ایک ابو بکرؓ کی تلوار ہے جس سے مرتدین کے خلاف قتال کیا گیا۔ تیسری تلوار حضرت عمرؓ کی ہے جس کے ذریعے اہل کتاب اور مجوس یعنی قیصر و کسری کی سلطنت سے قتال ہوا اور چوتھی تلوار علیؓ کی ہے جس سے باغیوں وغیرہ کے خلاف قتال کیا

---

دلالت کرتی ہے اور یہ کہ ان کی اطاعت کی طرف دعوت دینے والا جنت کی طرف دعوت دینے والا ہے اور ان کے ساتھ قتال کی طرف دعوت دینے والا دوزخ کی طرف دعوت دینے والا ہے، اگرچہ وہ تاویل کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ قتال جائز نہ تھا اور اسی بنیاد پر ان کے ساتھ قتال کرنے والا خطا پر ہے، اگرچہ تاویل ہی کیوں نہ کرے یا تاویل کے بغیر باغی ہے۔ یہ ہمارے اصحاب کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول ہے اور یہی حکم ہے اس شخص کے غلطی پر ہونے کا جس نے علی سے قتال کیا۔ یہی ائمۂ فقہا کا مذہب ہے جنھوں نے اس مسئلے پر تاویل کنندہ اہلِ بغاوت کے ساتھ قتال کرنے پر تفریع کی ہے۔ (بعض دوسرے شاذ مواقف ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں) امام احمد بن حنبلؒ سے یہ بات صریح طور پر منقول ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کے معاملے میں توقف کرنے والے کو بدعتی قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے: ایسا شخص اپنے گدھے سے بھی گیا گزرا ہے۔ آپ نے ایسے شخص سے دور رہنے اور اس سے نکاح کا معاملہ کرنے سے منع فرمایا۔ وہ اور ائمۂ اہلِ سنت میں سے کوئی بھی اس بات میں متردد یا شک میں مبتلا نہیں ہے کہ حضرت علی سے زیادہ (خلفاے ثلاثہ کے بعد) خلافت کا حق دار کوئی نہیں تھا۔) (ابو العباس تقی الدین احمد بن الحلیم بن تیمیہ الحرانی(۷۲۸ھ)، **مجموع الفتاوی**،ت، عبدالرحمن بن محمد بن قاسم،(السعودیہ:مجمع الملك فهد، لطباعة المصحف الشریف،۱۹۹۵ء)۴:۴۳۸۔)

گیا۔[1] کتب شافعیہ میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے مشرکین سے جنگ لڑنے کا طریقہ رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا، مرتدین سے جنگ کرنے کا حضرت ابو بکرؓ سے اور باغیوں سے قتال کرنے کا حضرت علیؓ سے حاصل کیا۔[2]

---

۱-**المبسوط**، سرخسی کے کتاب الجهاد کے بالکل شروع شروع میں ہے:

قال النبي - ﷺ - «الجهاد ماض منذ بعثني الله تعالى إلى أن يقاتل آخر عصابة من أمتي الدجال» وقال - صلى الله عليه وسلم - «بعثت بالسيف بين يدي الساعة وجعل رزقي تحت ظل رمحي والذل والصغار على من خالفني ومن تشبه بقوم فهو منهم» وتفسيره منقول عن سفيان بن عيينة - رحمه الله تعالى - قال بعث الله تعالى رسوله - ﷺ - بأربعة سيوف سيف قاتل به بنفسه عبدة الأوثان وسيف قاتل به أبو بكر - رضي الله تعالى عنه - عنه أهل الردة قال الله تعالى {تقاتلونهم أو يسلمون} [الفتح: ١٦] وسيف قاتل به عمر - رضي الله تعالى عنه - المجوس وأهل الكتاب قال الله تعالى {قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله} [التوبة: ٢٩] الآية وسيف قاتل به علي - رضي الله تعالى عنه - المارقين والناكثين والقاسطين وهكذا روي عنه قال «أمرت بقتال المارقين والناكثين والقاسطين» قال الله تعالى {فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله} [الحجرات: ٩]

۲-چناں چہ فقہ شافعی کی کتاب **أسنى المطالب**، ۴:۱۱۱ میں ہے:

(باب قتال البغاة) (قوله: والأصل فيه إلخ) قاتل علي أهل الجمل بالبصرة مع عائشة ثم قاتل أهل الشام بصفين مع معاوية ، ثم قاتل أهل النهروان مع الخوارج، قال الشافعي: أخذ المسلمون السيرة في قتل المشركين من رسول الله -

حضرت علیؓ کے زمانے میں جو قتال ہوئے، اس پہلو سے تو بہر حال افسوس ناک ہیں کہ بہر حال یہ جنگیں مسلمانوں کے درمیان ہوئیں۔ حضرت علیؓ کو بھی افسوس ہوتا تھا، لیکن ان جنگوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کے افسوس ناک ہونے کے باوجود ان میں حضرت علیؓ نہ صرف درست ہیں، بلکہ وہ ان معاملات میں ایک اسوہ ہیں اور مینارِ ہدایت ہیں کہ اگر کوئی ریاست کی رٹ کو چیلنج کر دے تو پھر کیا کیا جائے گا؟ اسی لیے سفیان بن عیینہؒ اس معاملے میں حضرت علیؓ کی تلوار کو اللہ کی تلوار ارشاد فرما رہے ہیں۔ آگے ابن رجب حنبلیؒ کے حوالے سے نقل کیا جائے گا کہ خود حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے سکھایا کہ اہلِ قبلہ کے خلاف قتال کرنا پڑ جائے تو کیسے کیا جائے گا۔ قتالِ خوارج کے بیان میں آئے گا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے ہی فتنے کی آنکھ کو پھوڑا ہے۔ ابو بکر باقلانیؒ کہتے ہیں کہ بڑے بڑے علما نے کہا ہے اگر حضرت علیؓ اپنے مخالفین سے قتال نہ کرتے تو اہلِ قبلہ سے قتال کا طریقہ معلوم نہ ہوتا۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طریقۂ قتال کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے

---

ﷺ – وفي قتال المرتدين من الصديق وفي قتال البغاة من علي، فإنهم كانوا مخطئين في قتاله «لقوله – ﷺ – لعمار قتلتك الفئة الباغية»

[1] - ابو بکر محمد بن الطیب الباقلانی، **تمهيد الأوائل وتلخيص الدلائل** (بیروت: مؤسسة الكتب الثقافية)، ۵۴۷۔ بلکہ قاضی ابو بکر باقلانی تو اس معاملے کو حضرت علیؓ کی خلافت کے دلائل میں شمار کرتے ہیں کہ انھوں نے داخلی جنگوں کے اصول امت کو سکھاے۔ باقلانیؒ حضرت علیؓ کی خلافت کے دلائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم ما ظهر من فقهه وعلمه في قتال أهل القبلة من استدعائهم ومناظرتهم وترك مبادأتهم والنبذ إليهم قبل نصب الحرب معهم وندائه (لا يبدؤوهم بالحرب حتى

تو اس میں جو توازن و اعتدال، خوب صورتی، قدم قدم پر یہ احساس کہ یہ اپنوں سے لڑائی ہے دشمنوں سے نہیں، جیسے امور نکھر کر سامنے آتے ہیں تو آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کام ایک خلیفۂ راشد ہی سے لیا جانا قرینِ حکمتِ الٰہی تھا۔ وگرنہ یا تو یہ سمجھا جاتا کہ اندرونی طور پر طاقت کے استعمال کی کسی حکومت کے لیے گنجائش نہیں یا پھر اس انداز سے طاقت کو استعمال کیا جاتا، جیسے دشمن کے خلاف کیا جاتا ہے۔

اندرونی قتال کا یہ کام کسی قدر حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی کیا ہے، لیکن وہ بہت مختصر تھا، اس لیے ان کا ذکر اس حوالے سے زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ جن لوگوں کے خلاف انھوں نے قتال کیا، ان میں کئی طبقات تھے۔ ایک تو رومیوں کے خلاف رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا بنایا ہوا جیشِ اسامہ بھیج دیا۔ دوسرا قتال مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکاروں کے خلاف ہے۔ یہ بڑا سخت قتال تھا اور بہت سے صحابہ نے قربانیاں دی تھیں۔ تیسرا قتال مرتدین کے خلاف ہے۔ چوتھا گروہ مانعینِ زکاۃ کا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم زکاۃ اپنے طور پر ادا کریں گے، خلیفۂ وقت کو

---

يبدؤوكم ولا يتبع مدبر ولا يجهز على جريح ولا يكبس بيت ولا تهج امرأة) وفي رواية أخرى ولا يكسر بيت وردّه رحالات القوم إليهم وتركِ اغتنام أموالهم وكثرةِ تعريفه وندائه على ما حصل في قبضته من أموالهم وكثرةِ الأمر لابن عباس وغيره بقبول شهادة أهل البصرة وصفين إذا اختلطوا ووضعت الحرب أوزارها والصلاةِ خلفهم وقوله لمن سأل عن ذلك (ليس في الصلاة والعدالة اختلفنا وإنما اختلفنا في إقامة حد من الحدود فصلوا خلفهم واقبلوا شهادة العدول منهم) إلى غير ذلك مما سنَّه من حرْب المسلمين **حتى قال جلة أهل العلم لولا حرب علي لمن خالفه لما عرفت السنة في قتال أهل القبلة.** (نفسِ مصدر، ۵۴۷۔)

زکاۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابو بکرؓ کا یہ قتال باغیوں کے خلاف تھا۔ سرکاری محصولات ادا کرنے سے انکار گویا خود سرکار کا اور اس کی عمل داری کا انکار ہے۔ یہ حکومت کی رٹ کا انکار ہوتا ہے۔ جس دلیل سے حضرت ابو بکرؓ کا قتال درست تھا، اسی دلیل سے حضرت علیؓ کا قتال بھی درست تھا اور یہ قرآن کا حکم ہے: فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ الله.[1]

یہ قتال اس اعتبار سے منفی اور افسوس ناک ہے کہ آپس میں لڑنا پڑ رہا ہے، لیکن اس منفیت کا بوجھ باغیوں پر پڑتا ہے، باغیوں کے خلاف قتال کرنے پر نہیں پڑتا۔ لوگ دونوں کو برابر کھڑا کر دیتے ہیں (یہاں پھر وہی سوال آتا ہے کہ جن سے حضرت علیؓ کے مد مقابل آنے کی غلطی ہوئی، ان کے فعل کی توجیہ یا ان کا عذر کیا ہو گا؟ یہ الگ موضوع ہے، جس پر مختصر بات ہم آخر میں کریں گے۔)

حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے حوالے سے بعض صحابہ کا اتفاق نہ تھا۔ حضرت سعد بن عبادہؓ تو بہت واضح ہیں، حضرت سعد بن عبادہؓ بہت جلیل القدر صحابی ہیں، خزرج قبیلہ کے سردار تھے، بیعت عقبہ میں شریک ہونے والوں میں سے ہیں، یہ وہی سعد ہیں جنھوں نے غزوۂ بدر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے مشورہ مانگنے پر پُر جوش خطاب کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر آپ حکم دیں گے کہ ہم اپنی سواریوں کو سمندر میں ڈال دیں تو ہم ایسا بھی کر گزریں گے۔ روزانہ اصحاب صفہ کی بڑی تعداد کے کھانے کا انتظام کیا کرتے تھے۔ اور بھی بعض صحابہ ہیں، جن کی ذاتی رائے ابتدا میں کچھ اور تھی، لیکن انھوں نے اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا۔ یا تو انھوں نے جمہور کے ساتھ ملتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ کی ہاتھ پر بیعت کر لی یا پھر تنہائی اختیار کر

---

[1] - الحجرات ۴۹:۹۔

لی۔ حضرت سعد بن عبادہؓ کے بارے میں ایک دوسری روایت بھی آتی ہے کہ انھوں نے بیعت نہیں کی اور شام چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا، لیکن حضرت ابو بکرؓ کے خلاف کوئی محاذ نہیں کھڑا کیا۔ حضرت علیؓ نے بھی یہی بات فرمائی تھی کہ اگر ابو بکرؓ و عمرؓ کے خلاف بھی لوگ اس طرح کھڑے ہوتے تو وہ بھی اسی طرح قتال کرتے، میں بھی اسی طریقے پر کھڑا ہوں۔ [1] لیکن یہ حضرت ابو بکرؓ کی خوش قسمتی اور عہدِ رسالت کے قریب ہونے اور معاشرے میں صحابہ کی کثرت اور غیر صحابہ کی قلت کی برکت تھی کہ اگر کسی کی رائے مختلف تھی بھی تو اس نے محاذ نہیں بنایا۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں اگر محاذ بنا تو اس کے پیچھے کچھ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ جو شخصیات سامنے ہیں، ممکن ہے اصل وہ نہ ہوں، بلکہ پس پردہ دیگر لوگ ہوں جن کی حضرت عمرؓ نے آخری خطبے میں نشان دہی کی تھی۔ یہ عنصر موجود تھا، جو اگرچہ چھپا ہوا تھا، لیکن حضرت عمرؓ کو اندازہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ چھپ کر یہ سازشیں

---

۱ - امام احمدؒ کے صاحب زادے عبد اللہ بن احمد کی **كتاب السنة** کی حدیث نمبر:۱۳۲۹ میں حضرت علیؓ کا بصرہ میں دیا گیا ایک خطبہ ہے، روایت کے لفظ یہ ہیں:

قال: «فحمد الله وأثنى عليه وذكر النبيّ ﷺ وما عالج من الناس ، ثم قبضه الله عز وجل إليه ، ثم رأى المسلمون أن يستخلفوا أبا بكر رضي الله عنه ، فبايعوا وعاهدوا وسلموا، وبايعت وعاهدت وسلمت، ورضوا ورضيت، وفعل من الخير وجاهد حتى قبضه الله عز وجل، رحمة الله عليه، واستخلف عمر رضي الله عنه فبايعه المسلمون وعاهدوا وسلموا، وبايعت وعاهدت وسلمت، ورضوا ورضيت، ففعل وفعل من الخير حتى ضرب الإسلام بجرانه رحمة الله عليه، فما بال أبي بكر وعمر يوفى لهما بيعتهما وما بال بيعتي تنكث، فوالله إني لأرجو أن لا أكون دون امرئ منهما»

کر رہے ہوں۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر (رضی اللہ عنہم) تینوں کی رائے حضرت علیؓ کے حق میں ہے، (جیسا کہ گزرا۔) لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ حضرت علیؓ کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کا اپنا رجحان یہ نہیں تھا۔ نیک لوگ بھی بعض اوقات لوگوں کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ جس قسم کے لوگوں کی طرف **صحیح مسلم** کی روایت میں اشارہ کر رہے ہیں، ان پر بعض روایات سے مزید روشنی بھی پڑتی ہے، لیکن اس کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مخلصین کی طرف سے اختیار کیا گیا اگر کوئی موقف درست نہیں تھا تو اس میں ان کے اعذار بھی تھے۔ بہر حال اصولی طور پر جو صورتِ حال بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ کی خلافت منعقد ہو گئی تو شریعت اسلامیہ میں ایک امام عادل کے جو احکام ہیں وہ خود بخود اس پر مرتب ہو جائیں گے۔ اگر کسی کی نظر میں امام کی کوئی پالیسی درست نہیں تو اس کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے، امام سے بات بھی کی جا سکتی ہے لیکن اس کی رٹ چیلنج نہیں کی جا سکتی۔ خاص طور پر جب کہ امام عادل کسی جائز مطالبے کا اصولی طور پر انکار بھی نہ کر رہا ہو۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں پر اشکالات کا نام لے کر ان کے لیے مسائل پیدا کر دینا بالکل غلط اقدام تھا۔ ایسے موقع پر اگر امام عادل ضرورت محسوس کرے تو قتال کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ اہل السنت والجماعت نے نہ صرف یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس نوعیت کے فیصلوں کو درست قرار دیا ہے، بلکہ اسے اس باب میں اسوہ بھی قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان فیصلوں کی جو حیثیت اصولی طور پر بنتی ہے اللہ تعالی کی حکمت ہے کہ متعدد حدیثوں سے بھی وہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر کوئی حدیث نہ ہوتی، تب بھی اہل السنت والجماعت کے مسلمہ اصولوں

کی روشنی میں یہی پوزیشن بنتی ہے اور اسی کی اہل السنت تصریح کرتے چلے آئے ہیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دور ہی چوں کہ الجھاؤ والا ملا ہے، اس لیے اللہ تعالی نے اپنی حکمت کے تحت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں متعدد ارشادات بھی صادر کرادیے۔ انھی میں چند ایک کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

## قتالِ علی کے بارے میں عمومی حدیثیں

حضرت علیؓ کے زمانے کی تین جنگیں بنیادی ہیں، سب سے پہلی جنگ، جنگِ جمل ہے۔ اس کے بارے میں بھی حدیثیں موجود ہیں، دوسری صفین کی جنگ، اس کے بارے میں بھی حدیثیں موجود ہیں اور آخری جنگ نہروان کی ہے جو خوارج کے خلاف لڑی گئی، اس کے بارے میں تو بہت حدیثیں موجود ہیں۔ یہاں پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کے بارے میں عمومی حدیثیں ذکر کی جائیں گی، اس کے بعد متعین واقعات کے بارے میں جو حدیثیں ہیں، وہ ذکر ہوں گی۔

### ۱- لیکن وہ جو تا گانٹھنے والا ہے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کو گانٹھنے کے لیے جوتا دیا ہوا تھا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص ایسا ہے کہ وہ تم سے قرآن کی تاویل پر قتال کرے گا، جس طرح کہ تم نے قرآن کی تنزیل پر قتال کیا۔ یعنی تم نے جو قتال کیا ہے وہ اس بات پر ہے کہ قرآن کو مانو، یہ اللہ کی کتاب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف کے انداز میں بات فرمائی کہ ایک خوش قسمت شخص ایسا ہے جو تم سے قرآن کی تاویل (یعنی اس کی تشریح اور امر واقعہ پر منطبق کرنے کے معاملے) پر قتال کرے گا۔ اس پر صحابہ میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ کون ایسا ہو سکتا ہے! حضرت ابوبکرؓ

نے عرض کیا، یارسول اللہ، میں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تو ان سے بھی کہا کہ نہیں، بلکہ وہ جو جوتا ٹھیک کر رہا ہے، وہ ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک صاحب بڑی خوشی سے حضرت علیؓ کو یہ بات بتانے گئے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات فرمائی ہے تو ایسا لگا کہ حضرت علیؓ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔[1] اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، امام احمد، ابو یعلی اور حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اس حدیث کو بخاری و مسلم کے معیار کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، ہیثمی نے **مجمع الزوائد** میں ابو یعلی والی روایت کے بارے میں کہا: رجاله رجال الصحيح. اس کے سارے راوی صحیح والے راوی ہیں، **مسند أحمد** والی رویات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہیثمی نے کہا ہے اس کے راوی صحیح والے ہیں سوائے فطر بن

---

[1] - حاکم کی **المستدرك على الصحيحين** کے الفاظ ہیں: "عن أبي سعيد رضي الله عنه قال: كنا مع رسول الله ﷺ، فانقطعت نعله فتخلف علي يخصفها فمشى قليلا ثم قال: «إن منكم من يقاتل على تأويل القرآن كما قاتلت على تنزيله» فاستشرف لها القوم، وفيهم أبو بكر وعمر رضي الله عنهما، قال أبو بكر: أنا هو، قال: «لا» قال عمر: أنا هو، قال: «لا، ولكن خاصف النعل» - يعني عليا - فأتيناه فبشرناه، فلم يرفع به رأسه كأنه قد كان سمعه من رسول الله صلى الله عليه وسلم ." (**المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة رضي الله عنهم «أما الشيخان فإنهما لم يزيدا على المناقب، وقد بدأنا في أول ذكر الصحابي بمعرفة نسبه ووفاته، ثم بما يصح على شرطهما من مناقبه مما لم يخرجاه فلم أستغن عن ذكر محمد بن عمر الواقدي وأقرانه في المعرفة»، وأما قصة اعتزال محمد بن مسلمة الأنصاري عن البيعة، رقم: ۴۶۲۱۔) حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث، بخاری و مسلم کی شرائط پر صحیح ہے۔

خلیفہ کے لیکن وہ بھی ثقہ ہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ نسائی کی **السنن الکبری** اور **صحیح ابن حبان** کی روایت میں فطر بن خلیفہ کی جگہ یہ حدیث اعمش روایت کر رہے ہیں۔ البانی نے **سلسلة الأحاديث الصحيحة** میں اسے مسلم کے معیار پر صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے: فالحديث صحيح لا ريب فيه.[1]

شاہ عبد العزیز دہلویؒ نے اسے ان احادیث میں ذکر کیا ہے جن سے شیعہ، حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل ثابت کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس سے خلافت بلا فصل تو ثابت نہیں ہوتی، البتہ اہل السنت کا یہ موقف ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اپنی لڑائیوں میں حق پر تھے؛ وہ فرماتے ہیں:

> اہل سنت کا مسلک بھی یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنی لڑائیوں میں حق بجانب تھے اور آپ کے مخالفین خطاکار۔ اس حدیث میں وہ کون سی وجہ ہے جس سے آپ کی امامت بلا فصل ثابت ہو سکے۔۔۔ ہاں اس کو اہل سنت کے مذہب کی دلیل ٹھہرائیں تو درست ہو گا، کیوں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیرؓ کسی وقت امام ہوں گے اور تاویلِ قرآن پر قتال کریں گے اور ان کے قتال کا وقت معلوم ہے کہ کب تھا الخ۔[2]

---

۱-**سلسلة الأحاديث الصحيحة**، رقم:۲۴۸۷۔

۲-شاہ عبد العزیز محدث دھلوی، **تحفۂ اثنا عشریہ**، اردو ترجمہ، خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری، (کراچی: دارالاشاعت، س ن)، ۴۴۱۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کی داخلی جنگوں کو عموماً ایک برائی نہیں تو کم زوری اور نامناسب بات بناکر پیش کیا جاتا ہے، لیکن حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم داخلی قتال ہی پر حضرت علیؓ کی تعریف کررہے ہیں۔

ابھی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی جو حدیث بیان ہوئی، اسی سے ملتے جلتے مضمون کی ایک حدیث خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جسے امام ترمذیؒ نے بھی اپنی جامع میں روایت کیاہے اس کی سند بالکل صحیح ہے، اس کے بارے میں امام ترمذی نے کہاہے: هذا حديث حسن صحيح غريب. ترمذی کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر مشرکین کی طرف سے کسی بات پر ناجائز اصرار کیا گیاتو آپ نے فرمایا کہ قریش کے لوگو! باز آجاؤ، وگرنہ میں تمھاری گردنیں اڑانے کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے بارے میں آزمایا ہوا ہے۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور بعض دیگر حضرات نے پوچھاوہ کون ہے یارسول اللہ۔ آپ نے فرمایاوہ جوتا گانٹھنے والا، اور آپ نے حضرت علیؓ کو اپنا جوتا گانٹھنے کے لیے دیاہوا تھا۔[1] تقریباًیہی واقعہ حضرت ابو ذر غِفَاری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، اس میں یہ لفظ ہیں کہ میں ایسے شخص کو بھیجوں گاجو میرے جیساہی ہوگا،[2] لیکن دونوں روایتوں کے سیاق سے معلوم ہوتاہے کہ دونوں واقعے الگ الگ

---

[1]- **سنن الترمذي**،أبواب المناقب،باب مناقب علي بن أبي طالب رضي الله عنه،يقال وله كنيتان: أبو تراب، وأبو الحسن،رقم:۳۷۱۵۔

[2] - احمد بن حنبل، **فضائل الصحابة**،رقم: ۹۶۶ ؛ احمد بن شعیب بن علی الخراسانی النسائی، **السنن الكبرى**،كتاب الخصائص،ذكر قوله ﷺ: «علي كنفسي»،رقم:۸۴۰۳۔

ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابو ذرؓ کی روایت میں قریش کو ایک دھمکی ہے جسے پورا کرنے کی نوبت نہیں آئی، لیکن اس میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارادہ حضرت علیؓ ہی کو بھیجنے کا تھا، اس میں حضرت علیؓ کے لیے شان دار الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں، مثلاً امتحن الله قلبه للإيمان اور رجلا كنفسي. حضرت ابو سعید خدری کی روایت میں مستقبل کے حوالے سے پیش گوئی ہے کہ علی اس طرح کا قتال کریں گے۔ پہلے تو میری یہ رائے تھی کہ دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں، لیکن بعد میں امام طحاوی کی **شرح مشكل الآثار** میں مل گیا کہ انھوں نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے اور یہ کہ یہاں جن سے قتال کی بات ہو رہی ہے وہ خوارج ہیں۔ امام طحاوی کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں حدیثوں کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔ امام طحاوی کی عبارت کا کچھ حصہ یہ ہے:

فتأملنا هذا الحديث، فوجدنا ما فيه غير ما في الحديث الذي ذكرنا في الباب الذي قبل هذا الباب، فكان ما في الحديث الذي ذكرناه في الباب الذي قبل هذا الباب من الوعيد من أجل المعنى الذي سأله رسول الله صلى الله عليه وسلم مَن سأله إياه من قريش الذين جاءوه من مكة، وكان في الحديث الذي ذكرنا في هذا الباب وعْدُ رسولِ الله ﷺ الذي وعده ممن ذكر فيه أنه يقاتل بعده على تأويل القرآن، كما قاتل هو صلى الله عليه وسلم على تنزيله، وكان ما في هذا الحديث وعد لا بد من أن يكون وقد كان مما أجراه الله

على يد علي بن أبي طالب رضي الله عنه من قتاله أهل التأويل الذين ذكرهم في كتابه.[1]

## ۲- ناکثین، قاسطین اور مارقین سے قتال کا حکم

اسی طرح ایک اور حدیث ہے۔ اس حدیث کی سندیں الگ الگ تو اتنی قوی نہیں ہیں، جس کی وجہ سے بعض حضرات نے اس حدیث کو ضعیف بھی قرار دیا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی یہ حدیث قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا یا حضرت علیؓ کو خبر دی تھی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے یہ الفاظ نقل کیے کہ أمرني رسول الله بقتال الناكثين والقاسطين والمارقين. مجھے رسول اللہ ﷺ نے تین طبقوں سے قتال کا حکم دیا۔ الناکثین سے مراد بیعت کی خلاف ورزی کرنے والے ہیں۔ یہ تعبیرات اتنی دقیق ہیں کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہی کا ارشاد ہو گا۔ الناکثین کا اشارہ ہے جنگِ جمل کی طرف۔ ان حضرات نے پہلے بیعت کی، پھر خلاف ورزی کی۔ اس کی کیا وجوہ تھیں؟ اس پر بھی روایات ہیں، جس پر بات کی جائے گی۔ القاسطین سے اہلِ صفین کی طرف اشارہ ہے۔ قاسط انحراف کرنے والے کو کہتے ہیں۔ انھوں نے حضرت علی کی خلافت کو قبول ہی نہیں کیا، حالاں کہ آپ صحیح خلیفہ تھے اور شام کا علاقہ بھی خلافتِ اسلامیہ کا حصہ تھا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ مرکز میں ایک حکومت بن

---

۱- ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، **شرح مشکل الآثار**، ت، شعیب الارنؤوط (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۹۹۴ء)، ۱۰:۲۴۰۔

جائے اور پنجاب کا وزیرِ اعلی کہے کہ میں اسے وزیرِ اعظم نہیں مانتا۔ المارقین سے اشارہ خوارج کی طرف ہے جن کے ساتھ نہروان کے مقام پر قتال ہوا۔

ہمارے بھائی مفتی محمد مجاہد صاحب شہیدؒ[1] نے مشاجرات کے موضوع پر ایک استفتا کا مفصل جواب لکھا ہے، جس میں بڑی تفصیل یہ بتایا گیا ہے کہ اہل السنت والجماعت کا واضح موقف ہے کہ حضرت علیؓ ہی ان حروب میں صواب پر تھے، اور اس بات کو بیان کرنا نہ تو اہل السنت کے کف لسان والے اصول کے خلاف ہے اور نہ ہی دوسری طرف کے صحابہ کی شان میں بے ادبی ہے۔ اس فتوے پر اس وقت کے بڑے اہل فتوی کی تصدیقات بھی موجود ہیں۔اس میں انھوں نے اس حدیث کی بھی مفصل تخریج کی ہے۔ یہ حدیث مختلف صحابہ سے مروی ہے، جن میں حضرت علیؓ کے علاوہ ابو ایوب انصاریؓ (جو حضرت علیؓ کے بہت زیادہ حامیوں میں سے ہیں، بلکہ بدریین اور اہلِ بیعتِ رضوان کی بہت بڑی تعداد حضرت علیؓ کے ساتھ تھی)، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

پہلے جوامع الکلم سافٹ ویئر کا ذکر ہوا تھا۔ اس میں اس حدیث کی تخریج میں ۶۳ سندوں کا ذکر ہے۔ اس کے مطابق ایک کی سند بالکل صحیح ہے، دو کی حسن ہے اور اٹھارہ

---

[1] - مولانا مفتی محمد مجاہدؒ ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ اگلے روز ہندوستان اور پاکستان کے مابین جنگ شروع ہو گئی جس کی مناسبت سے ان کا نام محمد مجاہد رکھا گیا۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی کتاب **نقوشِ رفتگاں** میں ان کو آسمانِ علم و فضل کا ابھرتا ہوا ستارہ کہا ہے۔ مولانا کی کتاب **اسلام اور جدید معیشت و تجارت** (جو دینی مدارس میں داخلِ نصاب ہے۔) کو مولانا مفتی محمد مجاہدؒ ہی نے تحریری شکل میں محفوظ کیا۔ محض بتیس سال کی عمر میں انھیں دہشت گردوں نے شہید کر ڈالا۔ اس کم سنی میں اپنی ذہنی اور فکری پرواز میں انھوں نے شیوخ کی منازل طے کر لی تھیں۔ خوش درخشید والے شعلۂ مستعجل بود۔ (مختصر تذکرے کے لیے دیکھیے: مولانا محمد تقی عثمانی، **نقوشِ رفتگاں**، ۴۰۹-۴۱۵۔)

ضعیف ہیں اور چوبیس شدید الضعف ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ اسانید پر بحث بہت لمبا کام ہے۔ تاہم بطور مثال چند طرق پیش کیے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ حدیث کو موضوع یا ضعفِ شدید والا کہنا درست نہیں۔ مثلاً ہیثمی ایک جگہ فرماتے ہیں: رواه البزار والطبراني في **الأوسط** وأحد إسنادي البزار رجاله رجال الصحيح، غير الربيع بن سعيد ووثقه ابن حبان. ہیثمی کے بقول بزار کی ایک سند کے سارے راوی صحیح کے ہیں، بس ایک راوی میں جہالت پائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ جہالت کوئی ایسی قدح نہیں ہے جس کا ازالہ تعددِ طرق سے بھی نہ ہو سکے۔ اسی طرح طبرانی کی **المعجم الکبیر** کی ایک روایت ہے، اس کے پہلے راوی ہیں محمد بن ہشام المستملی انھیں خطیب بغدادی نے ثقہ قرار دیا ہے، دارقطنی نے کہا ہے لا بأس به. ابن العماد حنبلی نے **شذرات الذهب** میں کہا ہے من كبار شيوخ الطبراني. اس سے اوپر ہیں عبدالرحمن بن صالح، اکثر نے انھیں ثقہ اور قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ ان پر جو زیادہ سے اعتراض ہے وہ تشیع کا ہے، لیکن اہل بدعت کے بارے میں راجح رائے یہ ہے کہ اگر ان پر جھوٹ کا الزام نہ ہو یا یہ خطرہ نہ ہو کہ اس نے اپنے مذہب کی تائید میں حدیث گھڑ لی ہوگی تو اس کی حدیث قابل قبول سمجھی جاتی ہے۔ خود صحاحِ ستہ اور بالخصوص صحیحین میں ایسے لوگوں کی بکثرت روایات موجود ہیں۔ ان کا تشیع کیسا ہے؟ اس کے بارے میں حافظ جمال الدین مزیؒ کی دو باتیں نقل کرنا کافی ہو گا۔ امام احمد بن حنبلؒ ان کے پاس استفادے کے لیے جایا کرتے تھے۔ کسی نے کہا وہ تو رافضی ہے۔ امام احمدؒ نے کہا: ایک شخص جو خاندانِ نبوت میں سے کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے، کیا میں اس سے یہ کہوں کہ یہ محبت نہ کرو؟ وہ ثقہ ہے۔ یحیی بن معین نے ایک مرتبہ کہا:

يقدم عليكم رجل من أهل الكوفة ،يقال له : عبد الرحمن بن صالح ، ثقة، صدوق ، شيعى ، لأن يخر من السماء أحب إليه من أن يكذب فى نصف حرف. وہ قابلِ اعتبار اور سچے ہیں، البتہ شیعہ ہیں، لیکن آسمان سے گرنا پسند کرلیں گے آدھے حرف میں بھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ان سے اوپر ہیں عائذ بن حبیب، انھیں بھی امام احمد اور یحیی بن معین سمیت اکثر نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ان پر بھی زیادہ سے زیادہ تشیع کا الزام ہے، لیکن جیسا کہ بتایا کہ یہ کسی کی حدیث رد کرنے کی وجہ نہیں بن سکتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی خلاصہ یہ نکالا ہے کہ صدوق رُمي بالتشيع، سچے ہیں، بس تشیع کا الزام ان پر دھرا گیا ہے۔ پھر یہ زیدی شیعہ تھے جو ویسے بھی اہل السنت کے زیادہ قریب ہیں۔ ان سے اوپر ہیں بکیر بن ربیعہ، یہ اس سند کے واحد راوی ہیں جن کے حالات مجھے نہیں مل سکے۔ ان سے اوپر ہیں یزید بن قیس، یہ بھی ثقہ ہیں۔ کسی نے ان پر جرح نہیں کی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ان کے بارے میں اقوال کا خلاصہ نکالا ہے: ثقة فقيه وكان يرسل. یہ روایت کرتے ہیں ابراہیم نخعی سے، وہ علقمہ سے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے: أمر رسول الله ﷺ بقتال الناكثين والقاسطين والمارقين. اس میں اگرچہ حضرت علیؓ کا صراحتاً نام نہیں ہے، لیکن بظاہر حضرت علیؓ کے زمانے میں ہونے والے قتال ہی مراد ہیں، بلکہ خود ابن مسعودؓ کی بعض دیگر روایتوں میں (وہ بھی میرے نزدیک حسن ہیں، مثلا **مسند الشاشي** کی ایک روایت) میں صراحتاً حضرت علیؓ کا نام بھی آتا ہے۔ ابن مسعودؓ کے علاوہ تو تمام صحابہ کی مرویات میں بالاتفاق حضرت علیؓ کا نام ہے۔ بہر حال محض تسلی کے لیے طبرانی کی ایک سند بطور مثال منتخب کی ہے، وگرنہ اس گفت گو میں ہمارا اصل طے شدہ طریقہ یہ ہے

کہ اسانید کی تفصیل میں جانے کے بجاے ائمہ فن کے صادر کردہ احکام نقل کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔ اب سند کا جو اجمالی جائزہ یہاں پیش ہوا ہے کیا اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیث انتہائی ضعیف یا موضوع ہے؟ پوری سند میں اک راوی بکیر بن ربیعۃ مجہول ہیں، ان کے بارے میں بھی **مسند الشاشي** کی روایت میں کہا گیا ہے: وکان ثقة،[1] تاہم اسے نظر انداز بھی کر دیں، تب بھی راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ایسا شدید ضعف پیدا نہیں ہوتا کہ تعددِ طرق سے بھی اس کی تلافی نہ ہو سکے۔

شاید ابن تیمیہؒ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے، لیکن ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی جلالتِ قدر کے باوجود ان سے اس طرح کے موضوعات میں جذباتی فیصلے صادر ہو جاتے ہیں، جس کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان کے بعد آج کل عرب دنیا میں کچھ حضرات اسماء الرجال سطحی انداز سے کھول کر اس طرح کی حدیثوں کے آپریشن کرنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے اس حدیث کے موضوع ہونے یا اس میں ضعفِ شدید ہونے کا دعوی کیا ہے، لیکن در حقیقت یہ دعوی قابل اعتنا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ضعف کا دعوی کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ضعف بھی سند کے اعتبار سے ہوگا، سند کا ضعف ہمیشہ متن کے ضعف کو مستلزم نہیں ہوتا۔

اس حدیث کو مختلف شعبوں کی بڑی شخصیات نے بلا تردد استدلال کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلا حافظ ابنِ حجرؒ نے اس حدیث کو دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے، اگرچہ اس کی تفصیلی طور پر تخریج نہیں کی، صرف مختصراً چند حوالے دیے ہیں، لیکن بغیر کسی کلام کے جس طرح

---

[1]-ابو سعید الہیثم بن کلیب الشاشی، **المسند**، ت، محفوظ الرحمن (مدینہ منورہ: مکتبة العلوم والحكم) رقم: ۳۲۲۔

انھوں نے اسے ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ بھی اس حدیث کو ثابت سمجھتے ہیں۔ ضعفِ شدید نہیں ہے، حافظ کی نظر میں اس حدیث کا اتنا ثبوت ضرور ہے کہ یہ قابلِ استدلال ہے۔ جو حضرات حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کو جانتے ہیں، وہ یہ سمجھ سکتے ہیں ضعفِ شدید کے باوجود کسی حدیث پر سے ان کا خاموشی سے گزر جانا تقریباناممکن یابعید ہے، چہ جائے کہ اس سے استدلال بھی کریں۔ **فتح الباري** کے مقدمے میں تو انھوں نے تصریح کی ہے کہ جن حدیثوں پر انھوں نے سکوت اختیار کیا ہے وہ حسن ضرور ہیں، اس کے علاوہ علامہ شوکانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے **التلخيص الحبير** وغیرہ میں بھی ان کے سکوت سے استدلال کیا ہے۔ یہاں تو حافظ سکوت ہی نہیں استدلال کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ فقہِ شافعی میں علامہ رافعیؒ کی ایک کتاب **الشرح الكبير** ہے۔اس کی احادیث کی تخریج کے لیے ابن الملقن نے ایک کتاب **البدر المنير في تخريج الأحاديث والأثار الواقعة في الشرح الكبير** کے نام سے لکھی ہے۔ یہ بہت بڑے شافعی عالم ہیں۔ ان کی اس کتاب کی تلخیص حافظ ابنِ حجرؒ نے کی ہے۔ انھوں نے علامہ رافعیؒ کا قول نقل کیا ہے(اور تقریباً تمام فقہا اور محدثین یہی بات کہ رہے ہیں۔) "ثَبَتَ أن أهل "الجمل" و"صفين" و"النهروان بُغَاةٌ"، اس پر حافظ ابنِ حجرؒ کہتے ہیں: هُوَ كَمَا قَالَ،یعنی رافعی کی یہ بات درست ہے اور دلیل کے طور پر یہی حدیث نقل کی ہے: "أُمِرْت بِقِتَالِ النَّاكِثِينَ وَالْقَاسِطِينَ وَالْمَارِقِين".[1]

---

۱ - ابوالفضل احمد بن علی بن محمد بن احمد بن حجر العسقلانی، **التلخيص الحبير في تخريج أحاديث**

اس کے علاوہ مثلاً فقہاے حنفیہ میں سے سرخسیؒ کی ایک عبارت تو پہلے ہی گزر چکی ہے جس میں سفیان بن عیینہ کا قول نقل کیا گیا تھا کہ اللہ کی چار تلواریں ہیں، وہاں بھی اس حدیث کا ذکر تھا۔ اس کے علاوہ خوارج اور باغیوں کے خلاف قتال کی بحث میں جہاں سرخسیؒ یہ بتا رہے ہیں کہ اس باب میں اصل نمونہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں وہاں فرماتے ہیں:

والإمام فيه علي - رضي الله عنه - فقد قام بالقتال، وأخبر أنه مأمور بذلك بقوله-رضي الله عنه-أمرت بقتال المارقين، والناكثين، والقاسطين.[1] یہی عبارت عبدالعزیز بخاریؒ نے **شرح اصول بزدوی** میں نقل کی ہے۔[2]

ابن رجب حنبلی معروف فقہا اور محدثین میں سے ہیں، ان کا ایک رسالہ ہے: **الحكم الجديرة بالإذاعة من قول النبي ﷺ بعثت بالسيف بين يدي الساعة**، اس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا جہاد اور تلوار کے ساتھ مبعوث ہونا ثابت فرمایا اور اس سلسلے میں ایک حدیث کی تشریح کی ہے۔ اسی میں یہ بھی ثابت فرماتے ہیں کہ یہ تلوار جہاں بیرونی دشمنوں کے خلاف استعمال ہوتی ہے، وہیں اندرونی طور پر بھی اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سفیان بن عیینہؒ کا چار تلواروں والا وہی قول نقل کیا جو پہلے سرخسیؒ کے حوالے سے نقل ہو چکا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

---

**الرافعي الكبير** (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۹۸۹ء)، ۴:۱۲۶، ۱۲۷۔

۱- محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی، **المبسوط** (بیروت: دار المعرفة، ۱۹۹۳ء)، ۱۰:۱۲۴۔

۲- عبدالعزیز بن احمد بن محمد علاء الدین البخاری، **كشف الأسرار شرح أصول البزدوي** (دار الكتاب الإسلامي)، ۴:۳۴۰۔

وسيفٌ عَلَى أهل البغي، وهو المذكور في سورة الحجرات ولم يسلّ رسول الله - ﷺ - هذا السيف في حياته، وإنما سلَّهُ عليٌّ- رضي الله عنه- في خلافته. وكان يقول: "أنا الَّذِي علمت الناس قتال أهل القبلة". وله -ﷺ- سيوف أُخر، منها: سيفه عَلَى أهل الردة وهو الَّذِي قال فيه: «مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» وقد سله أبو بكر الصديق - رضي اللهَّ عنه- من بعده في خلافته عَلَى من ارتد من قبائل العرب. ومنها: سيفه عَلَى المارقين، وهم أهل البدع كالخوارج. وقد ثبت عنه الأمر بقتالهم مع اختلاف العُلَمَاء في كفرهم. وقد قاتلهم عَلَى -رضي الله عنه- في خلافته مع قوله: "إنهم ليسوا كفار". وقد روي عن النبي -ﷺ- أمره بقتال المارقين والناكثين والقاسطين. وقد أحرق عليٌّ طائفة من الزنادقة، فصوّب ابن عباس قتلهم، وأنكر عليه تحريقهم بالنار، فَقَالَ علي: "ويح ابن عباس، إنه لبَحَّاث عن الهنات."[1]

اہل بغاوت کے خلاف تلوار؛ یہ سورۂ حجرات میں مذکور ہے۔اس تلوار کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں نہیں سونتا، بلکہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں سونتا ہے۔وہ فرماتے تھے کہ میں وہ شخص ہوں جس نے لوگوں کو اہل قبلہ کے خلاف قتال کا طریقہ سکھایا ہے۔رسول اللہ ﷺ کی اور تلواریں بھی ہیں، جن میں سے آپ کی اہل ارتداد کے خلاف تلوار ہے اور اسی کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جو

---

١-زین الدین عبد الرحمٰن بن احمد بن رجب، **مجموع رسائل الحافظ ابن رجب الحنبلي**، ت، ابو مصعب طلعت بن فؤاد الحلوانی(الفاروق الحديثية للطباعة والنشر)،١:٢٢٩۔

اپنے دین کو بدل سے، اسے قتل کر ڈالو۔ اس تلوار کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی خلافت کے دوران میں مرتد ہونے والے عرب قبائل کے خلاف سونتا۔ انھی تلواروں میں سے ایک تلوار اطاعت سے نکل جانے والوں (اہلِ بدعت جیسے خوارج) کے خلاف تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے خلاف قتال ثابت ہے، جب کہ علما کا ان کے کفر کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے اپنی خلافت کے دور میں قتال کیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ وہ کافر نہیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں اطاعت سے نکل جانے والوں، عہد توڑنے والوں اور انحراف کرنے والوں کے خلاف قتال کی بات مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زندیقوں کے ایک گروہ کو جلا دیا تھا۔ ان کے قتل پر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی تصویب کی تھی البتہ ان کے آگ میں جلانے کو پسند نہیں کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر کہا تھا: ابنِ عباس پر تعجب ہے، وہ کم زوری کی کھوج میں رہتا ہے۔

امام غزالی **المستصفی في علم الأصول** میں اس پر بحث کر رہے ہیں کہ امر کی ایک صورت یہ ہے کہ صحابی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امر ہی کا صیغہ نقل کر رہے ہوں، مثلاً یہ کہ آپ نے فرمایا افعلوا کذا، فلاں کام کرو۔ دوسری طرف صورت یہ ہے کہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صیغہ اور آپ کے الفاظ نقل نہیں کر رہے بلکہ آپ کی بات کو اپنی تعبیر میں بیان کرتے ہیں کہتے ہیں أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بكذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فلاں کام کا امر فرمایا۔ اس دوسری صورت میں یہ امکان ہو سکتا تھا کہ کوئی کہے چونکہ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صیغہ نقل نہیں کیا اس لیے ممکن ہے آپ کی بات سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہو اس لیے اس تعبیر پر امر والے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ امام غزالی

اس خیال کی نفی کرتے ہوئے صحابی کا یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا صیغہ امر ہی کی طرح ہے، اس کی مثال بلکہ دلیل دیتے فرماتے ہیں:

ولهذا يجب أن يقبل قول الصحابي " نسخ حكم كذا " وإلا فلا فرق بين قوله " نسخ " وقوله " أمر "، ولذلك قال علي - رضي الله عنه - وأطلق: " أمرت أن أقاتل الناكثين والمارقين والقاسطين " ولا يظن بمثله أن يقول أمرت إلا عن مستند يقتضي الأمر.[1]

امام الحرمین کی اصول فقہ پر مشہور کتاب ہے: **البرهان في أصول الفقه**؛ اس کی شرح ایک معروف مالکی فقیہ الابیاری نے **التحقیق والبیان** کے نام سے لکھی ہے جو چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، انھوں نے بھی تقریباً یہی بات لکھی ہے۔

امام ابو نعیم اصفہانی (م: ۴۳۰) کی معروف کتاب ہے **حلية الأولياء**، جس میں انھوں نے اولیاے امت کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب میں ہر شخصیت کا عنوان قائم کرتے ہوئے اس کی چند اہم صفات و خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے حالات کا ذکر ان کے تفصیلی اوصاف سے شروع کرتے ہیں، اس میں وہ یہ بھی فرماتے ہیں[2]: فَقَّاءُ

---

۱ - ابو حامد الغزالی، **المستصفی**، ت، عبدالسلام عبدالشافعی (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۹۹۳ء)، ۱۰۴۔

۲-ابونعیم الاصبہانی، **حلية الأولياء وطبقات الأصفياء** (مصر: دار السعادة)، ۱:۶۱۔

عيون الفتن، ووُقي من فنون المحن، فدفعَ الناكثين، ووضع القاسطين، ودمغ المارقين.

گویا پانچویں صدی کے اوائل تک حضرت علیؓ کا یہ وصف کہ وہ ناکثین، قاسطین اور مارقین سے مقابلہ کرنے والے ہیں مشہور ہو چکا تھا، اور یہ کہ یہ وصفِ کمال ہے کوئی کم زوری یا خامی نہیں ہے جس کے لیے معذرت خواہی کی جائے۔ یہاں حضرت علی کو فقاء عیون الفتن (فتنوں کی آنکھیں پھوڑنے والا) کہا گیا ہے۔ آگے خوارج کے تذکرے میں آئے گا کہ حضرت علیؓ نے خود اپنے بارے میں فرمایا ہے أنا فقأتُ عينَ الفتنة، یعنی میں نے فتنے کی آنکھ پھوڑی ہے۔

بہر حال اس طرح کی اور بہت سی عبارتیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اہل السنت کے ہاں اس حدیث کا استدلال کے سیاق میں حوالہ دیا جاتا رہا ہے، جن میں فقہا و محدثین بھی شامل ہیں۔ کبھی کسی کو اس کے متن میں عجیب بات محسوس نہیں ہوئی۔

## شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی خاص رائے

شاہ عبد العزیز دہلویؒ نے بھی اس حدیث کو محل استدلال میں پیش کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اسے قابلِ استدلال سمجھتے ہیں۔ شاہ صاحب کا حوالہ یہاں اس لیے دیا کہ انھوں نے جس سیاق میں یہ حدیث پیش کی ہے اور ایک خاص معاملے پر اپنا خاص موقف پیش کیا ہے، اس کا یہاں ذکر فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ شیعہ کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جو طعن کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک طعن یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے بعض کبارِ صحابہ پر بعض معاملات میں سختی کی۔ پہلے تو شاہ صاحبؒ نے اس طعن کے شیعہ مزاج اور ان کے اصولوں کے مطابق جوابات دیے، اس کے بعد شاہ صاحبؒ کے ارشاد کے مطابق اہل السنت کا جو اصل جواب ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بعد میں پیش آنے واقعات کا اللہ تعالی نے وافر علم عطا فرمایا تھا۔ جن حضرات سے متعلق وہ واقعات تھے ان کو رسول اللہ ﷺ نے بطور خاص کچھ باتیں بتائیں اور کچھ ہدایات ارشاد فرمائیں۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آپ نے مرض الوفات میں بلا کر تنہائی میں بات فرمائی۔ اس دوران میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا اور ان کی زبان سے اللہ المستعان، اللہ المستعان نکل رہا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اس طرح کی متعدد حدیثیں ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس نصوص قطعیہ اور رسول اللہ ﷺ کی وصایا موجود تھیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان پر ثابت قدم رہے۔ اس سے آگے شاہ صاحبؒ نے جو گفت گو فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جن صحابہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سختی کی، وہ در حقیقت رسول اللہ ﷺ کے اسی دیے گئے علم کے پیش نظر تھی اور بطور امیر المؤمنین آپ کو اس کا اختیار حاصل تھا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز اسلمی، حسان بن ثابت، مسطح وغیرہ رضی اللہ عنہم پر حد جاری کی۔ غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے تین صحابی جن میں بدری بھی تھے، کا بائیکاٹ فرمایا۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے صحابہ پر حدود نافذ کیں، اسی طرح سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی بطور امیر المؤمنین اسی طرح کے اقدامات کیے۔ جن حضرات کے خلاف اس طرح کے اقدامات ہوئے، ان کی جلالتِ قدر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا (اگر چہ یہ حضرات بھی اپنی جگہ نیک نیت تھے)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور کے بارے میں ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا علم تھا۔ یہ ساری گفت گو کرنے کے

بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اہل السنت کے نزدیک اس معاملے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہو بہو وہی ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ یعنی جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی پیش گوئیوں کے مطابق حالات کو سمجھ کر عمل کر رہے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ایسا ہی کر رہے تھے؛ شاہ صاحب کے الفاظ ہیں:

*وحال عثمان درین امرہم نزد اہل سنت مثل حال حضرت امیرست قدم بقدم، کہ اورا نیز جناب پیغمبر وصیت فرمودہ بود یا علی لایجتمع الأمة علیک بعدی وانک تقاتل الناکثین والقاسطین والمارقین، ای علی جمع نخواہد شد امت بر ریاست تو بعد از من، وہر آئینہ جنگ خواہی کرد با عہد شکنان، وبی انصافان واز دین بیرون شوندگان، ووقتیکہ حضرت امیر سریر آرای خلافت راشدہ پیغمبر شد بقدر مقدور در تسکین فتنہ ودفع مخالفان کہ طلحہ وزبیر وام المؤمنین عائشہ صدیقہ ویعلی بن امیہ وابو موسی اشعری ودیگر صحابہ کرام بودند کوشش وسعی فرمود واز قتل وجنگ وجدال باک فرمود، ہرچند تقدیر مساعد نہ شد وانتظام امور خلافت صورت نہ بست.*[1]

اور اہل السنت کے نزدیک حضرت عثمانؓ کا حال اس معاملے میں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص بتائی ہوئی ہدایات پر عمل کرنے میں) حضرت علیؓ والا تھا۔ حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ امت تم پر مجتمع نہیں ہوگی (یعنی کچھ لوگ تمھاری عمل داری اور اطاعت میں نہیں آئیں گے)

---

۱ - **تحفہ اثنا عشریہ فارسی** (لکھنو: مطبع نامی نول کشور)، ۵۰۸۔

> اور تمھیں عہد توڑنے والوں، بے انصافی کرنے والوں اور دین سے نکلنے والوں سے قتال کرنا پڑے گا۔ جب حضرت علیؓ، رسول اللہ ﷺ کی نیابتِ راشدہ کی مسند پر فائز ہوئے تو حضرت طلحہ، زبیر، ام المؤمنین، یعلی بن امیہ، ابو موسی اشعری اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو روکنے، فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے جنگ وجدال سے بھی گریز نہیں کیا، اگرچہ تقدیر مددگار نہیں تھی، اس لیے سارے علاقے خلافت میں پروے نہیں جاسکے۔

اس کے بعد پھر شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چوں کہ ان دونوں بزرگوں کے پاس رسول اللہ ﷺ کے صریح ارشادات متحقق تھے، اس لیے ان کے لیے کسی کی قرابت یا صحبت کے لحاظ پر رسول اللہ ﷺ کا امر فائق تھا۔

**مصنف ابن ابي شيبة**، **مسند إسحاق بن راهويه** وغیرہ متعدد کتابوں میں حضرت ام سلمہؓ سے ایک روایت ہے، جسے حاکم نے **المستدرک** میں اور ذہبی نے **تلخیص** میں صحیح قرار دیا ہے۔ **مسند أبي يعلى** کے محقق حسین سلیم اسد نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مرض الوفات میں رسول اللہ ﷺ بار بار پوچھ رہے تھے، علی آ گئے؟ علی آ گئے؟ -بظاہر آپ نے حضرت علیؓ کو کسی کام کے لیے بھیجا ہوا تھا- جب حضرت علی آئے تو تو ہمیں اندازہ ہوا کہ آپ ان سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ ہم باہر دروازے کے پاس آ گئے، حضرت علی رسول اللہ ﷺ پر جھکے ہوئے تھے، اور آپ ﷺ حضرت علیؓ سے سرگوشی کے انداز میں بات فرما رہے تھے۔[1]

---

۱- ابن ابی شیبہ کے لفظ یہ ہیں:

شاہ صاحب کی بعض تعبیرات ایسی ہو سکتی ہیں جو میرے ناقص خیال میں اس قابل ہیں کہ انھیں نرم کیا جا سکتا ہے، تاہم بحیثیتِ مجموعی جو بات وہ فرما رہے ہیں وہ اہم ہے۔ ایک یہ کہ ان دونوں بزرگوں کے سامنے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ایسی باتیں تھیں جن پر وہ عمل کر رہے تھے اور وہ خاص انھی حالات سے متعلق تھیں۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحب بھی یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ ناکثین، قاسطین اور مارقین سے قتال کرنا حضرت علیؓ کو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وصیت تھی۔

## واقعۂ جمل اور حدیث نبوی

اب تک حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کے قتالوں سے متعلق عمومی حدیثیں تھیں۔ اب ایک نظر متعین واقعات کے بارے میں آنے والی حدیثوں پر نظر ڈال لیتے ہیں۔ سب سے پہلے جمل کا

---

عن أم سلمة، قالت: والذي أحلف به إن كان عليٌّ لأقرب الناس عهدا برسول الله ﷺ، قالت: عُدنا رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يوم قبض في بيت عائشة، فجعل رسول الله ﷺ غداة بعد غداة يقول: «جاء علي؟» مرارا، قالت: وأظنه كان بعثه في حاجة، قالت: فجاء بعدُ فظننا أن له إليه حاجة، فخرجنا من البيت فقعدنا بالباب، فكنت من أدناهم من الباب، قالت: فأكب عليه علي فجعل يساره ويناجيه، ثم قبض من يومه ذلك، فكان أقرب الناس به عهدا.(**مصنف ابن أبي شيبة**، كتاب الفضائل،فضائل علي بن أبي طالب،رقم:٣٢٠٦٦۔)

نیز ملاحظہ ہو: **مسند أبي يعلى**،مسند أم سلمة، رقم:٦٩٣٤، ٦٩٦٨؛ **المستدرك على الصحيحين**،كتاب معرفة الصحابة، وأما قصة اعتزال محمد بن مسلمة الأنصاري عن البيعة،رقم:٤٦٧١۔

واقعہ۔ یہ واقعہ کیسے ہوا؟ اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، لیکن اس میں جاننے کی جو بات ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں حضرت علیؓ کی مدمقابل بڑی شخصیات تین ہیں اور تینوں بہت عظیم شخصیات ہیں، بلکہ عظمت کے پہاڑ ہیں۔ حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم؛ طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ شوریٰ میں سے ہیں۔ ان حضرات کا بصرہ کے قریب اجتماع ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں تشریف لے گئے۔ اس بات کے امکانات تھے کہ بات چیت کے ذریعے غلط فہمیاں دور ہو جائیں، لیکن بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا اور فریقین کے درمیان قتال ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو غلبہ حاصل ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دونوں طرف سے جان کی بازی ہارنے والے حضرات کے لیے اچھے الفاظ فرمائے اور کہا کہ دونوں طرف سے شہید ہونے والے جنتی ہیں۔ یہی بات آپ نے صفین کے بعد بھی فرمائی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گروپ کے کس شخص نے کہا قتلانا في الجنة وقتلاهم في النار، ہماری طرف سے مرنے والے جنت میں اور دوسری طرف سے مرنے والے دوزخ میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تردید فرمائی اور فرمایا قتلانا في الجنة وقتلاهم في الجنة، دونوں طرف سے مرنے والے جنتی ہیں۔ بہر حال واقعات کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں پیش کرنا یہاں اصل موضوع ہے۔

## حضرت عائشہ، طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کا رجوع

ان کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان میں سے خاص طور پر دو کا اپنے موقف سے رجوع ثابت ہے اور یہ ان حضرات کی عظمت ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں شاہ عبد العزیزؒ اور کئی دوسروں نے لکھا ہے کہ انھیں اپنے خروج پر

بعد میں ندامت رہی، بلکہ علامہ ذہبیؒ کی **سیر أعلام النبلاء** میں حضرت ام المؤمنین کے حالات میں ایک عبارت تو اس طرح ہے کہ

> فَإِنَّهَا نَدِمَتْ نَدَامَةً كُلِّيَّةً، وَتَابَتْ مِنْ ذَلِكَ، عَلَى أَنَّهَا مَا فَعَلَتْ ذَلِكَ إِلاَّ مُتَأَوِّلَةً، قَاصِدَةً لِلْخَيْرِ، كَمَا اجْتَهَدَ طَلْحَةُ بنُ عُبَيْدِ اللهِ، وَالزُّبَيْرُ بنُ العَوَّامِ، وَجَمَاعَةٌ مِنَ الكِبَارِ - رَضِيَ اللهُ عَنِ الجَمِيْعِ.[1]

> اور حضرت عائشہ اس پر مکمل طور پر نادم رہیں اور انھوں نے اس سے توبہ کرلی تھی، علاوہ ازیں انھوں نے یہ سب کچھ اپنے خیال میں دلیل کے مطابق کیا تھا اور اس میں ان کا مقصد بھی خیر ہی تھا (اس لیے توبہ نہ بھی کرتیں تب بھی یہ غلطی ان کے لیے مؤاخذے کا باعث نہیں تھی)، جیسا کہ حضرت طلحہ، زبیر اور دوسرے بڑے لوگوں اجتہاد کیا نے کیا اللہ سب سے راضی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس ندامت کی وجہ کچھ احادیث بھی تھیں۔ اس کی طرف بعد میں آتے ہیں۔

علامہ عبد القاہر بغدادیؒ کی عقائد اور فرق کے تعارف پر ایک بڑی مشہور کتاب ہے **الفرق بين الفرق**۔ یہ اہل السنت والجماعت کے عقائد کی معتبر کتابوں میں سے ہے۔ اس میں ایک فصل ہے جس میں ان امور کا بیان ہے جن پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔ (الْفَصْل الثَّالِث من فُصُول هَذَا الْبَاب فِي بَيَان الاصول الَّتِي اجْتمعت عَلَيْهَا اهل السّنة)۔ اس میں کہتے ہیں: وَقَالُوا بامامة على فِي وقته وَقَالُوا بتصويب على فِي

---

۱ - شمس الدین ابو عبد اللہ الذہبی، **سیر أعلام النبلاء** (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۹۸۵ء)، ۲: ۱۹۳۔

حروبه بِالْبَصْرَةِ وبصفين وبنهروان وَقَالُوا بأن طَلْحَة وَالزُّبَيْر تابا ورجعا عَن قتال علي.[1](اہلِ سنت اپنے وقت میں حضرت علیؓ کی امامت کے قائل ہیں، نیز وہ بصرہ، صفین اور نہروان کے مقامات پر ہونے والی لڑائیوں میں حضرت علیؓ کے صواب پر ہونے کے قائل ہیں۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ طلحہ اور زبیر تائب ہو گئے تھے اور حضرت علیؓ کے قتال سے رجوع کر لیا تھا۔) گویا عبد القاہر بغدادی حضرت طلحہ اور زبیر کے رجوع کو اہل السنت کے اصول میں شمار کر رہے ہیں۔

معلوم ہو جانے یا یاد دہانی کے بعد غلطی سے رجوع کر لینا عظمت کی علامت ہے اور نیک اور مخلص انسانوں سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ ام المؤمنین کے بارے میں کئی احادیث موجود تھیں، لیکن ظاہر ہے اللہ کے نبی ﷺ کی پیش گوئیاں تو پوری ہونا تھیں اور پوری ہوئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بعد میں اس کا احساس رہا۔

## ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

اس حوالے سے کئی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے خروج کو رسول اللہ ﷺ نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

### ۱-حدیثِ حوأب

مثلاً حدیث حوأب کے نام ایک مشہور حدیث ہے کہ جب ام المؤمنین بصرہ کی طرف سفر فرما رہی تھیں، راستے میں ایک چشمے کے پاس سے گزر ہوا تو کتے بھونکنے لگے، اُم

---

۱ - عبد القاہر بن طاہر بن محمد البغدادی، **الفرق بين الفرق و بيان الفرقة الناجية**(بیروت: دار الآفاق الجديدة، ۱۹۷۷ء)، ۳۴۲۔

المؤمنین نے پوچھا یہ کون سی جگہ ہے۔ بتایا گیا کہ یہ ماء الحوأب ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ما أظنني إلا راجعة۔ میرا خیال ہے کہ مجھے واپس ہی ہو جانا چاہیے۔ وجہ اس کی یہ بیان فرمائی رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ ازواج مطہرات سے فرمایا کہ تم میں سے کون سی ہے جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔[1] ام المؤمنین کے واپسی کے ارادے سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات اس انداز سے فرمائی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سے نکلنے کی ناپسندیدگی سمجھی۔ اللہ تعالی نے اپنے نبی کی آگے آنے والی پیش گوئیاں پوری کرنی تھیں، اس لیے بعض ساتھیوں نے عرض کیا کہ آپ تو مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے جارہی ہیں۔ شاہ عبد العزیزؒ وغیرہ حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شخص ارد گرد کے چند بدوؤں کو لے آیا اور انھوں نے ام المؤمنین سے کہا کہ اس جگہ کا نام کچھ اور ہے، اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مطمئن ہو گئیں، حالاں کہ وہ جگہ حوأب ہی تھی۔ متعدد علمائے اہل السنت نے یہ روایت لکھی ہے، مجھے اس کی اسنادی حیثیت کا علم نہیں۔ تاہم یہ روایت حضرت عائشہؓ کی

---

۱-یہ حدیث کئی محدثین نے روایت کی ہے، **مصنف ابن أبي شيبة** کے لفظ یہ ہیں:

لما بلغت عائشة بعض مياه بني عامر ليلا نبحت الكلاب عليها فقالت: أي ماء هذا؟ قالوا: ماء الحوأب فوقفت فقالت: ما أظنني إلا راجعة فقال لها طلحة والزبير: مهلا رحمك الله بل تقدمين فيراك المسلمون فيصلح الله ذات بينهم قالت: ما أظنني إلا راجعة إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لنا ذات يوم: كيف بإحداكن تنبح عليها كلاب الحوأب.( **المصنف لابن أبي شيبة**، كتاب الجمل،باب مسير عائشة وعلي وطلحة والزبير،)رقم:۳۷۷۷۱۔

شان کے زیادہ مناسب لگتی ہے کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ جگہ حوأب ہے ہی نہیں، اس لیے وہ آگے جانے کے فیصلے میں زیادہ معذور نظر آتی ہیں۔

یہ حدیث بالکل صحیح ہے حتیٰ کہ علامہ البانیؒ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔ ابن کثیر نے **البداية والنهاية** میں اسے بخاری و مسلم کے معیار کی صحیح کہا ہے۔ ہیثمی نے بھی کہا ہے رجاله رجال الصحيح، سیوطی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔[1] اِس دور میں بھی اس حدیث پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لیے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔

### ۲-مرسلِ طاؤوس

اسی مضمون کی ایک حدیث طاؤوس سے مرسلا بھی مروی ہے، اس کی سند بھی بالکل صحیح ہے۔[2]

---

۱-احمد بن علی بن حجر العسقلانی، **فتح الباري شرح صحيح البخاري**(بیروت: دار المعرفة، ۱۳۷۹ھ)، ۱۳: ۵۵؛ ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر، **البداية والنهاية**، ت، علی شیری (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۹۸۸ء)، ٦: ٢٣٦، عبد الرحمن بن ابو بکر جلال الدین السیوطی، **مناهل الصفا في تخريج أحاديث الشفا**، ت، الشیخ سمیر القاضی (مؤسسة الكتب الثقافية، ۱۹۸۸ء)، ۱۵۲۔

۲-**جامع معمر بن راشد** میں ہے: أخبرنا عبد الرزاق، عن معمر، عن ابن طاوس، عن أبيه، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال لنسائه: «أيتكن تنبحها كلاب ماء كذا وكذا؟» - يعني الحوأب - فلما خرجت عائشة إلى البصرة نبحتها الكلاب،

## ۳-حدیث ابن عباس

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات سے ایک دفعہ [1] فرمایا: أيتكن صاحبة الجمل الأذيب يقتل حولها قتلى كثيرة وتنجو بعد ماكادت. [2] (تم میں سے کون بالوں والے اونٹ والی ہے، جس کے

---

فقالت: ما اسم هذا الماء؟ فأخبروها، فقالت: ردوني فأبى عليها ابن الزبير. (معمر بن ابو عمرو ابو عروۃ البصری، **الجامع (منشور كملحق بمصنف عبد الرزاق)**، ت، حبیب الرحمن الاعظمی (کراچی: المجلس العلمي، ۱۴۰۳ھ)، رقم: ۲۰۳۵۳۔)

۱- مسروق کی حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے کہ سال میں (کم از کم) ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ تمام ازواج مطہرات کے ساتھ اکٹھے پورا دن گزارا کرتے تھے، اس طرح کی باتیں آپ نے اسی موقع پر ارشاد فرمائیں، مثلاً یہ ارشاد کہ میرے بعد تم میں سب سے پہلے اس کا انتقال ہوگا جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ حوأب والی یہ بات بھی اسی موقع پر ارشاد فرمائی۔ (ابو القاسم الطبرانی، **المعجم الأوسط**، رقم: ۶۲۲۶۔

۲- قرطبی اپنی کتاب **التذكرة بأحوال الموتى وأمور الآخرة** میں فرماتے ہیں:

وهذا حديث ثابت صحيح رواه الإمام المجمع على عدالته وقبول روايته الإمام أبو بكر عبد الله بن أبي شيبة، وكذلك وكيع مجمع على عدالته وحفظه وفقهه ، عن عصام وهو ثقة عدل فيما ذكر أبو عمر بن عبد البر في كتاب **الاستيعاب** له، عن عكرمة وهو عند أكثر العلماء ثقة عالم. وهذا الحديث من أعلام نبوته صلى الله عليه وسلم وهو إخباره بالشيء قبل كونه. وقوله [الأذيب] أراد الأذب، فأظهر التضعيف والعجب من القاضي أبي بكر بن العربي كيف أنكر هذا الحديث في

ارد گرد بہت سے لوگ قتل ہوں گے، اور خود بھی بمشکل بچ پائے گی؟) یہ اونٹ خریدا گیا تھا اور اس کو تیار کرنے والے لوگ بنو امیہ میں سے نہیں ہیں، بلکہ یہ بنو مخزوم کے لوگ تھے۔ حضرت عمرؓ نے آخری خطبات میں ایک جگہ ان کا نام لیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو تیار کرنے والوں میں بھی ان کا نام آتا ہے، یہ اس لیے عرض کر دیا کہ بعض لوگ ہر معاملے کی ذمہ داری صرف بنو امیہ کے لوگوں پر ہی ڈال دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ کا اونٹ بہت زخمی ہوا تھا اور محمد بن ابی بکر، جو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، وہ آگے بڑھے اور حضرت علیؓ نے آپؓ کو

---

كتبه. منها في كتاب العواصم من القواصم، وذكر أنه لا يوجد أصلاً ، وأظهر لعلماء المحدثين بإنكاره غباوة وجهلاً، وشهرةُ هذا الحديث أوضح من فلق الصبح وأجلى، وقد رواه أبو عمر بن عبد البر في كتاب الاستيعاب فقال حدثنا سعيد بن نصر قال: حدثنا قاسم بن أصبغ قال: حدثنا محمد بن وضاح قال: حدثنا أبو بكر ابن أبي شيبة، فذكره بسنده المتقدم.(یہ حدیث ثابت اور صحیح ہے جسے امام ابو بکر عبداللہ بن ابو شیبہ (جن کی عدالت اور قبولِ روایت پر اتفاق ہے۔) نے وکیع سے (جن کی عدالت، حفظ اور فقہ پر اتفاق ہے جیسا کہ ابنِ عبدالبر نے کتاب **الاستیعاب** میں ذکر کیا ہے۔)، انھوں نے عصام سے اور انھوں نے عکرمہ (جو اکثر علما کے نزدیک ثقہ اور اہلِ علم ہیں۔) سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث کسی چیز کے وقوع سے پہلے خبر دینے کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی علامات میں سے ہے۔ حدیث کے لفظ "الأذیب" سے الأذب مراد ہے۔ قاضی ابو بکر بن العربی پر تعجب ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں اس حدیث کا انکار کیسے کیا جن میں سے ایک کتاب **العواصم من القواصم** ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث سرے موجود ہی نہیں ہے۔ انھوں نے اس حدیث کا انکار کر کے علمائے محدثین کے لیے غباوت اور جہالت کا اظہار کیا ہے، جب کہ اس حدیث کی شہرت سپیدۂ سحر سے بھی روشن اور واضح ہے۔ ابنِ عبدالبر نے اسے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے۔)

بہت احترام کے ساتھ مدینہ رخصت کیا اور کسی کو یہ ہمت نہیں ہونے دی کہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں کوئی نامناسب لفظ استعمال کرے، حتیٰ کہ، جیسا کہ آگے ہم ذکر کریں گے، حضرت عائشہؓ کو برا بھلا کہنے پر حضرت علیؓ نے سو کوڑے لگوائے۔ ابن عباس کی اس حدیث کو بھی کئی محدثین نے روایت کیا ہے۔ طحاوی کی **مشكل الآثار** کی ایک روایت میں ابن عباس کی حدیث میں بھی اونٹ کے ساتھ ساتھ حوأب کے کتوں کا بھی ذکر ہے۔ کئی حضرات نے ابن عباس کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے **فتح الباري** میں بزار کے حوالے سے یہ حدیث ذکر کر کے کہا ہے: رجاله ثقات. یہی بات علامہ ہیثمی نے **مجمع الزوائد** میں کہی ہے بوصیری نے **إتحاف الخيرة المهرة** میں کہا: رواته ثقات.

### ۴-حدیث ابورافع

حضرت ابورافعؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تمھارے اور عائشہ کے درمیان کوئی معاملہ ہو گا۔ حضرت علیؓ نے حیران پریشان ہو کر پوچھا: میں یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا جی ہاں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ پھر تو میں سب سے بدبخت انسان ہوں گا۔ (اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے کتنی عزت تھی کہ اس پیش گوئی پر انتہائی پریشان ہو گئے) آپ نے فرمایا ایسی کوئی بات نہیں، البتہ جب ایسا ہو تو انھیں امن کی جگہ کی طرف لوٹا دینا۔[1] علامہ ہیثمی اس حدیث کے بارے میں بھی فرمایا: رجاله ثقات.

---

۱- **مجمع الزوائد** کے لفظ ہیں:

حضرت علیؓ نے یہاں جس انداز سے سوال کیا ہے کہ پھر تو میں انتہائی بد بخت ہوں گا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے دل میں حضرت عائشہؓ کے لیے کتنی عزت تھی کہ اس پیش گوئی پر انتہائی پریشان ہو گئے اور اپنی فکر پڑ گئی کہ کہیں میں غلط نہ ہوں۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ حضرت علیؓ کو یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں دوسروں کے خلاف اقدام میں مجھ سے غلطی نہ ہو جائے۔ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے جہاں تلوار استعمال کرنے کا فیصلہ فرمایا، وہ کتنا سوچ سمجھ کر فرمایا ہو گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بس علی یوں ہی تلوار اٹھائے پھرتے تھے۔

یہاں امام طحاویؒ نے ایک اشکال ذکر کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ پچھلی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بالتعیین علم نہیں تھا کہ یہ نکلنے والی کون ہو گی، جب کہ ابورافع کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بالتعیین علم تھا کہ وہ حضرت عائشہ ہوں گی۔ طحاوی نے اس کے جواب میں یہ فرمایا ہے کہ ہو سکتا ہے رسول اللہ ﷺ کو پہلے اجمالی علم دیا گیا ہو کہ آپ کی ازواج میں کوئی ایک ایسی ہو گی، اور بعد میں آپ کو تفصیلی علم دے دیا گیا ہو کہ فلاں ہوں گی۔ اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ طحاوی ان تمام روایات کو ثابت سمجھ رہے ہیں۔ تاہم اصل اشکال کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر آپ نے اجمال اور استفہام کا انداز مناسب سمجھا ہو، اور کسی موقع پر تفصیل کا انداز۔ حضرت علیؓ سے خطاب کرتے

---

عن أبي رافع أن رسول الله - ﷺ - قال لعلي بن أبي طالب: " «إنه سيكون بينك وبين عائشة أمر ". قال: أنا يا رسول الله؟ قال: " نعم ". قال: أنا أشقاهم يا رسول الله؟ قال: " لا، ولكن إذا كان ذلك فارددها إلى مأمنها» ".رواه أحمد، والبزار، والطبراني، ورجاله ثقات.

ہوئے چوں کہ انھیں ہدایت دینی تھی، اس لیے تعیین فرمانا زیادہ مناسب سمجھا ہو یا کلام کے آغاز میں آپ نے اجمال فرمایا، جب بات آگے بڑھی تو آپ نے تعیین بھی فرمادی۔

## ۵-حدیث ام سلمۃ

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک رسول اللہ ﷺ نے امہات المؤمنین میں سے کسی کے خروج کا (بطور پیش گوئی) ذکر کیا تو حضرت عائشہؓ اس پر ہنسیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے حمیراء (حضرت عائشہؓ کا لقب ہے) خیال رکھنا کہیں تم ہی وہ نہ ہو۔ پھر آپ نے حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا جب تمھیں ان پر اختیار ملے تو ان سے نرمی برتنا۔[۱]

---

۱-اس حدیث کو حاکم نے **المستدرک** میں اور بیہقی نے **دلائل النبوة** میں روایت کیا ہے۔ مستدرک حاکم کے لفظ یہ ہیں: عن أم سلمة رضي الله عنها قالت: ذكر النبي ﷺ خروج بعض أمهات المؤمنين، فضحكت عائشة، فقال: «انظري يا حميراء، أن لا تكوني أنت» ثم التفت إلى علي فقال: «إن وليت من أمرها شيئا فارفق بها»۔ ذہبی نے اس کی سند پر صرف اتنا تبصرہ کیا ہے کہ اس کے ایک راوی عبد الجبار بن الورد کی حدیث بخاری و مسلم نے روایت نہیں کی، لیکن اس سے صرف اتنا نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر نہیں ہے۔ ویسے عبد الجبار بن الورد کی اکثر محدثین نے توثیق کی ہے۔ امام بخاری وغیرہ سے صرف اتنا منقول ہے کہ ان سے کبھی کبھار غلطی ہو جاتی ہے۔ خود ذہبی نے انھیں اپنی کتاب **من تكلّم فيه وهو موثق** میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے ان روایت اول تو صحیح ہے و گرنہ حسن سے کم تو بہر حال نہیں ہے۔

### ۶-حضرت حذیفہ

حضرت حذیفہؓ، واقعۂ جمل سے پہلے انتقال کر گئے تھے، لیکن جب حضرت عثمانؓ کے واقعات ہو رہے تھے، اسی وقت حضرت حذیفہؓ نے کہ دیا تھا کہ تمھاری ماں ایک اونٹ پر آئے گی۔[1] یہ بات متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ام المؤمنین اور اونٹ کے آنے کا پیشگی ذکر فرمایا تھا، اسی لیے بیہقی نے معجزاتِ رسول ﷺ پر اپنی مشہور کتاب **دلائل النبوة** میں اسے بھی معجزات میں شمار فرمایا ہے، اس لیے کہ حضرت حذیفہ اس طرح کی بات رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہی فرما سکتے ہیں۔

### ۷-متعدد حضرات کو جمل کا پہلے سے اندازہ تھا

متعدد روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ کوفے میں ایک اونٹ تھا۔ اس میں کوئی خاص بات ہوئی ہو گی تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا یہی وہ اونٹ ہے؟ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ابن

---

۱- مثلاً مستدرک حاکم کے لفظ یہ ہیں:

عن خيثمة بن عبد الرحمن، قال: كنا عند حذيفة رضي الله عنه، فقال: بعضنا: حدثنا يا أبا عبد الله ما سمعت من رسول الله ﷺ، قال: لو فعلت لرجمتموني، قال: قلنا سبحان الله أنحن نفعل ذلك؟ قال: «أرأيتكم لو حدثتكم أن بعض أمهاتكم تأتيكم في كتيبة كثير عددها، شديد بأسها صدقتم به؟» قالوا: سبحان الله ومن يصدق بهذا؟ ثم قال حذيفة: «أتتكم الحميراء في كتيبة يسوقها أعلاجها حيث تسوء وجوهكم» ثم قام فدخل مخدعا.

حاکم نے اس روایت کو بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔

مسعود اور حذیفہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مکالمہ ہوا تو حضرت حذیفہؓ نے کہا نہیں، یہ وہ اونٹ نہیں معه بارقة. اس اونٹ کے ساتھ تلواریں بھی چلیں گی۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی فی الجملہ بعض لوگوں کے ذہنوں میں تھی۔ یہ پیش گوئی پوری ہونی تھی، اس لیے حضرت عائشہؓ واپس نہیں جا سکیں، وكان أمر الله قدرًا مقدورًا.

حضرت عائشہؓ کو یہ امید دلائی گئی تھی کہ آپ کے جانے سے ممکن ہے صلح ہو جائے، ظاہر ہے اس سے اچھی نیت اور کیا ہو سکتی تھی۔ یہ بھی **تحفہ اثنا عشریہ** وغیرہ کے حوالے سے ابھی ذکر کیا گیا کہ حضرت عائشہؓ کو اس جگہ کے نام کے بارے میں بھی غلط بتایا گیا اور کہا گیا کہ یہ اس جگہ کا نام حوأب نہیں ہے، جس سے حضرت عائشہ کا عذر اور واضح ہو جاتا ہے۔ بہر حال حضرت عائشہؓ کی نیک نیتی اور آپ کے عذر میں شک نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم جو متعدد حدیثیں ذکر ہوئیں، جن میں ہر حدیث اکیلی اکیلی بھی قابلِ استدلال ہے، ان کے مجموعے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ خروج حقیتِ امر کے اعتبار سے درست نہیں تھا۔ ان کو اس پر ندامت بھی ہوئی، اور ذہبی کے الفاظ کے مطابق انھوں نے توبہ بھی کی

---

[1] - مثلاً **مجمع الزوائد** ۷:۲۳۷ میں ہے:

وعن عمير بن سعيد قال: كنا جلوسا مع ابن مسعود، وأبو موسى عنده، وأخذ الوالي رجلا فضربه وحمله على جمل، فجعل الناس يقولون: الجمل الجمل. فقال رجل: يا أبا عبد الرحمن، هذا الجمل الذي كنا نسمع. قال: فأين البارقة؟ رواه الطبراني، ورجاله رجال الصحيح.

اور ابنِ عمرؓ سے حضرت عائشہؓ نے شکوہ کیا کہ جب میں جا رہی تھی تو تم نے روکا کیوں نہیں؟ انھوں نے کہا کہ امی جان، میں آپ کو روک تو لیتا، لیکن میں نے دیکھا کہ آپ کے ارد گرد اور لوگ جمع ہیں، اس لیے میں نے کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ حضرت عائشہؓ کے رجوع سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ علی وعائشہ رضی اللہ عنہما کا اختلاف ختم ہو گیا۔

حضرت علیؓ کے خلاف نکلنے والوں میں سب سے مقدس نام ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا ہے۔ اگرچہ طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور اونچے درجے کے صحابہ میں سے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کے حوالے سے جو حیثیت حضرت عائشہؓ کی تھی وہ کسی اور کی نہیں تھی۔ اس لیے کئی لوگوں کو اس معاملے میں تردد حضرت عائشہؓ ہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ سب سے زیادہ حدیثیں بھی حضرت عائشہؓ کے خروج کے بارے میں ہیں۔ ان احادیث کے ذریعے اللہ تعالی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے واضح فرمادیا کہ اس الجھے ہوئے ماحول میں حضرت علیؓ کے مقابلے میں جو بھی نکلا صحت وصواب علی ہی کے ساتھ تھا۔ جب اتنی عظیم شخصیات کا یہ معاملہ ہے تو باقیوں کا تو اور زیادہ واضح ہو گا۔

## حضرت زبیرؓ کا معاملہ

حافظ ابنِ حجرؒ اور دیگر محدثین نے یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا جمل کے دوران میں ایک جگہ آمنا سامنا ہوا۔ حضرت علیؓ نے حضرت زبیرؓ کو ایک حدیث یاد دلائی۔ حدیث یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت علی وزبیر رضی اللہ عنہما آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو انھوں نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا: لتقاتلنه وأنت ظالم له. یعنی تم حضرت علیؓ سے قتال کرو گے اور زیادتی تمھاری ہو گی۔ حضرت زبیرؓ کو یہ حدیث بھول گئی اور بھولنی ہی تھی کہ اس کے بغیر پیش گوئی پوری ہونی نہیں

تھی، الا یہ کہ حضرت زبیرؓ جان بوجھ کر مخالفت کرتے، وہ بھی ظاہر ہے نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت علیؓ نے جب یہ بات کہی تو حضرت زبیرؓ کو یاد آ گیا۔ وہ وہیں سے واپس ہو گئے۔ اس سے ان کا رجوع بھی ثابت ہو گیا اور علی و زبیر رضی اللہ عنہما کا اختلاف بھی ختم ہو گیا۔ وہاں سے وہ نکلے ہی تھے کہ وادی السباع میں عمرو بن جرموز بدبخت نے آپ کو شہید کر دیا۔

اس حدیث کو متعدد حضرات نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے، بعض طرق ضعیف بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اس روایت کے صحیح طرق بھی موجود ہیں۔ حاکم نے **المستدرك** میں کہا ہے کہ یہ بات کہ حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کے لیے اس بات کا اقرار کیا تھا کئی طرق اور روایات سے ثابت ہے۔ ذہبی نے ایک طریق کے بارے میں کہا ہے "فيه نظر" یعنی اس سند پر کلام کی گنجائش موجود ہے، لیکن حاکم ہی کی اگلی روایت کو ذہبی نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے **البداية والنهاية** میں اس مضمون کی ایک مفصل روایت کے بارے میں کہا ہے کہ في هذا السياق كله نظر، اس کے بعد کہا ہے فلاں طریق سے یہ حدیث محفوظ ہے۔[1] ہمارے زمانے میں شیخ البانیؒ نے بھی متعدد طرق ذکر کر کے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ شیخ البانی کا حوالہ اس لیے دیا کہ شیخ کا تعلق جس منہجِ فکر سے ہے، اس میں اس طرح کی روایات کو نقد کی بھٹی سے گزارنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔[2]

---

۱-ابن کثیر، **البداية والنهاية**،۷:۲۴۰۔

۲-**المستدرك على الصحيحين**،كتاب معرفة الصحابة الخ،ذكر مقتل الزبير بن العوام الخ، رقم:۵۵۷؛ نیز تفصیل ملاحظہ ہو: الالبانی، **سلسلة الأحاديث الصحيحة**، رقم:۲۶۵۹۔

حضرات صحابہ کے ان اختلافات کا ختم ہونا رحماء بینھم کے رویے اور مزاج کے زیادہ قریب ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ ہمارے ہاں شیعہ اور سنی حضرات دونوں میں ایسے لوگ ہیں جو اس طرح کے واقعات میں اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ آپس کے اتفاق کے بجائے اختلاف کو ہی نمایاں کیا جائے۔ مثلاً خلافت اور فدک وغیرہ کے معاملات پر ابتدا میں بعض حضراتِ صحابہ کا خلیفۂ اول سے کسی قدر رائے کا اختلاف ہوا، لیکن جب ہم شواہد کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ یہ اختلاف ختم ہو گیا تھا، جس معاملے میں نص سامنے آگئی وہاں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ وغیرہ نے صدیقِ اکبرؓ سے اتفاق کر لیا اور اپنی رائے کو چھوڑ دیا تھا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں تو شیعہ حضرات اصرار کرتے ہیں کہ نہیں، اختلاف موجود رہا ہے اور اب تک موجود ہے۔ اسی طرح یہاں جب ہم کہتے کہ حضرات عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کا حضرت علیؓ سے اختلاف ہوا ضرور تھا، لیکن آخر میں وہ ختم ہو گیا تھا اور سب یک رائے ہو گئے تھے تو یہاں بھی بعض حضرات اہل تشیع والا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اصرار کرتے ہیں کہ ان کا اختلاف ختم نہیں ہوا، ابھی تک معاملہ الجھا ہوا ہے۔ حضرت زبیرؓ کے بارے میں یہ تو طے ہے کہ وہ قتال چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا جنگ میں پلڑا بھاری ہونے کی وجہ سے حضرت زبیرؓ میدانِ جنگ چھوڑ گئے تھے، تاہم یہ عجیب توجیہ ہے۔ ایک شخص جو بدر کا ہیرو ہے، جو اپنے بدن پر بدر اور یرموک میں لگنے والے زخموں کے نشان دکھایا کرتا تھا، وہ جسے مکی دور میں خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا گیا ہے تو اکیلا ہی تلوار لے کر نکل کھڑا ہو، وہ جو حوارِی رسول ﷺ ہے، اس کے بارے میں یہ بات ناقابلِ فہم ہے۔ زبیر کوئی بزدل انسان نہیں ہے، اگر وہ اپنے آپ کو

اس معاملے میں برحق سمجھ رہا ہو تا تو ڈٹ کر کھڑا رہتا۔ واپسی میں راستے میں کسی نے اس حال میں شہید کیا کہ وہ رجوع کر چکے تھے۔[1]

## حضرت طلحہ کا معاملہ

حضرت طلحہ کے بارے میں ایک روایت دوسری بھی ہے کہ جس وقت وہ زخمی پڑے تھے، تو ایک شخص گزرا اور پوچھا کہ علی کے گروہ سے ہو، کہا: جی ہاں! حضرت طلحہ نے فرمایا ہاتھ بڑھاؤ، میں علی کے لیے دوبارہ بیعت کروں۔ اس کے فورا بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت علی نے فرمایا مجھے امید تھی کہ طلحہ میری بیعت کے بغیر دنیا سے نہیں جائیں گے۔ اس روایت کو حاکم نے **المستدرك** میں روایت کیا ہے۔[2] لیکن اس کی سند میں کافی ضعف ہے۔ البتہ متعدد علما نے اسی موضوع پر اہل السنت کی طرف سے بحث کرتے ہوئے حضرت طلحہ کے اس واقعے کو ایک امر ثابت کے انداز میں ذکر کیا ہے۔ مثلاً معروف مفسر علامہ آلوسیؒ کے پوتے نے شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی کتاب **تحفہ اثنا عشریہ** کی عربی زبان میں تلخیص کی ہے، اس میں انھوں نے یہ بات لکھی ہے۔ اسی طرح خود علامہ آلوسیؒ صاحبِ روح المعانی کا ایک رسالہ ہے **الأجوبة العراقية على الأسئلة اللاهورية**، یہ رسالہ ان

---

۱ - علامہ عبد القاہر بغدادی کی **الفرق بين الفرق** کا حوالہ پہلے گزرا ہے۔ اسی میں درج ہے: الزبير قَتله عَمْرو بن حرمون بوادى السبَاع بعد مُنْصَرفه من الحَرْب. (جنگ سے واپسی کے بعد وادیِ سباع میں عمرو بن حرمون نے آپ کو قتل کر دیا۔) (بغدادی، مصدرِ سابق، ۱۰۱۔)

۲ - **المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة الخ، ذكر مناقب طلحة بن عبيد الله الخ، رقم: ۵٦۰۱۔

لوگوں کی تردید میں لکھا گیا ہے جو خود کو کہلاتے تو سنی ہیں، لیکن حضرت معاویہؓ وغیرہ پر سب وشتم کو درست سمجھتے ہیں؛ اس میں وہ فرماتے ہیں۔

وأما طلحة والزبير - رضي الله تعالى عنهما - فلم يموتا إلا على بيعة الإمام كرم الله تعالى وجهه. أما طلحة فقد روى الحاكم عن ثور بن مجزأة أنه قال: «مررت بطلحة يوم الجمل في آخر رمق فقال لي: من أنت؟ قلت: من أصحاب أمير المؤمنين علي - رضي الله عنه - فقال: ابسط يدك أبايعك، فبسطت يدي فبايعني وقال: هذه بيعة علي، وفاضت نفسه. فأتيت عليا - رضي الله عنه - فأخبرته فقال: الله أكبر، صدق الله تعالى ورسوله - ﷺ -، أبى الله سبحانه أن يدخل طلحة الجنة إلا وبيعتي في عنقه»[1]

(جہاں تک طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کا معاملہ ہے تو ان کی موت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ہوئی ہے۔ طلحہ کے بارے میں حاکم نے ثور بن مجزأة سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: جمل کے دن میرا گزر طلحہ پر ان کے آخری سانسوں کے عالم میں ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا: تم کون ہو؟ میں نے کہا: امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ہوں، تو انھوں نے کہا: اپنا ہاتھ بڑھایئے، میں بیعت کرتا ہوں؛ چناں چہ میں نے ہاتھ بڑھایا اور انھوں نے میری بیعت کی اور کہا: یہ علی کی بیعت ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کے بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور انھیں اس کی خبر دی تو انھوں نے کہا: اللہ اکبر! اللہ اور اس کے رسول ﷺ

---

۱ - شہاب الدین محمود بن عبداللہ الالوسی، **الأجوبة العراقية على الأسئلة اللاهورية**(بغداد: مطبعة الحميدية، ۱۳۰۱ھ)، ۳۴۔

نے سچ فرمایا۔ اللہ کی چاہت یہی تھی کہ طلحہ اس حال میں خُلد آشیاں ہوں کہ میری بیعت کا قلادہ ان کی گردن میں ہو۔)

تاہم علامہ آلوسیؒ نے یہاں جس روایت کا حوالہ دیا ہے یہ وہی روایت ہے جس کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس میں سند کے اعتبار سے شدید ضعف ہے۔ البتہ حضرت طلحہ کے اس طرح سے دوبارہ بیعت کی یہ بات قرینِ قیاس اس لیے ہے کہ حضرت طلحہ کے زخمی ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مروان بن الحکم نے یہ کہہ کر ان پر تیر چلایا تھا کہ (نعوذ باللہ) حضرت طلحہ بھی قاتلینِ عثمان میں سے ہے۔ چناں چہ یہ تیر آپ کے گھٹنے میں لگا اور وہی آپ کی شہادت کا سبب بنا۔ اس واقعے کو درست مان لیں تو ظاہر ہے کہ حضرت طلحہ کو جب پتا چلا ہو گا کہ جو مجھے یہاں لے کر آیا ہے، وہی مجھے مار بھی رہا ہے تو اس معاملے کو دیکھ کر رائے تو بدلی ہو گی۔ اگرچہ آج کل بعض حضرات مروان کی طرف حضرت طلحہ کو تیر مارنے کی بات سے شدت سے انکار کرتے ہیں، ہمیں زیادہ تفصیل سے اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے ہم اس پر زیادہ اصرار تو نہیں کرتے؛ تاہم ہیثمی نے اس سلسلے کی ایک روایت کے بارے میں کہا ہے: رجاله رجال الصحيح.[1] اسی طرح ذہبی نے **تلخیص المستدرک** میں

---

[1]- وعن قيس بن أبي حازم قال: رأيت مروان بن الحكم حين رمى طلحة يومئذ بسهم فوقع في عين ركبته، فما زال يسبح إلى أن مات. رواه الطبراني، ورجاله رجال الصحيح.( **مجمع الزوائد**، كتاب المناقب، باب مناقب الزبير بن العوام، رقم: ١٤٨٢٢۔)

بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔[1] حافظ ابن حجر عسقلانی نے الإصابة میں اس مضمون کی کم از کم دو روایتوں کو صراحتاً سنداً صحیح قرار دیا ہے۔[2]

---

[1]- **المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة،باب ذكر مناقب طلحة بن عبيد الله، رقم: ۵۵۹۰۔

[2]- **الإصابة في تمييز الصحابة** میں حضرت طلحہ کے تذکرے میں ہے:

وروى ابن عساكر من **طرق متعددة** أن مروان بن الحكم هو الّذي رماه فقتله منها. وأخرجه أبو القاسم البغويّ **بسند صحيح** من الجارود بن أبي سبرة قال: لما كان يوم الجمل نظر مروان إلى طلحة فقال: لا أطلب ثأري بعد اليوم، فنزع له بسهم فقتله. وأخرج يعقوب بن سفيان **بسند صحيح**، عن قيس بن أبي حازم أنّ مروان بن الحكم رأى في الخيل فقال: هذا أعان على عثمان، فرماه بسهم في ركبته، فما زال الدم يسيح حتى مات،. أخرجه عبد الحميد بن صالح، عن قيس، وأخرجه الطبراني من طريق يحيى بن سليمان الجعفي، عن وكيع بهذا السند، قال: رأيت مروان بن الحكم حين رمى طلحة يومئذ بسهم فوقع في عين ركبته، فما زال الدم يسيح إلى أن مات.(*ابن حجر العسقلانی*، **الإصابة في تمييز الصحابة**، ت، *عادل احمد عبد الموجود و علی محمد معوض*(**بیروت:** دار الكتب العلمية، ۱۴۱۵ھ)، ۳: ۴۳۲۔) (*ابن عساکر نے متعدد طرق سے یہ بات روایت کی ہے کہ مروان بن حکم ہی وہ شخصیت ہے جس نے طلحہ کو تیر مار کر قتل کیا۔ ابو القاسم البغوی نے جارود بن ابی سبرہ سے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا: جب یوم جمل تھا تو مروان نے طلحہ کی طرف دیکھا اور کہا: میں آج کے بعد قصاص کا مطالبہ نہیں کروں گا، چناں چہ اس نے انھیں تیر مارا اور قتل کر دیا۔ یعقوب بن سفیان نے صحیح سند کے ساتھ قیس بن ابی حازم سے روایت کیا ہے کہ مروان بن حکم نے گھڑ سواروں میں دیکھا اور کہا: یہ وہ شخص ہے جس نے*

اس بحث سے یہ واضح ہوا کہ ان تین شخصیات کا حضرت علیؓ سے اختلاف اختتام کو پہنچ گیا۔ بالخصوص حضرت عائشہؓ اور حضرت زبیرؓ کے بارے میں تو یہ بات کافی واضح ہے، یہی بات ان کی شان کے زیادہ لائق ہے کہ غلط فہمیوں میں ایک حادثہ ہوا، کچھ عاقبت نا اندیش لوگوں نے اسے بڑھاوا دیا، اور آخر کار تنازعہ ختم ہو گیا۔ یاد رہے کہ اہل السنت کا یہ موقف کہ حضرت علیؓ ان جنگوں میں صواب پر تھے، ان حضرات کے رجوع پر موقوف نہیں ہے، اس کے بغیر بھی ثابت ہے۔ تاہم رجوع ثابت ہونے سے ان حضرات کے عذر اور حسنِ نیت کی تصویر کشی زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔ حضرت طلحہؓ کے رجوع کا محض قرائنی طور ایک قوی امکان بنتا ہے، صریح روایت ضعیف ہے۔

## جنگِ صفین اور احادیثِ رسول ﷺ

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ کو جس جنگ کا سامنا کرنا پڑا، وہ جنگِ صفین تھی۔ یہ جنگ حادثاتی طور پر ہونے والی جنگ نہیں تھی بلکہ حضرت علیؓ کا ایک سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ واقعات کی تفصیل میں تو جانے کا موقع نہیں ہے مگر خلاصہ یہ ہے کہ تمام بلاد وامصار حضرت علیؓ کی بطور خلیفہ اطاعت قبول کر چکے تھے۔ صرف شام میں حضرت معاویہؓ کی طرف سے اطاعت سے اجتماعی گریز اور خود کو مد مقابل طاقت بنانے کی پالیسی موجود تھی۔ مراسلات

---

قتلِ عثمان پر مدد کی، چناں چہ انھوں نے ان کے گھٹنے میں تیر مارا جس سے خون رستا رہا اور وہ فوت ہو گئے۔ عبد الحمید بن صالح نے یہ بات قیس سے، اور طبرانی نے یحیی بن سلیمان الجعفی سے اور انھوں نے وکیع سے اس سند کے ساتھ یہ بات نقل کرتے ہوئے کہا: میں نے مروان بن الحکم کو دیکھا جس وقت انھوں نے طلحہ کو تیر مارا تو وہ ان کے گھٹنے میں لگا۔ خون رستا رہا یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئے۔)

اور سفارت کاری کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی کوششوں کا طویل سلسلہ چلتا رہا، آخر کار حضرت علیؓ نے لشکر لے کر اہل شام کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

## حضرت عمار کے بارے میں ارشادِ نبوی

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی حدیث معروف ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لیے اس کی طرف اشارہ کافی ہے۔ یہ حدیث تقریباً متواتر ہے اور متواتر نہیں تو کم از کم مشہور ضرور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمارؓ کے بارے میں فرمایا تھا: ویح عمار تقتله الفئة الباغية.[1] بعض روایات میں حضرت عمارؓ کو خطاب کر کے یہ الفاظ ہیں۔ یہ بات مختلف مواقع پر کہی گئی؛ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی اور مسجدِ نبوی کی تعمیر کے موقع پر بھی۔ یہ بات صحابہ میں بہت مشہور تھی۔ حضرت عمارؓ کی شہادت جنگِ صفین میں ہوئی ہے۔ آپؓ، حضرت علیؓ کے پرجوش حامی تھے۔ عبد اللہ بن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے صفین کے موقع پر عمار بن یاسر کو دیکھا کہ گندمی رنگ کے دراز قد بوڑھے ہیں، ان کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے، اور (بڑھاپے کی وجہ سے) ہاتھ کانپ رہا ہے اور یہ فرمارہے ہیں کہ یہ جھنڈا وہ ہے جس کے تحت میں نے رسول اللہ کے ساتھ مل کر تین مرتبہ جہاد کیا اور یہ چوتھی مرتبہ

---

[1] -**صحيح البخاري**، كتاب الجهاد في السير،باب مسح الغبار عن الرأس في سبيل الله، رقم:۲۸۱۲۔

ہے۔[1] بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ یدعوهم إلى الجنة ويدعونه إلى النار. کہ عمار تو دوسرے فریق کو جنت کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ اسے دوزخ کی طرف بلا رہے ہوں گے۔ (یعنی حضرت عمار جس راستے کی طرف بلا رہے ہیں وہ اپنی ذات کے اعتبار سے جنت کا راستہ ہے، کیوں کہ وہ امام عدل کی اطاعت کا راستہ ہے، اگرچہ ممکن ہے کسی بد نیتی کے باعث کسی کو جنت نہ ملے، جیسا کہ نبوی دور کے جہاد میں منافقین کا معاملہ تھا اور عمار کے بر خلاف فریق جس راستے کی طرف بلا رہا ہے وہ اپنی ذات میں دوزخ کا راستہ ہے؛ اس لیے کہ اوہ امام عدل کی اطاعت سے نکلنے کا راستہ ہے، اگرچہ ممکن ہے کسی عذر کی وجہ سے وہ دوزخ میں نہ جائے۔)[2] آخری وقت میں وہ اسی طرح کے ترغیبی جملے

---

١ - **مسند ابن أبي شيبة**، ما رواه عمار بن ياسر رضي الله عنه عن النبي ﷺ، رقم:٤٤٦؛**صحيح ابن حبان**،مناقب الصحابة رضي الله عنهم،ذكر البيان بأن قتال عمار كان بالراية التي قاتل بها مع رسول الله ﷺ،رقم:٧٠٨٠۔

٢-چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانی **فتح الباري** میں فرماتے ہیں:

فإن قيل كان قتله بصفين وهو مع علي والذين قتلوه مع معاوية وكان معه جماعة من الصحابة، فكيف يجوزعليهم الدعاء إلى النار؟ فالجواب أنهم كانوا ظانين أنهم يدعون إلى الجنة، وهم مجتهدون لا لوم عليهم في اتباع ظنونهم، فالمراد بالدعاء إلى الجنة الدعاء إلى سببها وهو طاعة الإمام، وكذلك كان عمار يدعوهم إلى طاعة علي وهو الإمام الواجب الطاعة إذ ذاك، وكانوا هم يدعون إلى خلاف ذلك، لكنهم معذورون للتأويل الذي ظهر لهم.(ابن حجر عسقلانی،**فتح الباري**،١:٥٤٢۔)

استعمال کر رہے تھے کہ چلو جنت کی طرف، چلو جنت کی فلاں نعمتوں کی طرف وغیرہ۔ مثلا ایک روایت میں آتا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے:

من سره أن تكتنفه، الحور العين فليتقدم بين الصفين محتسبا فإني لأرى صفا ليضربنكم ضربا يرتاب منه المبطلون والذي نفسي بيده لو ضربونا حتى يبلغوا بنا سعفات هجر لعرفت إنا على الحق وأنهم على الضلالة.[1]

جو یہ چاہتا ہو کہ حوریں اس سے بغل گیر ہوں اسے چاہیے کہ وہ ثواب کی امید رکھتے ہوئے آگے بڑھے، کیوں کہ میں سامنے ایسی صف دیکھ رہا ہوں کہ جس کی وجہ غلط راہ پر چلنے والے شبہ میں پڑ سکتے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر وہ لوگ ہمیں مارتے ہوئے ہجر کی چوٹیوں تک پیچھے دھکیل دیں تب بھی مجھے یقین رہے گا کہ ہم حق پر ہیں اور دوسرے (عملی) گمراہی پر ہیں (یعنی کسی فریق کی ظاہر کامیابی یا ناکامی، ظاہر ہار جیت کوئی معنی نہیں رکھتی، اس سے میرے اس یقین پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا)۔

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ آپ یہ فرما رہے تھے :أزلفت الجنة، وزوجت الحور العين، اليوم نلقى حبيبنا محمدا ﷺ، عهد إلي أن آخر

---

[1]-**مصنف ابن أبي شيبة**، كتاب الجمل، باب ما ذكر في صفين، رقم:۳۷۸۳۹۔

زادك من الدنيا ضيح من لبن.[1] (جنت سامنے کر دی گئی ہے، حوروں سے نکاح کا وقت آن پہنچا ہے۔ آج پیارے محمد ﷺ سے ملاقات ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حتمی پیشین گوئی کی تھی تمھاری آخری خوراک تھوڑا سا دودھ ہو گا۔)

اس روایت کو حاکم نے **المستدرك** میں روایت کیا ہے۔ حاکم اور ذہبی دونوں نے اسے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، حتی کہ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔[2] اور عملاً بھی یہ ہوا کہ تھوڑا سا دودھ پیا اور قتال میں دوبارہ شریک ہوئے اور شہید ہو گئے۔ اس طرح کی روایات خاصی تعداد میں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمار ان جنگوں میں نہ صرف حضرت علیؓ کے ساتھ تھے بلکہ جنگِ صفین میں بہت ہی جوش و جذبے کے ساتھ لڑ رہے تھے بلکہ انھیں اپنے صواب ہونے کا پورا پورا یقین تھا۔ شروع میں ہم نے حضرت عمارؓ کے حوالے سے حضرت حذیفہؓ کی اور دیگر جو احادیث ذکر کی ہیں انھیں سامنے رکھا جائے تو حضرت عمارؓ کا حضرت علیؓ کے ساتھ ہونا اور اتنے وثوق اور شرح صدر کے ساتھ ہونا ہی حضرت علیؓ کے صواب ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کی یہ پیش گوئی کہ حضرت عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، اس بات کی دلیل ہے کہ عمار جس گروہ کی نمائندگی کر رہے اور ساتھ دے رہے ہیں یہ وہ گروہ ہے جس کے خلاف بغاوت ہوئی ہے۔

---

۱ - **المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة الخ،ذكر مناقب عمار بن ياسر رضي الله عنه، رقم:٥٦٦٨۔

۲-**سلسلة الأحاديث الصحيحة**، رقم:٣٢١٧۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی کا گروہ جو قتال کر رہا ہے وہ بغاوت کو فرو کرنے کے لیے کر رہا ہے۔

اللہ تعالی کی عجیب حکمت ہے کہ حضرت علیؓ کی حقانیت کی نشانی حضرت عمارؓ کو بنایا گیا۔ خود علی تو ایک حد تک صاحبِ معاملہ ہیں۔ وہ ایک منصب پر فائز ہو رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کی جہاں ذاتی حیثیت ہے، وہاں آپ خاندانِ بنو ہاشم سے بھی تعلق رکھتے ہیں جو بہر حال ان امور میں اپنی عصبیت اور دعوے داری رکھتا ہے جس کا عملی اظہار بعد میں خلافتِ عباسیہ کی شکل میں بھی ہوتا ہے، لیکن عمار بن یاسرؓ تو پہلے دن سے آخر تک مکمل طور پر ایک درویش صفت انسان ہے۔ اس طرح کی ان کی کوئی سیاسی عصبیت نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے انھیں حضرت علیؓ کی حقانیت واضح کرنے کے لیے چنا ہے۔ حضرت علیؓ اتنے جوش وجذبے کا اظہار کر رہے ہوتے تو اسے ممکن تھا کوئی کسی اور نظر سے دیکھتا، لیکن حضرت عمار بن یاسرؓ کا اتنے جوش وخروش اور اعتماد کا اظہار اور اس پر رسول اللہ ﷺ اور حضرت حذیفہ وغیرہ کا عمار کے لیے یہ سب کچھ کہنا اور قسم کی معنویت رکھتا ہے۔ شروع میں دیکھا جا چکا ہے کہ کس طرح حضرت حذیفہؓ جیسا رازدانِ رسول کس طرح سے دنیا سے جاتے جاتے بہت اہتمام کے ساتھ حضرت عمارؓ کا حوالہ دے کر گیا کہ یہ دیکھنا کہ عمار کدھر ہے تم بھی بس ادھر ہی رہنا۔ عمار کی زندگی کو بھی اللہ نے حق وصداقت کی نشانی بنایا اور ان کی موت کو بھی۔

حدیث کے ثبوت میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہے، حدیث کا مفہوم بھی واضح ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کس فریق کے خلاف بر سرِ پیکار تھے اور کس کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ تاویلوں کا راستہ کھولنا ہو تو ہر نص میں ایک سے بڑھ کر ایک تاویل کی جا سکتی ہے۔ سیدھے سادے انداز سے بات کو سمجھنا ہو تو اللہ کے نبی نے بات کو

بہت واضح فرمادیا ہے۔ اس حدیث میں جتنی تاویلیں کی گئی ہیں، عموماً انھیں قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا اور حضرت عمارؓ کی شہادت سے ہمیشہ یہی سمجھا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی جماعت الفئة الباغية کا مصداق ہے اور یہ حدیث حضرت علیؓ کی حقانیت کی واضح دلیل ہے۔ اہلِ سنت والجماعت کی کتابوں میں یہ بات اتنی کثرت سے لکھی گئی ہے کہ اگر عبارات اکٹھی کی جائیں تو پوری کتاب تیار ہو جائے۔ جس نبی نے صحابہ کا مقام ومرتبہ بتایا اور جس کی وجہ سے صحابی، صحابی بنتا ہے اسی نے یہ بات بھی بتلائی ہے۔ جن علما نے صحابہ کے بارے میں کفِ لسان کی تلقین کی انھوں نے ہی حدیث کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے، البتہ انھی علما نے یہ بھی بتایا ہے کہ بغاوت نہ تو کسی کے کفر کو مستلزم ہے نہ ہی فسق کو، نہ ہی اس کی بنیاد پر کسی بھی عظیم ہستی پر لعن طعن کرنا جائز ہوتا ہے۔ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ خلافتِ راشدہ کی ایک اہم پالیسی کا معاملہ ہے، اس کے درست ہونے کو تاویلوں میں الجھایا نہیں جاسکتا، تاہم مخلصین کے لیے عذر ضرور تلاش کیا جا سکتا ہے اور یہی اہل السنت کا طریقہ ہے، جیسا کہ ہم مشاجرات پر بات کرتے ہو کچھ عرض کریں گے۔

یہاں درمیان میں اہل السنت والجماعت کی عبارات پیش کرنے سے گفت گو کا تسلسل متأثر ہو گا، تاہم صرف ملا علی قاریؒ کی دو عبارتوں کی طرف توجہ دلانا مناسب ہو گا، تاکہ ایک ہی شخصیت کی دو عبارتوں سے واضح ہو سکے کہ جو حضرات صحابہ کے بارے میں کفِ ّلسان کی تلقین کرتے ہیں وہی اس حدیث سے حضرت علی کے مد مقابل جماعت کے باغی ہونے پر بھی استدلال کرتے ہیں: ایک عبارت میں انھوں نے ایک طرف تو یہ بتایا ہے کہ کس طرح اہل السنت مقامِ صحابیت کے احترام کا پورا پاس کرتے ہیں؛ چناں چہ انھوں نے یہاں بزرگوں کا وہ معروف قول بھی نقل کیا ہے کہ حضرتِ معاویہؓ کے گھوڑے کے نتھنوں

میں لگنے والا غبار بھی عمر بن عبد العزیز سے افضل ہے، نیز یہ کہ امت کے اولیا و علما، کبار صحابہ کے درجات کو نہیں پہنچ سکتے اور ان دونوں جماعتوں کے افراد پر طعن جائز نہیں، لیکن بایں ہمہ حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہر معنیٰ پر رکھا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اس طرح کا حکم لگانا اہل السنت کے مذکورہ مزاج کے منافی نہیں ہے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

ولعل المراد بهذه الفتنة الحرب التي وقعت بين أمير المؤمنين علي - رضي الله عنه - وبين معاوية - رضي الله عنه - ولا شك أن من ذكر أحدا من هذين الصدرين وأصحابهما يكون مبتدعا؛ لأن أكثرهم كانوا أصحاب رسول الله - ﷺ - اهـ. وقد قال - ﷺ: «إذا ذكر أصحابي فأمسكوا» " أي: عن الطعن فيهم، فإن رضا الله تعالى في مواضع من القرآن تعلق بهم، فلا بد أن يكون مآلهم إلى التقوى ورضا المولى وجنة المأوى، وأيضا لهم حقوق ثابتة في ذمة الأمة، فلا ينبغي لهم أن يذكروهم إلا بالثناء الجميل والدعاء الجزيل، وهذا مما لا ينافي أن يذكر أحدٌ مجملا أو معينا بأن المحاربين مع علي ما كانوا من المخالفين، أو بأن معاوية وحزبه كانوا باغين على ما دل عليه حديث عمار: " «تقتلك الفئة الباغية» " ; لأن المقصود منه بيان الحكم المميز بين الحق والباطل والفاصل بين المجتهد المصيب، والمجتهد المخطئ، مع توقير الصحابة وتعظيمهم جميعا في القلب لرضا الرب ؛ ولذا لما سئل بعض الأكابر: عمر بن عبد العزيز

أفضل أم معاوية؟ قال: لغبار أنف فرس معاوية حين غزا في ركاب رسول الله – ﷺ – أفضل من كذا وكذا من عمر بن عبد العزيز.[1]

شاید اس فتنے سے مراد وہ جنگ ہے جو امیر المؤمنین حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان واقع ہوئی اور اس بات میں شک نہیں ہے کہ جس نے بھی ان شخصیات اور ان کے اصحاب کا ذکر (برے الفاظ میں) کیا، وہ بدعتی ہے، کیوں کہ ان میں سے اکثر لوگ اصحابِ رسول ﷺ تھے اور آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جب میرے اصحاب کا ذکر ہو تو رک جاؤ، یعنی ان پر طعن کرنے سے، کیوں کہ قرآن کے مختلف مقامات پر ان سے متعلق اللہ کی رضا کا ذکر آیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ان کا منتہاے مقصود تقوی، اللہ کی رضا اور جنت کا حصول ہو، نیز یہ کہ امت کے ذمے ان کے حقوق ثابت شدہ ہیں، اس لیے ستائش و دعاہی کے ساتھ ان کا ذکر مناسب ہے۔ یہ بات اس امر کے منافی نہیں ہے کہ کوئی شخص اجمالی یا معین طور پر کہے کہ حضرت علی کے ساتھ جنگ کرنے والے مخالفین میں سے نہ تھے یا یہ کہ حضرت معاویہ اور ان کی جماعت باغی تھے، جیسا کہ اس بات پر حدیثِ عمار دلالت کرتی ہے کہ تجھے باغی جماعت قتل کرے گی؛ کیوں کہ اس سے مقصود حق و باطل کے درمیان تمیز کنندہ حکم اور مجتہدِ

---

[1] - ابوالحسن علی بن محمد نورالدین الملا القاری(۱۰۱۴ھ)، **مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح** (بیروت: دار الفکر، ۲۰۰۲ء)، ۸: ۳۳۹۷۔ یاد رہے کہ یہاں اس عبارت کو پیش کرنے کا مقصد صرف اس بات کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے حضرت علی کی درستی اور دوسرے فریق کی خطا کو بیان کرنا اہل السنت کے اس اصول کے منافی نہیں ہے کہ صحابہ کے بارے میں کفِ لسان سے کام لیا جاے۔ یہاں دونوں باتیں ایک ساتھ کہی گئی ہیں؛ وگرنہ جس حدیث کی یہ تشریح کی گئی ہے یعنی ستکون فتنة تستنظف العرب اس کی یہ تشریح کہ یہ صحابہ کی جنگوں پر محمول ہے ضروری نہیں کہ راجح تشریح ہو۔

مصیب اور مجتہدِ مخطی کے درمیان فاصل کا بیان کرنا ہے، تاہم اس کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے تمام صحابہ کی توقیر و تعظیم دل میں ملحوظ رکھی جائے گی؛یہی وجہ ہے کہ جب بعض اکابر سے یہ پوچھا گیا کہ عمر بن عبد العزیز افضل ہیں یا معاویہ؟ تو انھوں نے کہا: رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ جہاد میں معاویہ کے گھوڑے کے نتھنے کا غبار فلاں اور فلاں یعنی عمر بن عبد العزیز سے افضل ہے۔

دوسری عبارت وہ قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے اس حدیث میں کی جانے والی تاویلوں کا رد کیا ہے۔ حضرت عمار کے بارے میں یہ حدیث **مشکوۃ** کے باب المعجزات میں ہے، وہاں اس حدیث کی تشریح میں ملا علی قاری کی عبارت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔[1]

---

۱۔ ملا علی قاری اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

(تقتلك الفئة الباغية) . أي: الجماعة الخارجة على إمام الوقت وخليفة الزمان. قال الطيبي: ترحم عليه بسبب الشدة التي يقع فيها عمار من قبل الفئة الباغية يريد به معاوية وقومه، فإنه قتل يوم صفين. وقال ابن الملك: اعلم أن عمارا قتله معاوية وفئته، فكانوا طاغين باغين، بهذا الحديث، لأن عمارا كان في عسكر علي، وهو المستحق للإمامة، فامتنعوا عن بيعته. وحكي أن معاوية كان يؤول معنى الحديث ويقول: نحن فئة باغية طالبة لدم عثمان، وهذا كما ترى تحريف، إذ معنى طلب الدم غير مناسب هنا لأنه - صلى الله عليه وسلم - ذكر الحديث في إظهار فضيلة عمار وذم قاتله، لأنه جاء في طريق ويح. قلت: ويح كلمة تقال لمن وقع في هلكة لا يستحقها فيترحم عليه ويرثى له، بخلاف ويل، فإنها كلمة عقوبة تقال للذي يستحقها ولا يترحم عليه، هذا وفي الجامع الصغير برواية الإمام أحمد والبخاري عن أبي سعيد مرفوعا ( «ويح عمار تقتله الفئة الباغية يدعوهم إلى

الجنة ويدعونه إلى النار» ) وهذا كالنص الصريح في المعنى الصحيح المتبادر من البغي المطلق في الكتاب، كما في قوله تعالى: {وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغي} [النحل: ٩٠] وقوله سبحانه: {فإن بغت إحداهما على الأخرى} [الحجرات: ٩] فإطلاق اللفظ الشرعي على إرادة المعنى اللغوي عدول عن العدل، وميل إلى الظلم الذي هو وضع الشيء في غير موضعه. والحاصل أن البغي بحسب المعنى الشرعي والإطلاق العرفي، خص عموم معنى الطلب اللغوي إلى طلب الشر الخاص بالخروج المنهي، فلا يصح أن يراد به طلب دم خليفة الزمان، وهو عثمان رضي الله عنه، وقد حكي عن معاوية تأويل أقبح من هذا حيث قال: إنما قتله علي وفئته حيث حمله على القتال، وصار سببا لقتله في المآل، فقيل له في الجواب: فإذن قاتل حمزة هو النبي - ﷺ - حيث كان باعثا له على ذلك، والله سبحانه وتعالى حيث أمر المؤمنين بقتال المشركين.

والحاصل أن هذا الحديث فيه معجزات ثلاث: إحداها: أنه سيقتل، وثانيها: أنه مظلوم، وثالثها: أن قاتله باغ من البغاة، والكل صدق وحق، ثم رأيت الشيخ أكمل الدين قال: الظاهر أن هذا أي: التأويل السابق عن معاوية، وما حكي عنه أيضا من أنه قتله من أخرجه للقتل وحرضه عليه كل منهما افتراء عليه، أما الأول فتحريف للحديث، وأما الثاني فلأنه ما أخرجه أحد، بل هو خرج بنفسه وماله مجاهدا في سبيل الله قاصدا لإقامة الغرض، وإنما كان كل منهما افتراء على معاوية لأنه رضي الله عنه أعقل من أن يقع في شيء ظاهر الفساد على الخاص والعام.

قلت: فإذا كان الواجب عليه أن يرجع عن بغيه بإطاعته الخليفة، ويترك المخالفة وطلب الخلافة المنيفة، فتبين بهذا أنه كان في الباطن باغيا، وفي الظاهر متسترا بدم عثمان مراعيا مرائيا، فجاء هذا الحديث عليه ناعيا، وعن عمله ناهيا، لكن كان

حضرت خزیمہ بن ثابتؓ قتال میں ذرا متوقف تھے، لیکن حضرت عمار کی شہادت کے بعد ان کا توقف بھی دور ہو گیا۔ حضرت خزیمہ بدری صحابی ہیں اور وہ ہستی ہیں جن کی اکیلے کی شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا[1]، اسی طرح دیگر صحابہ بھی تھے۔ حضرت علیؓ نے متوقفین کو ملامت نہیں کی۔ بعض کے اعذار بھی ہو سکتے ہیں، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی بہت سارے صحابہ قتال کے لیے نہیں جاتے تھے۔ تبوک کے علاوہ کسی کو ملامت نہیں کی گئی۔

---

ذلك في الكتاب مسطورا، فصار عنده كل من القرآن والحديث مهجورا، فرحم الله من أنصف ولم يتعصب ولم يتعسف، وتولى الاقتصاد في الاعتقاد، لئلا يقع في جانبي سبيل الرشاد من الرفض والنصب بأن يحب جميع الآل والصحب.(علی بن محمد الملا علی القاری، **مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح**(بیروت:دار الفکر،۲۰۰۲ء)،۹: ۳۷۸۵،۳۷۸۶۔)

۱۔ بعض حضرات کو یہ غلطی لگ گئی کہ صفین میں شہید ہونے والے خزیمہ وہ صحابی نہیں ہیں جن کی شہادت دو کے برابر قرار دی گئی تھی، بلکہ کوئی اور ہیں، لیکن خطیب بغدادی اور حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے حضرات نے اس رائے کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ صفین میں شہید ہونے والے وہی دو شہادتوں والے ہی ہیں۔ چناں چہ حافظ نے خطیب کا قول نقل کیا ہے:أجمع علماء السير أنّ ذا الشهادتين قتل بصفّين مع علي.(ابنِ حجر عسقلانی، **الإصابة في تمييز الصحابة**،۲:۲۴۰۔)

## ابن عمرؓ کا باغیوں سے قتال نہ کرنے پر افسوس

ابنِ عمرؓ کو بھی توقف تھا، لیکن ان کے بارے میں بھی یہ بات موجود ہے کہ ان کو بعد میں افسوس رہا کہ کاش میں حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر الفئة الباغية کے خلاف قتال کرتا۔[1] اور اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ بعد میں جو واقعات کربلا، حرہ، مکے پر چڑھائی، عبداللہ بن زبیرؓ کے قتل وغیرہ کی صورت میں سامنے آئے، وہ اس کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے کس قدر مصالحانہ پالیسی اختیار کی، لیکن اس کے

---

[1] - علامہ ابنِ عبدالبرؒ **الاستيعاب في معرفة الأصحاب** میں لکھتے ہیں: " وصح عن عَبْد الله بن عمر رضى الله عنهما من وجوه أنه قَالَ: ما آسى على شيء كما آسى أني لم أقاتل الفئة الباغية مع علي رضى الله عنه. "(ابنِ عمرؓ سے صحیح طرق سے ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا: مجھے اتنا افسوس کسی بات پر نہیں، جتنا اس پر ہے کہ میں نے علیؓ کے ساتھ مل کر باغی جماعت کے ساتھ قتال نہیں کیا۔)(ابوعمر یوسف بن عبداللہ القرطبی(۴۶۳ھ)، **الاستيعاب في معرفة الأصحاب**، ت، علی محمد البجاوی(بیروت: دارالجیل، ۱۹۹۲ء)، ۱: ۷۷۔)؛ علامہ ذہبیؒ نے **سير أعلام النبلاء** میں بھی یہ قول مختلف لوگوں کی وساطت سے نقل کیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:" قال ابْنُ عُمَرَ حِيْنَ احْتُضِرَ: مَا أَجِدُ فِي نَفْسِي شَيْئاً إِلاَّ أَنِّي لَمْ أُقَاتِلِ الفِئَةَ البَاغِيَةَ مَعَ عَلِيِّ بنِ أَبِي طَالِبٍ. "(ابنِ عمر نے جان کنی کے عالم میں کہا کہ مجھے دل میں ایک بات کا قلق ہے کہ میں نے علی کے ساتھ مل کر باغی جماعت سے قتال نہیں کیا۔) ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن احمد قایماز الذہبی، **سير أعلام النبلاء**، ت، مجموعۂ محققین زیر نگرانی شعیب الارنؤوط (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۹۸۵ء)، ۳: ۲۳۲۔ ابنِ عمر کا اس طرح کا قول حجاج بن یوسف کے بارے میں بھی انھی مصادر میں درج ہے۔

باوجود ان کے بارے میں بھی آتا ہے -واللہ أعلم- کہ ان کی موت کے پیچھے حجاج بن یوسف کا ہاتھ تھا۔ ان کو ایک زہر آلود نیزہ چبھویا گیا۔[1]۔ ابنِ عمرؓ نے اس پر اپنی ندامت کا اظہار کیا ہے اور اس کی وجہ یہی بنتی ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے دیکھا ہو گا تو انھیں احساس ہوا ہو گا کہ سارے اُس وقت ڈٹ کر علیؓ کا ساتھ دے دیتے تو اسباب کے درجے میں یہ باتیں شاید نہ ہوتیں۔

---

1- **صحيح البخاري** کے الفاظ ہیں: ''حَدَّثَنَا زَكَرِيَّاءُ بْنُ يَحْيَى أَبُو السُّكَيْنِ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْمُحَارِبِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سُوقَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، قَالَ: كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ حِينَ أَصَابَهُ سِنَانُ الرُّمْحِ فِي أَخْمَصِ قَدَمِهِ، فَلَزِقَتْ قَدَمُهُ بِالرِّكَابِ، فَنَزَلْتُ، فَنَزَعْتُهَا وَذَلِكَ بِمِنًى، فَبَلَغَ الحَجَّاجَ فَجَعَلَ يَعُودُهُ، فَقَالَ الحَجَّاجُ: لَوْ نَعْلَمُ مَنْ أَصَابَكَ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: «أَنْتَ أَصَبْتَنِي» قَالَ: وَكَيْفَ؟ قَالَ: «حَمَلْتَ السِّلاَحَ فِي يَوْمٍ لَمْ يَكُنْ يُحْمَلُ فِيهِ، وَأَدْخَلْتَ السِّلاَحَ الحَرَمَ وَلَمْ يَكُنِ السِّلاَحُ يُدْخَلُ الحَرَمَ» ''۔(زکریا بن یحییٰ، ابو السکین، محمد بن سوقہ، سعید بن جبیر روایت کرتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ میں ابن عمر کے ساتھ تھا، جب ان کے تلوے میں نیزے کی نوک چبھ گئی اور ان کا پاؤں رکاب سے چمٹ گیا، تو میں اترا اور اس نیزے کو نکالا، یہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا۔ جب حجاج کو خبر ملی تو ان کی عیادت کرنے آیا، تو حجاج نے کہا: کاش ہمیں معلوم ہو جاتا کہ کس نے آپ کو یہ تکلیف پہنچائی ہے! ابن عمر نے جواب دیا کہ تو نے ہی ہمیں یہ تکلیف پہنچائی۔ حجاج نے پوچھا: کیوں کر؟ ابن عمر نے جواب دیا کہ تو ایسے دن ہتھیار لے کر آیا جس دن ہتھیار لے کر نہیں آیا جاتا تھا اور تو نے ہتھیار حرم میں داخل کیا، حالاں کہ حرم میں ہتھیار داخل نہیں کیا جاتا تھا۔)(**صحيح البخاري**،أبواب العيدين، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ حَمْلِ السِّلاَحِ فِي العِيدِ وَالحَرَمِ، رقم:٩٦٦۔)

حضرت ابن عمرؓ سے متعدد طرق سے مروی ہے کہ انھوں نے الفئۃ الباغیۃ سے قتال نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ ابن عبد البر وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ بات متعدد طرق سے صحیح طور پر ابن عمرؓ سے ثابت ہے۔ ہیثمی نے ایک روایت ذکر کی ہے: عن ابن عمر قال: لم أجدني آسى على شيء إلا أني لم أقاتل الفئة الباغية مع علي. (مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہوا ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر باغی جماعت سے قتال نہیں کیا) اس کے بعد ہیثمی فرماتے ہیں طبرانی نے اسے متعدد سندوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک کے راوی صحیح والے ہیں۔[1] بظاہر ہیثمی جس طریق کی بات کر رہے ہیں، اس پر زیادہ سے زیادہ اعتراض مرسل ہونے کا ہو سکتا ہے اور یہ کوئی بڑا اعتراض نہیں۔ خاص طور پر جب کہ یہ بات حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرنے والے متعدد حضرات ہیں۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حمزۃ بن عبد اللہ بن عمر نے ابنِ عمر سے روایت کی ہے، اس کی سند کو حاکم اور ذہبی دونوں نے بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔[2]

بظاہر تو ابنِ عمر جس الفئۃ الباغیۃ کی بات کر رہے ہیں، وہ واضح ہی ہے، خاص طور پر جن روایتوں میں مع علی کا لفظ بھی ساتھ آیا ہے۔ یعنی مجھے حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر قتال نہ کرنے پر افسوس ہے۔ تاہم بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حجاج بن یوسف کے سیاق میں انھوں نے فرمائی جب کہ اس نے عبد اللہ بن زبیر کے خلاف مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی، ابن زبیرؓ کو شہید کر کے لاش کی بے حرمتی کی اور ان کی والدہ اسماء بنت ابی بکر، جو اس وقت

---

۱- **مجمع الزوائد**، كتاب الفتن، باب فيما كان بينهم يوم صفين، رقم:۱۲۰۵۴۔

۲- **المستدرك على الصحيحين**، تفسير سورة الحجرات، رقم:۳۷۲۲۔

بوڑھی خاتون تھیں، کے ساتھ بد تمیزی کی۔ (جیسا کہ **صحیح مسلم** کی روایت میں موجود ہے) اگر یہ روایت لے بھی لی جائے تو اصل بات وہی نکلتی ہے جو میں نے ابھی عرض کی کہ اگر حضرت علیؓ کی خلافت کو مکمل استحکام حاصل ہو جاتا تو اس ٹولے کی یہ حرکتیں اس حد تک نہ پہنچتیں۔ بعض روایتوں سے ترشح ہوتا ہے کہ ابن عمرؓ عبد اللہ بن زبیر کو الفئۃ الباغیۃ کہہ رہے ہیں اور آج کل بعض لوگ اسی روایت کو لے کر بیٹھ گئے ہیں، گویا ان کے ہاں یا حضرت ابن زبیر صحابی نہیں ہیں یا صحابی کے لیے الفئۃ الباغیۃ کا اطلاق یہاں جائز ہو گیا ہے، لیکن جو لفظ وہاں استعمال ہوئے ہیں کہ وہ کسی طرح بھی ابن زبیر پر منطبق نہیں ہوتے۔ ویسے بھی یہ بات بڑی عجیب سی ہو گی کہ حضرت ابن عمرؓ کے حضرت علیؓ کی حمایت میں قتال نہ کرنے کو تو ایک اعلیٰ دانش مندانہ فیصلہ سمجھا جائے اور مروانیوں کی اور حجاج بن یوسف جیسے بدمعاش کی حمایت میں ابن زبیرؓ جیسے صحابی کے خلاف نہ لڑنے پر انھیں افسوس ہو رہا ہو۔ یعنی حضرت علیؓ کی حمایت میں نہ لڑنا ابن عمرؓ کا کارنامہ ٹھہرا اور حجاج بن یوسف کی حمایت میں مکے پر چڑھائی نہ کرنا ابن عمرؓ کا قابلِ افسوس فیصلہ قرار پایا۔ در اصل حدیث کا تھوڑا سا بھی مطالعہ رکھنے والا جانتا ہے کہ اس دور کے واقعات کو ''فتنۃ ابن الزبیر'' کہہ دیا جاتا ہے، مقصد عبد اللہ بن زبیر کو خارجی کہنا نہیں ہوتا، بلکہ عبد اللہ بن زبیر کے خلاف بپا ہونے والی جنگ کو فتنۃ ابن الزبیر کہ دیا جاتا ہے؛ اس لیے حضرت ابنِ عمرؓ کا اظہارِ ندامت کرتے ہوئے ''مع علی'' کہنا یا حجاج بن یوسف کے کرتوتوں کے سیاق میں یہ بات کہنا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اپنے انجام اور مآل کے اعتبار سے ایک ہی بات ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مراد جو بھی ہو یہ بات بہر حال ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ موقف کہ چوں کہ دوسری طرف مسلمان گروہ ہے، اس

لیے کسی مسلمان گروہ کے خلاف کسی بھی حالت میں قتال نہیں کیا جاسکتا یا یہ کہ داخلی قتال میں الگ تھلگ رہنا ہر حالت میں اچھی بات ہے، اس موقف پر وہ آخر دم تک قائم نہیں رہے، بلکہ اس سے رجوع اور اس پر افسوس کا اظہار فرمادیا تھا۔ اس پر مزید کچھ بات ان شاء اللہ مشاجرات کی بحث میں کریں گے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال اپنے وقت کے لحاظ سے حکمِ شرعی تھے۔ یہ کوئی ایسی کوئی چیز نہ تھے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خامی کے طور پر پیش کیا جائے یا اس میں معذرت خواہی کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مستدرکِ حاکم اور بیہقی کی ایک روایت میں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد منقول ہے (جس کو حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، تاہم مجھے جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا) کہ انھوں نے سورۂ حجرات کی آیت، جس میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان مصالحت اور اس کے ناکام ہونے کی صورت میں جماعت باغیہ سے قتال کا حکم ہے، کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس امت نے جتنا اعراض اس آیت سے کیا ہے کسی اور سے نہیں کیا۔[1] یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی سمجھ رہی ہیں کہ اس آیت پر کماحقہ عمل ہونا چاہیے تھا۔

---

۱۔ **المستدرك على الصحيحين**، كتاب قتال أهل البغي، رقم: ۲۶۶۴۔ **المستدرك** کے الفاظ ہیں: عن عائشة رضي الله عنها، أنها قالت: " ما رأيت مثل ما رغبت عنه هذه الأمة من هذه الآية: {وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما، فإن بغت إحداهما على الأخرى، فقاتلوا التي تبغي، حتى تفيء إلى أمر الله} [الحجرات: 9] «هذا حديث صحيح على شرط مسلم، ولم يخرجاه»؛ بیہقی، **السنن الكبرى**، جماع أبواب الرعاة، باب الدليل على أن الفئة الباغية منهما لا تخرج بالبغي عن تسمية الإسلام، رقم: ۱۶۷۰۷۔

علیؓ آنے والے وقتوں میں آنے والی ایک برائی کے آگے کھڑا تھا۔ اس وقت یہ باتیں سامنے نہیں تھیں، لیکن بعد میں ان امور نے جو رخ اختیار کرنا تھا، وہ ساٹھ ہجری کے بعد نظر آیا۔ لوگ کہتے ہیں یہ سیدھا سادا خاندان ہے، لیکن ایسی بات نہیں۔ اس کے افراد نے اپنی بصیرت اور فراست سے کئی سال بعد کی چیزوں کا مشاہدہ کیا، لیکن چوں کہ اللہ کے ہاں تکوینی فیصلہ تھا کہ انھوں نے مسلط ہونا تھا، اس لیے یہ امور ہو کر رہے۔ بنو امیہ کے تسلط کے بارے میں بھی احادیث موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم تھا اور آپ کو اس سے ناگواری بھی ہوئی۔ وہ احادیث بھی حضرت علیؓ کے حق میں جاتی ہیں، لیکن وہ بھی ایک مستقل موضوع ہے، اگرچہ اس موضوع کی کچھ احادیث ضعیف ہیں، لیکن قابل قبول روایات بھی موجود ہیں، اور مجموعی روایات تو خصوصا نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ خیر! اثرات ونتائج کے اعتبار سے حضرت علی وغیرہ ممکنہ طور پر کیا دیکھ رہے ہوں گے؟ اس کا براہِ راست تعلق حضرت علی کی پالیسیوں کے سیاسی پہلو سے ہے جو کہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے، جیسا کہ شروع میں عرض کیا، یہاں ضمناً چند جملے درمیان میں آگئے، اس لیے عرض کر دیے۔

اصل بات یہ ہو رہی تھی کہ حضرت عمارؓ کی شہادت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت عمار کا قتال الفئۃ الباغیۃ کے خلاف ہے اور یہ در حقیقت سورہ حجرات کی اس آیت پر عمل ہے فقاتلو التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله.

## خوارج کے ساتھ قتالِ علیؓ اور احادیثِ رسول ﷺ

خوارج ایک گروہ تھا جس کے ظہور کی پیش گوئی رسول اللہ ﷺ نے کئی احادیث میں فرمائی ہے۔ اپنے مجموعی مضمون کے لحاظ سے یہ احادیث تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ یہ

لوگ بادی النظر میں بہت متقی پرہیز گار تھے۔ خود حدیث میں آتا ہے کہ تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے۔ مزاج اور فکری رویے کے اعتبار سے مذہبی انتہا پسند بظاہر نام قرآن کا لیتے تھے، مگر حدیث کے مطابق قرآن صرف ان کی زبان و حلق تک محدود تھا۔ خوارج کے خصائص اور اوصاف کے بارے میں آج کے دور میں ہو سکتا ہے متعدد حضرات نے تفصیل سے لکھا ہو، خصوصا عرب دنیا میں اس پر کام ہوا ہو گا۔ یہاں خوارج کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خوارج کے بارے میں دو قسم کی احادیث ہیں، یا یوں کہ لیجیے کہ ان کے بارے میں دو قسم کی باتیں حدیث میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے لوگ مختلف زمانوں میں ظاہر ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کا آخری گروہ دجال کی حمایت میں لڑے گا۔ ان خوارج کی رسول اللہ ﷺ نے مذمت بھی فرمائی اور ان سے قتال کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے۔ یہ حدیثیں بھی یہاں اس لیے متعلق ہیں کہ خوارج کے خلاف سب سے پہلا قتال کرنے کا شرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل ہوا، اگرچہ بعد میں مختلف زمانوں میں اور بھی بہت سے لوگوں نے خوارج کے خلاف قتال کیے۔ دوسری احادیث وہ ہیں جن میں ایک متعین گروہ اور اس میں مخصوص حلیے والے ایک متعین فرد کے بارے میں پیش گوئی فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ان کی سخت ترین الفاظ میں مذمت فرمائی اور ان سے قتال کرنے والی جماعت کے لیے بہت اعلی الفاظ استعمال فرمائے۔ یہ حدیثیں چوں کہ ایک متعین گروہ اور متعین فرد کی نشانی کے ساتھ ہیں، اس لیے اس کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موضوع سے زیادہ تعلق ہے۔ چوں کہ دونوں قسم کی حدیثیں بہت زیادہ ہیں، اس لیے ہم ایک آدھ حدیث ذکر کر کے ان سے سمجھ میں آنے والے چند امور ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم حدیث خود حضرت علیؓ کی ہے جو ان سے بڑی تعداد میں صحابہ و تابعین نے روایت کی ہے۔ یہاں پہلے بخاری و مسلم سے مختصر روایتیں نقل کی جاتی ہیں، اس کے بعد مختلف روایات میں آنے والے مواد کے اہم حصے کو واقعاتی ترتیب سے پیش کیا جائے گا۔

سوید بن غفلہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

إني سمعت رسول الله ﷺ يقول: «سيخرج قوم في آخر الزمان، أحداث الأسنان، سفهاء الأحلام، يقولون من خير قول البرية، لا يجاوز إيمانهم حناجرهم، يمرقون من الدين، كما يمرق السهم من الرمية، فأينما لقيتموهم فاقتلوهم، فإن في قتلهم أجرا لمن قتلهم يوم القيامة».[1]

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عن قریب کچھ لوگ پیدا ہوں گے، نو عمر، کم عقل، باتیں دنیا کی بہترین باتوں میں سے کریں گے (دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوں گے۔) لیکن ان کا ایمان (یعنی بظاہر مؤمنانہ باتیں) ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے اسی طرح نکلے ہوئے ہوں گے جیسے تیر نشانے سے چوک جاتا ہے۔ جہاں بھی تم ان سے ملو، انھیں قتل کرو، اس لیے کہ ان کے قتل کرنے میں قتل کرنے والوں کے لیے قیامت کے دن بڑا اجر ہے۔

عَبیدہ سلمانی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

---

۱-**صحيح البخاري**، كتاب استتابة المرتدين، باب قتل الخوارج والملحدين بعد إقامة الحجة عليهم، رقم: ۶۹۳۰۔

قال: ذكر الخوارج فقال: «فيهم رجل مخدج اليد، أو مودن اليد، أو مثدون اليد»، لولا أن تبطروا لحدثتكم بما وعد الله الذين يقتلونهم، على لسان محمد صلى الله عليه وسلم، قال قلت: آنت سمعته من محمد صلى الله عليه وسلم؟ قال: إي، ورب الكعبة، إي، ورب الكعبة، إي، ورب الكعبة.[1]

حضرت علی نے رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے خوارج کا ذکر فرمایا، اس میں یہ بھی فرمایا کہ ان میں ایسا شخص ہو گا جو ہاتھ سے ٹُنڈا ہو گا۔ اگر مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ تم ان سے قتال کی فضیلت سن کر اپنے عمل پر ناز کرنے لگو گے تو تمھیں بتاتا کہ اللہ تعالی نے انھیں قتل کرنے والوں کے لیے محمد ﷺ کی زبان پر کیا کیا وعدے فرمائے ہیں۔ (عَبِیدہ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: ''کیا آپ نے یہ باتیں خود رسول اللہ ﷺ سے سنی ہیں؟'' حضرت علی نے (تین مرتبہ) فرمایا: ''بالکل، رب کعبہ کی قسم؛ بالکل، ربِ کعبہ کی قسم؛ بالکل رب کعبہ کی قسم۔''

یہ لوگ موجود تو فی الجملہ تھے، لیکن ان کا با قاعدہ ظہور اور خروج تب ہوا جب واقعۂ تحکیم کے بعد یہ لوگ إن الحكم إلا لله کا نعرہ لگاتے ہوئے الگ ہو گئے۔ اس سے پہلے بطور ایک مستقل گروہ یا جماعت ان کا وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی ان میں سے کچھ لوگ تو آخر تک کوفے میں موجود رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے بلکہ خطبے کے دوران إن الحكم إلا لله کے نعرے لگاتے، ٹولیاں بنا کر تنقید کرتے، بلکہ حضرت علیؓ کو واجب القتل بھی کہتے، لیکن ان کے خلاف حضرت علیؓ نے کوئی کارروائی نہیں کی، بلکہ یہ فرمایا کہ جب تک تمھارے ہاتھ ہمارے ہاتھوں کے ساتھ ہیں، ہم تمھیں مالِ فیء میں سے دیں گے، اپنی مساجد

---

۱-**صحیح مسلم**، کتاب الزکوۃ، باب التحریض علی قتل الخوارج، رقم:۱۰۶۶۔

میں تمھیں نماز پڑھنے سے نہیں روکیں گے۔ جب باقاعدہ انھوں نے الگ سے لشکر اور جتھا بنا لیا، حروراء نامی بستی پر قابض ہو کر الگ سے اپنی عمل داری اور حکومت بھی قائم کر لی، اس طرح سے بغاوت کی شرائط بھی ان میں متحقق ہو گئیں، افعالِ شنیعہ کا ارتکاب بھی شروع کر دیا، تو پہلے مرحلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباسؓ وغیرہ کے ذریعے ان سے مذاکرات کیے، ان کے شبہات کے تسلی بخش جوابات دیے، جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگ واپس آ گئے۔ دراصل کئی لوگ ان کے ظاہری زہد اور پرہیز گاری سے متأثر ہو گئے تھے۔

**صحیح مسلم** کی ایک طویل روایت میں ہے کہ زید بن وہب کہتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خوارج کے خلاف لڑنے والے لشکر میں شامل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اے لوگو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے، تمھاری قراءت ان کی قراءت کے مقابلے میں، تمھاری نمازیں ان کی نمازوں کے مقابلے میں اور تمھارے روزے ان کے روزوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں گے۔ وہ قرآن یہ سوچ کر پڑھیں گے کہ وہ ان کے حق میں ہے، حالاں کہ حقیقت میں وہ ان کے خلاف ہو گا۔ ان کی نماز ان کے حلق سے نیچے نہیں ہو گی۔ وہ دین سے ایسے ہی نکلے ہوئے ہوں گے جیسے تیر نشانے سے چوک جاتا ہے۔ ان سے لڑنے والے لشکر کو اگر معلوم ہو جائے کہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے مطابق کیا اجر ہے تو وہ اسی پر تکیہ کر کے مزید عمل سے سستی کرنے لگ جائیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک آدمی ہے جس کے بازو کا اوپر والا حصہ تو ہو گا نیچے کلائی نہیں ہو گی۔ اس کے آخر میں عورت کی پستان کی طرح کا گوشت ہو گا، جس پر سفید بال ہوں گے۔ (حلیے میں اتنی تفصیل اور باریکی بذاتِ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ اور پیش گوئی کے بذیعہ

وحی ہونے کی دلیل ہے۔ حضرت علیؓ یہ حدیث ان کے خلاف قتال شروع ہونے سے پہلے سنا رہے ہیں، جب کہ کسی کو ایسے شخص کے اس لشکر میں ہونے کا یقین نہیں تھا) حضرت علیؓ نے مزید فرمایا کہ میری امید یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اس پیش گوئی کا مصداق یہی لوگ ہیں۔ انھوں نے لوگوں میں لوٹ مار کی ہے اور خون بہایا ہے۔[1] اب ظاہر ہے حضرت علیؓ کا یہ قوی اندازہ، کہ یہ وہی لوگ ہیں، ایک دن میں تو نہیں بنا ہو گا۔ ان کی شناعت پہلے سے واضح ہو رہی ہو گی، لیکن حضرت علیؓ نے ان کے خلاف ایکشن اس خاص مرحلے پر آ کر لیا؛ اس لیے، کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا، ایک فقیہ خلیفہ محض یہ جان کر کہ یہ برے لوگ ہیں کارروائی نہیں کیا کرتا۔ وہ کارروائی تب کرتا ہے جب تمام فقہی و قانونی وجوہات مکمل ہو کر چیزیں پختہ (mature) ہو کر سامنے آ جائیں؛ اس لیے حضرت علیؓ پر یہ اعتراض کہ فلاں لوگوں کے خلاف فلاں وقت انھوں نے کارروائی نہیں کی، درست نہیں ہے۔ انھوں نے تو اپنے خلاف نعرے لگانے والوں کے خلاف بھی کارروائی نہیں کی۔

اب جب اس جماعت کی بغاوت بھی عملاً واضح ہو گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے دو گروہ تھے: اہلِ شام اور یہ خوارج۔ **صحیح مسلم** کی اس روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبے میں واضح کیا کہ اہلِ شام کے مقابلے میں اس نئی جماعت کے خلاف قتال کرنا زیادہ اہم ہے۔ جیسا کہ آگے ہم دیکھیں گے، لوگوں کو یہ خیال ہو رہا تھا کہ اتنے عبادت گزار لوگوں سے لڑا جائے؟ مسلم کی اس روایت میں اس کے بعد قتال کا ذکر ہے، اور اس بات کا کہ مذکورہ حلیے والا شخص لاشوں میں تلاش کیا گیا، ابتدا میں نہیں ملا،

---

[1] -**صحیح مسلم**،کتاب الزکوۃ،باب التحریض علی قتل الخوارج،رقم:١٠٦٦۔

حضرت علیؓ بذاتِ خود تلاش میں لگے، بہت سی لاشیں ادھر ادھر کرنے کے بعد آخر کار اس کی لاش مل گئی۔

امام احمد کے صاحب زادے عبد اللہ بن احمد نے **کتاب السنة** میں اس موضوع پر کافی روایات جمع کر دی ہیں۔ مزید روایات میں اسی پر انحصار کیا جائے گا۔ کسی اور کتاب کی روایت ہوئی تو تصریح کر دی جائے گی۔ طارق بن زیاد کہتے ہیں حضرت علیؓ نے مذکورہ حلیے کا شخص تلاش کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر اس کی لاش ان میں نہ ملی تو تم نے (واقعی) بہترین لوگوں کو قتل کیا ہوگا (جیسا کہ بادی النظر میں شبہ ہو سکتا تھا، اس لیے کہ دیکھنے میں یہ انتہائی عبادت گزار لوگ تھے۔) اور اگر وہ مل گیا تو تم نے بدترین لوگوں کو قتل کیا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تو ہم رو پڑے، حضرت علیؓ نے فرمایا: تلاش کرو، چناں چہ تلاشِ بسیار کے بعد وہ مل گیا۔[1] حضرت ابو جحیفہؓ کی روایت ہے کہ جب ابتدا میں تلاش کے باوجود نہ ملا تو حضرت علیؓ کو جتنا پریشان میں نے دیکھا، ویسا پریشان اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر آپ نے پوچھا اس جگہ کا نام کیا ہے، بتایا گیا نہروان ہی ہے۔ آپ نے پھر (پورے وثوق سے فرمایا) تم غلط کہتے ہو کہ اس کی لاش نہیں ہے، وہ انھیں میں ہے۔ پھر تلاش کرو۔ لاشوں کو الٹ پلٹ کرنے پر اس کی لاش مل گئی۔ زید بن وہب کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے، پھر مزید تلاش پر اس کی لاش مل گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا اور فرمایا صدق اللہ وبلّغ رسولہ، اللہ نے سچ کہا اور

---

۱- ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن احمد بن حنبل، **السنة**، ت، محمد بن سعید بن سالم القحطانی (الدمام: دار ابن القیم، ۱۹۸۶ء)، رقم: ۱۴۹۸۔

اللہ کے رسول نے بات صحیح پہنچائی۔ **صحیح مسلم** کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب لوگوں نے آکر بتایا کہ تلاش کیا پر نہیں ملا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا ارجعوا، فواللہ ماکذَبتُ ولا کُذبت ، جاؤ جاکر مزید تلاش کرو، اس لیے کہ نہ تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت میں غلط بیانی کی ہے اور نہ ہی مجھ سے جھوٹ بولا گیا، یعنی جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی فرمائی تھی۔ یہ بھی متعدد روایتوں میں آتا ہے کہ لاش ملنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سجدے میں گر گئے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اتنے خوش ہوئے کہ اگر خوشی کی وجہ سے روح پرواز کر سکتی ہوتی تو اس دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روح پرواز کر جاتی۔ عاصم بن کلیب کی اپنے والد سے روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعد میں ایک موقع پر اس بات کا حوالہ دیا کہ تم تو کہتے تھے وہ لاش ہے ہی نہیں، بعد میں تم نے گھسیٹتے ہوئے نکالی۔ حاضرین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس بات کی تائید کی کہ ایسے ہی ہوا تھا۔

تقریباً اسی مضمون کی حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بھی روایت کرتے ہیں۔ **صحیح مسلم** میں حضرت ابو سعید کے لفظ یہ ہیں:

فأشهد أني سمعت هذا من رسول الله ﷺ، وأشهد أن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قاتلهم وأنا معه، فأمر بذلك الرجل فالتمس، فوجد، فأتي به، حتى نظرت إليه، على نعت رسول الله ﷺ الذي نعت.[1]

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں حضرت علی بن ابی طالب نے ان سے قتال کیا، جب کہ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ پھر حضرت علیؓ نے اس شخص کے بارے میں حکم فرمایا تو اسے تلاش کیا گیا اور وہ مل گیا۔ میں نے اسے اسی صفت پر دیکھا جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی تھی۔

اس حدیث سے ایک تو صفین وغیرہ میں بھی حضرت علیؓ کے صواب ہونے پر بھی اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ خوارج کی احادیث کی بعض روایتوں میں آتا ہے یلي قتلهم أولى الطائفتين بالحق، یعنی خوارج کو قتل کرنے کا بیڑا اس وقت کے دو گروہوں میں وہ اٹھائے گا جو حق کے بہت قریب ہو گا۔ تاہم چوں کہ صفین میں حضرت علی کے قتال پر بات ہو چکی ہے، اس لیے اس استدلال کی تفصیل سے گریز کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہاں یہ بحثیں بھی چھیڑی ہیں کہ خوارج سے قتال صرف حضرت علیؓ نے نہیں کیا، حضرت علیؓ کے بعد بھی متعدد لوگوں نے کیا ہے، لیکن شروع میں وضاحت ہو چکی ہے کہ خوارج کے بارے میں ایک تو عمومی حدیثیں ہیں جن کے مطابق خوارج سے قتال قربِ قیامت تک چلتا رہے گا۔ دوسری وہ حدیثیں ہیں جن میں خوارج کی ایک متعین جماعت کا بیان ہے، جس میں ایک متعین حلیے کا شخص ہو گا۔ یہ ایک متعین قتال

---

۱ -**صحیح مسلم**، کتاب الزکاۃ، باب ذکر الخوارج وصفاتهم، رقم:۱۰۶۴۔

کے بارے میں حدیثیں ہیں۔ پہلی قسم کی حدیثیں بھی حضرت علیؓ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف خوارج کے خلاف قتال کیا، بلکہ سب سے پہلا قتال کیا، لیکن ہمارا اصل موضوع دوسری قسم کی حدیثیں ہیں۔

اس حدیث سے خوارج سے قتال کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کے کام اصلا امامِ وقت ہی کے کرنے کے ہوتے ہیں؛ اس لیے اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے وقت کے امام تھے۔ ایک شخص خود کو خلیفہ کہلواتا پھر رہا ہے، لیکن حقیقت میں خلیفہ ہے نہیں؛ اس کے اقدام کے لیے اس طرح کی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ جس جماعت نے خوارج کی اس ٹکڑی کے خلاف قتال کیا تھا، وہ بطور جماعت اس وقت روے زمین کی بہترین جماعت تھی اور وہ وہ کام کر رہی تھی جو اس وقت کے لحاظ سے انتہائی فضیلت کا کام تھا۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ حضرت علیؓ نے خوارج کو کافر قرار نہیں دیا تھا۔ اس لیے یہ داخلی قتال ہی تھا۔ معلوم ہوا کہ داخلی قتال بھی بعض اوقات انتہائی فضیلت کا کام ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جن حضراتِ صحابہ نے قتال میں شرکت کرنے سے محض اس وجہ سے گریز کیا کہ یہ داخلی لڑائی ہے اور ایسی لڑائی سے الگ رہنا چاہیے، ان سے اجتہاد اور فہم نصوص میں غلطی ہوئی (جیسا کہ آگے مشاجرات کی بحث میں ہم ذکر کریں گے) کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک داخلی قتال ہی کی فضیلت بیان فرما رہے ہیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ خوارج کے خلاف اس عظیم ترین جہاد میں شرکت کی سعادت انھیں حضرات کو حاصل ہوئی، جو پچھلے قتالوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو کہ پچھلے قتالوں میں تو کوئی صاحب قصداً

غیر شریک رہے ہوں، جب پتا چلا کہ یہ فضیلت والا قتال ہونے لگا ہے، تو وہ جلدی سے آکر قتال میں شریک ہوگئے ہوں۔ **صحیح مسلم** میں قتالِ خوارج سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو خطبہ ہے جس میں وہ بتا رہے ہیں کہ ان کے خلاف قتال اہلِ شام کے خلاف قتال سے زیادہ اہم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خوارج کے خلاف اس قتال میں بنیادی طور پر وہ لوگ شامل تھے جو اہلِ شام کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال میں پر جوش تھے۔ خوارج کی اس مخصوص جماعت کے خلاف قتال کی یہ عظیم فضیلت (جو عہدِ نبوی کے بعد کے تاریخ کے شاید ہی کسی قتال کی بیان ہوئی ہو) انھی لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو پہلے سے حضرت علیؓ کے ساتھ چلے آرہے تھے۔ **صحیح مسلم** کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے خوارج کی حدیث سنا کر فرمایا وأنتم قتلتموہ یا أهل العراق[1]، عراقیو! یہ سعادت تمھارے حصے میں آئی ہے۔ اس زمانے میں اس طرح کے سیاق میں جس طرح اہل شام سے مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ ہوتے تھے اسی طرح اہلِ عراق سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت کے لوگ ہوتے تھے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ اس خاص قتال کی سعادت انھی لوگوں کو حاصل ہوئی ہے جو پہلے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گروہ کا حصہ تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صداقت کی سب سے اہم علامت اس گروہ میں مخصوص حلیے کے شخص کا پایا جانا ہے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس کی لاش کی تلاش کا بہت اہتمام تھا۔ بظاہر لگتا ہے کہ صحابہ میں یہ بات معروف تھی کہ اس طرح کا شخص مارا جائے گا اور اس کا

---

۱- **صحیح مسلم**، کتاب الزکاۃ، باب ذکر الخوارج وصفاتہم، رقم:۱۰۶۴۔

انتظار کیا جارہا تھا کہ کس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ عموماً اسے ''ذا الثدية'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے پہلے ہی بے پر کی اڑائی ہوئی تھی کہ ہم نے اس حلیے کے آدمی کو قتل کیا ہے۔ جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا، خود ام المؤمنین کو بھی بعض نے اس طرح کی غلط خبر دی تھی۔ عبد اللہ بن احمد کی **كتاب السنة** کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے ذوالثدیہ کی لاش برآمد ہونے پر فرمایا تھا: صدق الله ورسوله، من حدثني من الناس أنه رآه قبل مصرعه هذا، فإنه كذاب.[1] (اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے۔ جس نے اس کی اس موت سے پہلے کے بارے میں بتایا ہے کہ اس نے دیکھا ہے وہ جھوٹا ہے۔)

## حضرت علی کا قتلِ خوارج سے اپنی حقانیت پر استدلال

عبد اللہ بن احمد کی **كتاب السنة** میں زر بن حبیش حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

أنا فقأتُ عين الفتنة ، ولولا أنا ما قوتل أهل النهروان ولا أهل الجمل، ولولا أني أخشى أن تتركوا العمل لأخبرتُكم بالذي قضى الله عزوجل على لسان نبيكم ﷺ لمن قاتلهم مبصرا لضلالتهم وعارفا للهدى الذي نحن فيه.[2]

---

۱ -عبد اللہ بن احمد، **السنة**، سُئِلَ عَنِ الْخَوَارِجِ وَمَنْ قَالَ: هُمْ كِلَابُ النَّارِ، رقم:۱۴۹۹۔

۲ - نفس مصدر، رقم:۱۴۹۴۔

میں فتنے کی آنکھ پھوڑنے والا ہوں، میں نہ ہوتا تو نہ اہلِ نہروان سے قتال ہوتا نہ اہلِ جمل سے۔ اگر مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ فضیلت سن کر مزید عمل ہی چھوڑ بیٹھوگے تو تمھیں بتاتا کہ اللہ عزوجل نے تمھارے نبی ﷺ کی زبان پر ان لوگوں کے حق میں کیا فیصلے فرمائے ہیں جنھوں نے ان کی غلط روی کی بصیرت حاصل کرکے اور جس حق پر ہم ہیں، اسے پہچان کر ان سے قتال کیا ہے۔

## قتل خوارج سے حضرت علیؓ کی حقانیت پر حضرت عائشہؓ کا استدلال

خوارج سے قتال اور ذوالثدیہ کے قتل کا تذکرہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے گھر میں ایسے موقع پر بھی فرمایا جب کہ وہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما موجود تھے۔[1] بیہقی کی **دلائل النبوة** کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لقد علمتْ عائشة أن جيش المروة وأهل النهر ملعونون على لسان محمد ﷺ.[2]، یعنی عائشہؓ کو اس بات کا علم ہے کہ جیش المروۃ اور اہل نہروان (خوارج) محمد ﷺ کی زبان پر ملعون ہیں۔ اہل مروۃ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش بپا کرنے والوں کی ایک جماعت تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف گڑبڑ کرنے والوں کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیا خیالات وجذبات تھے۔ بہر حال دیگر صحابہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ پیش گوئی معلوم تھی، اس لیے لازمی بات ہے کہ جس طرح حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں لوگوں کو تجسس تھا کہ کس کے

---

۱۔ نفسِ مصدر، رقم: ۱۴۸۴۔

۲۔ احمد بن الحسین بن علی البیہقی، **دلائل النبوة**، ت، عبد المعطی قلعجی (بیروت: دار الكتب العلمية، ۱۹۸۸ء)، ۶: ۴۳۴۔

ہاتھوں شہید ہوتے ہیں، اسی طرح ذو الثدیہ کے بارے میں بعض ذہنوں میں یہ بات ہو گی، بالخصوص حضرت عائشہؓ کے ذہن میں؛ اس لیے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد براہِ راست سنا ہوا تھا۔ اسی لیے بعض لوگوں نے بہت پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس غلط فہمی میں رکھنے کی کوشش کی کہ وہ شخص مصر میں مارا گیا ہے، تاکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذہن کسی اور طرف متوجہ نہ ہو، لیکن یہ چالا کی زیادہ دیر چل نہیں سکی اور حضرت عائشہؓ کو جب یقین ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی جماعت کے ہاتھوں وہ مارا گیا ہے، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقانیت کا اعتراف بھی کیا اور اس واقعے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سچائی کی دلیل سمجھا۔

چناں چہ مسروق کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات متعدد حضرات نے روایت کی ہے۔ مثلاً بیہقی کی **دلائل النبوۃ** میں شعبی مسروق سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ تمھیں اس ذو الثدیہ کا علم ہے جسے علی رضی اللہ عنہ نے حروریہ (خوارج) کے ساتھ قتل کیا ہے؟ (الآجری کی **الشریعۃ** کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ تم نے اسے دیکھا ہے؟ مسروق نے کہا: دیکھا تو نہیں، بہت سے دیکھنے والوں نے مجھے بتایا ہے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مسروق سے کہا کہ جب وہاں یعنی کوفے میں جانا تو ان لوگوں کی گواہیاں قلم بند کرنا۔ میں کوفے میں واپس آیا تو وہاں لوگوں کے مختلف گروہ تھے۔ (اتنے سارے لوگوں کی گواہیاں جمع کرنا تو مشکل تھا) میں نے ہر گروہ میں سے دس دس افراد کی گواہی قلم بند کی۔ یہ سب کے سب عینی شاہد تھے، جنھوں نے اس کی لاش کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ (الآجری کی روایت میں ہے کہ میں نے ام المؤمنین سے کہا یہ سب کے سب عادل اور پسندیدہ لوگ ہیں، یعنی گئے گزرے گواہ نہیں ہیں۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا انھوں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے ان گواہوں سے یہ بات دریافت کی تھی، ان سب نے بتایا کہ ہم میں سے ہر ایک نے خود دیکھا تھا۔ اس پر ام المؤمنین نے فرمایا: اللہ فلاں پر لعنت کرے کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ذوالثدیہ کو مصر میں نیل کے کنارے قتل کیا تھا۔ (اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس دور میں بڑی شخصیات کو اندھیرے میں رکھنے کے لیے کیا کچھ کیا گیا تھا۔) پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آنسو پھوٹ پڑے، جب آنسو تھمے تو فرمانے لگیں:

رَحِمَ اللهُ عَلِيًّا لَقَدْ كَانَ عَلَى الْحَقِّ، وَمَا كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ إِلَّا كَمَا يَكُونُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَأَحْمَائِهَا.[1]

اللہ، علی پر رحم کرے، یہ پکی بات ہے کہ وہ حق پر تھے۔ میرے ان کے درمیان بس وہی معاملہ تھا جو عورت اور اس کے سسرالی رشتہ داروں کے درمیان (فطری طور پر) ہوتا ہی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس بات سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھتی تھیں اور خوارج کے اس واقعہ کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقانیت کی دلیل سمجھتی تھیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ جس طرح کی پرخاش کی وہ بات کر رہی ہیں، وہ فطری ہوتی ہے، اسے دشمنی نہیں کہا جاسکتا، جس طرح سوکنوں کے درمیان معاملات کا کوئی مظہر ازواجِ مطہرات میں نظر آئے تو اسے ان کی باہمی دشمنی نہیں کہا جاسکتا؛ البتہ چالاک لوگ بڑے لوگوں میں

---

۱۔ بیہقی، **دلائل النبوة**، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِخْبَارِهِ بِخُرُوجِهِمْ وَسِيمَاهُمْ الخ، ۶:۴۳۵۔

غلط فہمیاں پیدا کر دیں، تو یہ الگ بات ہے۔ ابھی جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ذکر کی گئی، اسی سے ملتے جلتے مضمون کی حدیث حاکم نے **المستدرک** میں بھی روایت کی ہے اور حاکم اور ذہبی دونوں نے اسے بخاری و مسلم کے معیار کی صحیح قرار دیا ہے۔(1)

یہ متعدد روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اہلِ جمل کے بارے میں فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ہم اس آیت کا مصداق ہوں گے: وَنَزَعْنا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَاناً عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينْ (اور ان (جنتیوں) کے دل میں جو کوئی کینہ ہو گا بھی تو ہم اسے کھینچ کر نکال ڈالیں گے، اس حالت میں یہ لوگ تختوں پر آمنے سامنے ہوں گے)۔ یعنی سب جنت میں جائیں گے، اور دلوں میں جو کدورت ہو گی وہ نکل چکی ہو گی۔ حضرت عائشہؓ کو چوں کہ جمل کے واقعے کے بعد طویل عرصہ دنیا میں رہنے کا موقع ملا، اس لیے ان کے بارے میں تو واضح طور پر کئی روایات مل گئیں کہ صرف آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی ان کا دل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے انتہائی صاف ہو چکا تھا اور وہ ان کی حقانیت واضح کر کے دنیا سے گئی ہیں۔

---

1 - **المستدرك على الصحيحين**، كتاب معرفة الصحابة رضي الله عنهم، ذكر الصحابيات من أزواج رسول الله ﷺ وغيرهن رضي الله عنهن، فأول من نبدأ بهن الصديقة بنت الصديق عائشة بنت أبي بكر رضي الله عنهما، رقم: ۶۷۴۴۔ مستدرکِ حاکم کی روایت میں نام بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بتانے والے کہ ذوالثدیہ مصر میں مارا گیا ہے عمرو بن العاصؓ تھے۔ ان کی طرف سے دفاع میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دیگر بعض روایتوں میں "زعم لي" کی جگہ "كتب إليّ فلان" ہے، ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خط کے ذریعے یہ غلط اطلاع دی گئی ہو اور خط کسی نے جعل سازی کرتے ہوئے حضرت عمرو کے نام پر بنا لیا ہو۔

## حضرت علی کا خطبۂ بصرہ اور ایک اشکال

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں دیا گیا ایک خطبہ مشہور ہے، جو اس موضوع پر کافی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ اس کے کچھ الفاظ کو اس بات کا قرینہ بناتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے بارے میں کوئی پیش گوئی موجود ہی نہیں تھی۔ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ حضرت یہ بتایئے کہ آپ کا یہ نکلنا آپ کی رائے ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے جو آپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کسی عہد کی موجودگی کی نفی فرمائی۔ چناں چہ ایک روایت کے لفظ یہ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> قال: فتشهد علي رضي الله عنه قال: وكان القوم إذا تكلموا تشهدوا قال: فقال: أما أن يكون عندي عهد من رسول الله ﷺ فلا والله.[1]

> حضرت علیؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی موضوع پر بات کرتے تھے تو اللہ کی حمد ثنا کرتے تھے، اور فرمایا کہ یہ بات کہ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عہد ہو تو اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے۔

بعض لوگ اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی تصویب پر دلالت کرنے والی کوئی حدیث موجود نہیں تھی۔ نیز حضرت علیؓ نے جنگ جمل اور صفین کے بعد اظہارِ افسوس کیا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں تھی۔

---

۱- الآجری، **الشریعة**، رقم: ۱۱۹۴۔

حضرت علیؓ نے تحکیم کو قبول فرمایا جس میں ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کے خلاف فیصلہ آنے کا بھی امکان تھا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ کے لیے کوئی نص موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیدی امور کے چوتھے اور پانچویں نمبر پر پیش گوئیوں کی حیثیت واضح کر چکے ہیں۔ ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ ان احادیث سے شریعت کے عمومی ادلہ سے استدلال کا سلسلہ باطل نہیں ہوتا۔ پیش گوئی کی حدیثوں کی موجودگی کے باوجود خلفاے راشدین عمومی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں، سابقہ خلفا کے حوالے سے اس کی متعدد مثالیں بھی وہیں ذکر کی جاچکی ہیں۔ وضاحت سے یہ بتایا جاچکا ہے کہ جب پیش گوئی کی احادیث صحیح طریقے سے ثابت ہوں تو اس طرح کے قرائن کی وجہ سے ان احادیث کو رد نہیں کیا جاتا، بلکہ تطبیق کی کوئی نہ شکل نکال لی جاتی ہے، وگرنہ تقریبا تمام خلفا کے بارے میں آنے والی احادیث کو اس طرح کے قرائن کی بنیاد پر رد کرنا پڑے گا۔ جو اصول باقی خلفا کے بارے میں اپنایا جاتا ہے وہی یہاں پر ہونا چاہیے۔ یہ احادیث ان حضرات کے فیصلوں کی درستی پر ضرور دلالت کرتی ہیں، لیکن بعض اوقات کسی واقعے کا کسی پیش گوئی کے تحت آنا فوری طور پر واضح نہیں ہوتا، اس وضوح میں کچھ وقت لگتا ہے۔

حضرت علیؓ کو خصوصاً جنگِ جمل کے بعد شدید افسوس ضرور ہوا اور یہاں تک فرمایا کہ کاش میں آج سے بیس سال پہلے مر چکا ہوتا۔[1] اتنے بڑے انسانی حادثے پر حضرت علی جیسے حساس شخص کو افسوس ہونا ہی چاہیے تھا۔ یہ اس لیے بھی تھا کہ مقابلے میں مارے جانوں میں طلحہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ باقی بھی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں حضرت علی نے قتلاهم في الجنة (ان کے مقتول بھی جنتی ہیں) فرمایا۔ بلکہ طبرانی کی ایک روایت

---

۱- ابو بکر الخلال، السنۃ رقم: ۷۴۸۔

کے مطابق تو حضرت علی سے اظہارِ افسوس کے یہ کلمات صادر ہی اس وقت ہوئے جب آپؓ نے حضرت طلحہ کی لاش دیکھی اور آپ نے سواری سے اترت کر حضرت طلحہ کو بٹھایا اور اظہارِ محبت کے طور پر ان کے چہرۂ مبارک سے غبار صاف کیا(رضی اللہ عنہم جمیعا)، ہیثمی نے طبرانی کی اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔[1] جب کہ خوارج کا معاملہ بالکل برعکس تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود انہیں شر قتلی (بدترین مقتول) قرار دیا تھا۔ اس افسوس کا یہ مطلب ہرگز نہیں حضرت علی کو اپنے بنیادی موقف ہی میں تردد ہو گیا تھا، جیسا کہ ابھی ہم بتائیں گے کہ اس کے بعد حضرت علی نے بصرہ میں جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے موقف کا مدلل اعادہ کیا۔ افسوس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ قتال مکمل طور پر باقاعدہ پالیسی فیصلے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس سے گریز کے امکانات موجود تھے۔ بہر حال محض اظہارِ افسوس یا اس طرح کے قرائن کو بنیاد بنا کر اتنی تعداد میں صحیح یا حسن حدیثوں کو رد کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو بہت دور تک جائے گی۔

خصوصا حضرت علیؓ کے اس خطبے کے بارے میں کچھ باتیں پیشِ نظر رہنا ضروری ہیں۔ ایک تو حضرت علیؓ نے یہ بات جنگ جمل کے فورا بعد بصرہ میں فرمائی۔ اس لیے کم از کم بعد کی جنگوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ خصوصاً حضرت علیؓ کے قتالوں کے بارے میں پیش گوئیوں کی تکمیل کا عروج خوارج سے قتال اور ذو الثدیہ کی لاش کا ملنا ہے اور اس سے پورا منظر نامہ مکمل طور پر واضح ہوا۔ مثلا رسول اللہ ﷺ نے اگر ناکثین وغیرہ سے قتال کی بابت فرمایا تھا کہ تو ضروری نہیں کہ ناکثین کے نام بھی بتائے ہوں، جب تک تمام قتال مکمل نہیں ہو جاتے تب ان واقعات پر ان حدیثوں کا عملی انطباق حتمی نہیں ہو تا بلکہ امکان

۱۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۹: ۱۵۰، کتاب المناقب، باب مناقب طلحۃ بن عبید اللہ۔

ہوتا ہے کہ کل کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جو اس پیش گوئی کا مصداق بننے کا اس سے زیادہ مستحق ہو۔ حضرت علی کو بہت حد تک یقین تھا ذا الثدیہ والے لوگ یہی ہیں، لیکن لاش نہ ملنے تک حضرت علی کو پریشانی ضرور ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ یہ فرمان کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی عہد نہیں بلکہ ہماری رائے ہے، حضرت علی اپنی خلافت کے بارے میں فرما رہے ہیں۔ اور یہ بات تو اہل السنت کے ہاں اتفاقی ہے کہ بطور امر اور بطور وصیت کسی کی بھی خلافت منصوص نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے یہ ساری بات در حقیقت ایک سوال کے جواب میں فرمائی تھی۔ بعض روایات میں سوال کے لفظ یہ ہیں: أخبِرْنا عن مسيرك هذا الذي سرتَ،[1] آپ اپنے اس نکلنے کے بارے میں بتائیے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد کی وجہ سے تھا یا محض آپ کی رائے تھی۔ اگر سوال کو اسی طرح اپنے ظاہری الفاظ پر ہی رکھیں تب بھی یہ واضح ہے کہ طلحہؓ وزبیرؓ وغیرہ کے اجتماع کی خبر پر حضرت علیؓ کا یہ فیصلہ، کہ مجھے مدینہ میں رہ کر انتظار کرنا چاہیے یا خود نکل کر ان کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، حضرت علی کی رائے ہی تھی۔ اگر سوال کے اسی لفظ پر اصرار کرنا ہو تو اس کا تعلق تو صرف ایک جزوی معاملے کے ساتھ ہے کہ مدینہ میں رہ کر ان کے لشکر کا انتظار کیا جائے یا خود ان کی طرف جایا جائے، باقی معاملات کے ساتھ حضرت علی کے اس ارشاد کا کوئی تعلق بنتا ہی نہیں ہے۔ اگر مجموعہ روایات سے بات کو سمجھنا ہو — اور صحیح طریقہ یہی ہے — تو پھر جیسا کہ پہلے عرض کیا عدمِ نص یا عدمِ عہد کا تعلق خود خلافت کے ساتھ

---

۱- الآجری، **الشریعة**، رقم: ۱۱۹۴۔

ہے، یعنی حضرت علی فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ خلافت منصوص نہیں بلکہ رائے ہے۔ چناں چہ خود مذکورہ بالا روایت ہی میں پورا سوال یہ ہے:

عن الحسن قال: دخل عبد الله بن الكوا وقيس بن عباد على علي بن أبي طالب رضي الله عنه بعدما فرغ من قتال الجمل فقالا له: أخبرنا عن مسيرك هذا الذي سرت: رأيا رأيته حين تفرقت الأمة واختلفت الدعوة إنك أحق الناس بهذا الأمر فإن كان رأيا رأيته أجبناك في رأيك ، وإن كان عهدا عهد إليك رسول الله ﷺ فأنت الموثوق المأمون على رسول الله ﷺ فيما تحدث عنه.[1]

حسن بصری کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن الکواء اور قیس بن عباد جمل سے فراغت کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں بتایئے اپنے اس نکلنے کے بارے میں، کیا آپ کی وہ رائے تھی جو آپ نے افتراقِ امت کے وقت اختیار کی کہ آپ ہی اس امر [خلافت] کے زیادہ حق دار ہیں۔ اگر رائے ہو گی تو ہم آپ کی رائے کو اختیار کریں گے اور اگر رسول اللہ ﷺ کا کوئی عہد (وصیت) ہو گی تو رسول اللہ ﷺ سے جو آپ نقل کریں گے اس میں آپ قابلِ اعتماد اور قابلِ اطمینان ہیں۔

اس روایت کے اندر سوال کا اگلا جملہ ہی متعین کر رہا ہے کہ سوال حضرت علیؓ کے خلافت کے سب سے زیادہ حق دار ہونے کے بارے میں ہے، بلکہ حضرت علیؓ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بعض لوگوں کے ذہنوں میں غلطی پیدا کر دی گئی تھی کہ آپ رسول اللہ کے وصی ہیں اور رسول اللہ ﷺ آپ کے بارے میں وصیت کر کے گئے

---

۱۔ نفسِ مصدر۔

تھے کہ میرے فوراً بعد خلیفہ علیؓ ہوں گے۔ حضرت علیؓ اس کی بھی تردید کر رہے ہیں اور آج کے وقت میں اپنی خلافت کا صحیح اور واجب الاطاعت ہونا بھی بیان کر رہے ہیں۔ چناں چہ اسی روایت میں حضرت علیؓ کے جواب کے آغاز ہی میں ہے کہ اگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف سے اس طرح کا عہد ہوتا (یعنی خلافت بلافصل کا) تو میں ابو بکرؓ کی خلافت کو کبھی نہ چلنے دیتا۔ حضرت علیؓ سے سوال کرنے والے دو شخص ہیں: ایک ابن الکواء دوسرے قیس بن عباد۔ قیس کے صاحب زادے اسود کی روایت میں لفظ یہ ہیں:

إن رسول الله ﷺ لم يعهد إلينا عهدا نأخذ به في الإمارة، ولكن شيء رأيناه من قبل أنفسنا، فإن يك صوابا فمن الله، وإن يك خطأ فمن قبل أنفسنا. [1]

اس میں حضرت علیؓ صراحتا بتا رہے ہیں کہ میرے بعد کس کو امیر بنانا ہے اس بارے میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کوئی عہد نہیں فرمایا تھا۔ یہ وہی بات ہے جو اہل السنت کا مذہب ہے اور یہی بات باقی خطبے سے سمجھ میں آرہی ہے کہ اگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا عہد ہوتا تو میں پہلوں کی اطاعت نہ کرتا۔ یہاں حضرت علیؓ کا پورا خطبہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ حضرت علیؓ اس میں اپنا مقدمہ بہت خوب صورتی سے پیش کر رہے ہیں۔ اس میں حضرت علیؓ کا جو اصل موضوعِ خطاب ہے اس کو نظر انداز کرکے بات کو کچھ کا کچھ بنا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خطبہ تشیع اور نصب دونوں کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس میں اس بات کا بھی برملا اظہار ہے کہ خلافت منصوص چیز نہیں ہے، نہ ہی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہی نے کسی کے خلیفہ بلافصل ہونے کی وصیت یا عہد فرمایا تھا۔ اس میں اس بات کا بھی برملا اظہار ہے کہ پہلے خلفا کی خلافت

---

۱- ابو عبد اللہ نعیم بن حماد المروزی، **كتاب الفتن** (قاہرہ: مكتبة التوحيد، ۱۴۱۲ھ)، رقم: ۱۹۷۔

درست تھی اور حضرت علیؓ نے ان کی اطاعت کی۔ اسی میں اس بات کا بھی اظہار ہے کہ میں نے جب پہلوں کی اطاعت کی تو اب جب باقاعدہ طریقے سے میری باری آئی ہے تو جس طرح پہلوں کی اطاعت کی گئی میری بھی کی جانی چاہیے۔ الآجری کی **الشريعة** سے ہم یہاں پہلے اس خطبے کا جامع متن پیش کرتے ہیں، پھر ایک آدھ مزید بات دوسری روایتوں سے نقل کرتے ہیں:[1]

---

[1]- الآجری، **الشريعة**، رقم:۱۱۹۴۔ روایت کے لفظ یہ ہیں:

عن الحسن قال: دخل عبد الله بن الكواء وقيس بن عباد على علي بن أبي طالب رضي الله عنه بعدما فرغ من قتال الجمل فقالا له: أخبرنا عن مسيرك هذا الذي سرتَ: رأيا رأيته حين تفرقت الأمة واختلفت الدعوة إنك أحق الناس بهذا الأمر ، فإن كان رأيا رأيته أجبناك في رأيك وإن كان عهدا عهد إليك رسول الله ﷺفأنت الموثوق المأمون على رسول الله ﷺ فيما تحدث عنه قال: فتشهد علي رضي الله عنه قال: وكان القوم إذا تكلموا تشهدوا قال: فقال: أما أن يكون عندي عهد من رسول الله ﷺ فلا والله ولو كان عندي عهد من رسول اللهﷺ ما تركت أخا تيم بن مرة ولا ابن الخطاب على منبره ولو لم أجد إلا يدي هذه ولكن نبيكم ﷺ نبي رحمة لم يمت فجأة ولم يقتل قتلا ، مرض ليالي وأياما وأياما وليالي فيأتيه بلال فيؤذنه بالصلاة ، فيقول مروا أبا بكر فليصل بالناس ، وهو يرى مكاني فلما قبض رسول الله ﷺ نظرنا في أمرنا فإذا الصلاة عضد الإسلام وقوام

حسن بصری کہتے ہیں کہ عبداللہ بن الکواء اور قیس بن عباد جمل سے فراغت کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں بتایئے اپنے اس نکلنے کے بارے میں، کیا آپ کی یہ ایسی رائے تھی جو آپ نے افتراقِ امت کے وقت اختیار کی کہ آپ ہی

---

الدين فرضينا لدنيانا من رضي رسول الله ﷺ لديننا فولينا الأمر أبا بكر رضي الله عنه، فأقام أبو بكر رحمه الله بين أظهرنا، الكلمة جامعة والأمر واحد لا يختلف عليه منا اثنان ، ولا يشهد أحد منا على أحد بالشرك ، ولا نقطع منه البراءة، فكنت والله آخذ إذا أعطاني وأغزو إذا أغزاني وأضرب بيدي هذه الحدود بين يديه فلما حضرت أبا بكر الوفاة ولاها عمر رحمه الله فأقام عمر بين أظهرنا الكلمة جامعة والأمر واحد لا يختلف عليه منا اثنان ولا يشهد أحد منا على أحد بالشرك ولا نقطع منه البراءة فكنت والله آخذ إذا أعطاني وأغزوا إذا أغزاني وأضرب بيدي هذه الحدود بين يديه فلما حضرت عمر رضي الله عنه الوفاة ظن أنه إن يستخلف خليفة فيعمل ذلك الخليفة بخطيئة إلا لحقت عمر في قبره فأخرج منها ولده وأهل بيته وجعلها في ستة رهط من أصحاب رسول الله ﷺ كان فيها عبد الرحمن بن عوف فقال: هل لكم أن أدع نصيبي منها على أن أختار لله ولرسوله وأخذ ميثاقنا على أن نسمع ونطيع لمن ولاه أمرنا فضرب بيده يد عثمان فبايعه فنظرت في أمري فإذا طاعتي قد سبقت بيعتي وإذا الميثاق في عنقي لعثمان فاتبعت عثمان رحمه الله لطاعته حتى أديت له حقه.

اس امر [خلافت] کے زیادہ حق دار ہیں۔ اگر رائے ہوگی تو ہم آپ کی رائے کو اختیار کریں گے اور اگر رسول اللہ ﷺ کا کوئی عہد (وصیت) ہوگی تو رسول اللہ ﷺ سے جو آپ نقل کریں گے اس میں آپ قابلِ اعتماد اور قابلِ اطمینان ہیں۔ چناں چہ حضرت علیؓ نے اللہ تعالی کی حمد و ثنا کی، اور ان حضرات کا طریقہ یہ تھا کہ جب بات کرتے تھے تو پہلے اللہ تعالی کی حمد و ثنا کرتے تھے۔ پھر فرمایا کہ میرے پاس (خلافت بلا فصل) کے باب میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی عہد ہو تو اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر میرے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس طرح کا عہد ہوتا تو میں کبھی بھی بنو تیم کے شخص (حضرت ابو بکر) اور خطاّب کے بیٹے کو آپ ﷺ کے منبر پر نہ رہنے دیتا اگر چہ اس مقصد کے لیے میرا اکیلے کا ہاتھ ہوتا۔ (یعنی میرا کوئی مددگار نہ بھی ہوتا تب بھی اکیلا ان کے خلاف کھڑا ہو جاتا)۔ بات یہ ہے کہ تمہارے نبی ﷺ رحمت والے نبی ہیں۔ ان کا اچانک انتقال نہیں ہوا (کہ کوئی کہہ دے عہد کرنا چاہتے ہوں گے لیکن وقت نہیں ملا) نہ ہی وہ قتل ہوئے، بلکہ کئی دن بیمار رہے۔ اس دوران بلال انھیں نماز کے وقت کے بارے میں مطلع کرنے کے لیے آتے رہے تو آپ فرما دیتے ابو بکر سے کہو وہ نماز پڑھا دیں۔ میری موجودگی رسول اللہ ﷺ کے سامنے تھی (یعنی میری خلافت بلا فصل کی اگر وصیت کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے)۔ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو ہم نے اپنے معاملے میں غور کیا تو ہم نے دیکھا کہ نماز اسلام کا بازو اور دین کی اساس ہے۔ تو ہم نے اپنی دنیا (انتظامی معاملات) کے لیے اسی کو پسند کر لیا، جسے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے دین کے لیے پسند کیا تھا۔ چناں چہ ہم نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنے امور کا ذمہ دار (خلیفہ) بنالیا۔ حضرت ابو بکر اس حالت میں ہمارے درمیان موجود رہے کہ بات اکھٹی تھی، اور معاملہ ایک تھا، ابو بکر پر ہم میں سے دو آدمیوں کا اختلاف نہیں تھا (یعنی ایک مرتبہ خلیفہ بنا لیے گئے تو سب نے ان کی اطاعت کی) ہم میں سے کوئی کسی کو مشرک نہیں کہتا تھا اور کسی سے براءت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اللہ کی قسم جب وہ مجھے دیتے تھے تو لے لیتا تھا، جب جہاد پر بھیجتے تو چلا جاتا تھا، ان کے

سامنے اپنے ان ہاتھوں سے حدود بھی جاری کرتا تھا (یعنی یہ وقت مکمل اطاعت کے ساتھ گزارا)۔ جب حضرت ابو بکرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو وہ یہ ذمہ داری حضرت عمرؓ کو سونپ گئے۔ حضرت عمرؓ بھی ہمارے درمیان اس حالت میں رہے کہ بات اکھٹی تھی، معاملہ ایک تھا، اور ہم میں سے کوئی بھی دو آدمی ان پر اختلاف نہیں کر رہے تھے۔ کوئی کسی کو مشرک نہیں کہتا تھا نہ ہی براءت کا اظہار کرتا تھا۔ وہ بھی جب مجھے دیتے تھے لے لیتا تھا، جب جہاد پر بھیجتے تھے چلا جاتا (نہ کچھ مانگنے پر اصرار نہ کسی مہم میں کمانڈری کا مطالبہ، بلکہ مکمل سرِ تسلیم خم)۔ ان کے سامنے حدود بھی جاری کرتا تھا۔ پھر جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے سوچا کہ اگر وہ کسی کو اپنا ولی عہد اور نائب بنائیں گے اور وہ کوئی غلطی کرے گا تو انھیں بھی قبر میں اس کا وبال پہنچے گا (اس لیے کسی کو ولی عہد بنانے سے گریز کیا اور) اپنے گھر والوں اور خاندان کے لوگوں کو اس معاملے سے الگ رکھا اور خلافت کا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے چھے صحابہ کے درمیان دائر کر دیا جن میں عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ عبد الرحمن بن عوف نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہو گا کہ میں خلافت میں اپنے استحقاق سے اس شرط پر دست بردار ہو جاؤں کہ اللہ و رسول کے لیے تم میں سے کسی کا انتخاب کر دوں؟ چناں چہ انھوں نے ہم سے اس بات پر عہد لیا کہ جس کو وہ یہ ذمہ داری سونپیں گے ہم اس کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ پھر انھوں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، یعنی ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر میں نے اپنے معاملے میں غور کیا تو مجھے نظر آیا کہ میری طاعت میری بیعت سے مقدم ہو چکی ہے اور میری گردن میں حضرت عثمانؓ کے لیے بیعت موجود ہے (یعنی پہلے ہی میں عہد کر چکا تھا کہ عبد الرحمٰن جس کا انتخاب کریں گے اس کی اطاعت کی جائے گی) چناں چہ حضرت عثمانؓ کی بھی اطاعت کی یہاں تک ان کا حق بھی ادا کیا۔

گویا حضرت علیؓ یہ فرما رہے ہیں کہ ابتدا ہی سے میں اپنی اطاعت کرانے کا مطالبہ لے کر کھڑا نہیں ہوا، بلکہ جس جس کے ہاتھ پر بیعت ہوتی رہی، اس کی بے مثال اطاعت کرنے کے بعد اپنی باری پر اور اپنی صحیح طور پر منعقد ہونے والی بیعت کے بعد ہی اپنی اطاعت کروانا چاہتا ہوں۔ یہ تقریباً وہی استدلال ہے جو پہلے ہم امام احمدؒ سے حضرت علیؓ کی خلافت پر نقل کر چکے ہیں۔[1] ایک روایت میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد بھی اسی خطبے میں مروی ہے "پھر کیا وجہ ہے کہ ابو بکر اور عمر کی بیعت تو نبھائی جائے اور میری بیعت توڑی جائے، حالاں کہ مجھے امید ہے کہ میں ان میں سے کسی سے کم نہیں ہوں گا"۔ یعنی جن اصولوں پر ان کی اطاعت ضروری تھی، انھی اصولوں پر میری اطاعت بھی ضروری ہے۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی کارکردگی کی تعریف بھی فرمائی۔[2] ایک مرتبہ پھر یاد دہانی ضروری ہے کہ یہ ساری بات جنگِ جمل کے فوراً بعد ہو رہی ہے۔ اس سے

---

[1]- دیکھیے: سیاسی حالات کی عمومی پیشین گوئیاں کے تحت ذیلی عنوان: "خاندانِ نبوت کی اطاعت و قیام میں اسوہ اور امام احمد کا ایک ارشاد"

[2]- عبد اللہ بن احمد، **السنة** رقم: ۱۳۲۹۔ روایت کے لفظ یہ ہیں: فحمد الله وأثنى عليه وذكر النبيﷺوما عالج من الناس ثم قبضه الله عز وجل إليه ثم رأى المسلمون أن يستخلفوا أبا بكر رضي الله عنه فبايعوا وعاهدوا وسلموا، وبايعت وعاهدت وسلمت، ورضوا ورضيت، وفعل من الخير وجاهد حتى قبضه الله عز وجل، رحمةُ الله عليه، واستخلف عمر رضي الله عنه فبايعه المسلمون وعاهدوا وسلموا، وبايعت وعاهدت وسلمت، ورضوا ورضيت، ففعل وفعل من الخير حتى ضرب الإسلام بجرانه رحمة الله عليه، فما بال أبي بكر وعمر يوفى لهما بيعتهما وما بال بيعتي تنكث، فوالله إني لأرجو أن لا أكون دون امرئ منهما.

یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر جنگ جمل میں حضرت علیؓ کا اظہارِ افسوس کہیں منقول ہے تو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی بنیادی موقف سے دست بر دار ہو گئے تھے۔ یہ بندۂ خدا اپنا سابقہ ریکارڈ دکھا کر اپنا مقدمہ بڑی معقولیت کے ساتھ پیش کر رہا ہے، لیکن اس سے کوئی ہم دردی پیدا ہونے کے بجائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس کے حق میں آنے والی صحیح احادیث کی نفی کے لیے بعض لوگ ایک آدھ جملے کی تلاش میں ہیں۔

# مشاجراتِ صحابہؓ اور مقامِ صحابہؓ کا مسئلہ

اہل السنت والجماعت کا یہ عمومی رخ بھی ہے اور احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت ایک جائز، منعقد خلافت اور خلافتِ راشدہ تھی۔ آپ کے قتال کے فیصلوں سمیت آپ کے بنیادی پالیسی کے فیصلے شرعی طور پر درست اور صواب تھے۔ اب سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسری طرف جو حضرات تھے وہ بھی تو آخر صحابہ ہی تھے، پھر ان کے بارے میں اور ان کے ان اقدامات کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ اس بارے میں بھی اہل السنت والجماعت کی اعتدال پر مبنی ایک گائیڈ لائن موجود ہے جسے نصوص سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، تاہم یہاں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جائیں گے۔

اس بات میں اہل السنت کی دو رائیں نہیں ہیں کہ انسانوں میں مجموعی فضیلت کا حامل سب سے بڑا طبقہ انبیا ورسل علیہم الصلوۃ والتسلیم کا ہے۔ ان کے بعد کائنات کے خوش قسمت ترین افراد وہ ہیں جنھوں نے براہِ راست کسی نبی یا رسول کا دور پایا، اس پر ایمان لایا، اس کے زمانے میں اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوے اور اس کی مدد کی وغیرہ وغیرہ۔ جتنے اعلی مقام کے حامل نبی کی صحبت کسی کو میسر آئی، اتنی ہی بڑی سعادت کا مالک بنا۔ ہمارے نبی محمد مصطفی ﷺ سید الانبیاء، افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں، اس لیے اس کائنات میں ایمان کے ساتھ آپ کی صحبت پانے سے بڑی سعادت کوئی نہیں ہو سکتی؛ اس لیے انبیا کے بعد جس طبقے کا سب سے اونچا مقام ہے، وہ اللہ کے آخری نبی کے صحابہ کا طبقہ ہے۔ صحابۂ کرام کے بارے میں عمومی اور بعض افراد یا بعض طبقاتِ صحابہ کے بارے میں خصوصی نصوص

موجود ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، نہ ہی یہ کوئی ایسا مسئلہ ہے جسے اس گفت گو کے مخاطبین کو قائل کرنے کی ضرورت ہو۔

سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی صحابی سے کوئی غلط عمل سرزد ہونا ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو اس عمل اور عمل کرنے والے کے بارے میں کیا رائے اور رویّہ اختیار کیا جائے گا؟ اور الصحابۃ کلہم عدول والے اصول پر اس کا اثر مرتب ہو گا یا نہیں؟ اس معاملے میں پہلے عہدِ رسالت سے دو مثالوں پر نظر ڈال لینا مناسب ہو گا، اس کے بعد مسئلے کی تفہیم آسان ہو جائے گی۔ ایک مثال قرآنی واقعے سے لی جائے گی اور ایک حدیث سے۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا واقعہ پیش آتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ منافقین کی کارستانی تھی، لیکن، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بعض مخلص صحابہ بھی، جو منافق ہر گز نہیں تھے، اپنی سادگی اور قلتِ فہم کی وجہ سے اس سنگین معاملے کا حصہ بن گئے۔ شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ کئی روز کی پریشانی کے بعد اللہ تعالی نے سورۂ نور کی آیات اتار دیں۔ ان آیات میں جہاں ام المؤمنین کی اس الزام سے براءت اور ان کی پاک دامنی واضح طور پر بتائی گئی ہے، وہیں جو کچھ سرزد ہوا اس پر قرآن نے واضح حکم لگایا اور آئندہ کیا کرنا چاہیے وہ بھی بتایا۔ قرآن نے بتایا کہ اللہ اس ابتلا میں بھی خیر ہی پیدا فرمائیں گے۔ جو لوگ اس معاملے میں شریک ہوئے ان میں ایک تو وہ ہے جو اس سارے معاملے کا مرکز و سرچشمہ تھا، اس کے بابے میں اللہ تعالی نے فرمایا: وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَه مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيْم، اس کے بارے میں اللہ تعالی نے عذابِ عظیم کی

وعید بیان فرمائی، لیکن اس سے کم درجے میں جو لوگ شریک تھے، اگرچہ وہ مؤمن ہی تھے، قرآن نے ان کی غلطی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بیان فرمائی اور بتایا:

- یہ جو تمھیں میں سے ایک گروہ اس بہتان میں شریک تھا ان میں سے جس شخص نے افک (بہتان طرازی) میں جتنا حصہ لیا ہے اس کے مطابق وہ گناہ گار ہے۔( لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْم.)[1]
- اہلِ ایمان کی ذمہ داری تھی کہ وہ یہ الزام سنتے ہی اپنے جیسے اہلِ ایمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے اور اس بات کو واضح بہتان قرار دیتے۔ (لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُبِين)[2] گویا جنھوں نے ایسا نہیں کیا وہ ایک ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر رہے یا یہ کہ اس موقع پر انھیں کیا کرنا چاہیے اسے درست طور پر سمجھنے سے وہ قاصر رہے۔
- اگر اس طرح کے الزام کو ثابت شدہ ماننا تھا تو ضروری تھا کہ وہ حسبِ قاعدۂ قرآنیہ چار گواہ لے کر آتے۔ چار گواہ تو درکنار یہاں تو ایک گواہ بھی ممکن نہیں تھا کہ واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔ چوں کہ مقررہ ثبوت ان کے پاس نہیں، اس لیے یہ سب اللہ کے قانون میں جھوٹے ہیں۔(فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ

---

[1] -النور ۲۴:۱۱۔

[2] - النور ۲۴:۱۲۔

فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللهَّ هُمُ الْكَاذِبُونَ.)[1] یہ جھوٹ کس درجے کا ہے؟اس کی تفصیل خود سورۂ نور ہی کی آیت نمبر چار اور پانچ میں بیان ہوئی ہے کہ اگر چار گواہوں کے بغیر عام پاک دامن خاتون پر کوئی الزام لگاتا ہے (حرمِ رسول ﷺ کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ نازک ہے) تو اس کی سزا کا ایک حصہ یہ ہے کہ شریعت کا قانون اس کی زبان کا اعتبار ختم کر دے گا اور اب قاضی اس کی گواہی قبول کر کے اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرے گا اور اس طرح کی الزام تراشی کرنے والے اللہ کی نظر میں فاسق ہیں۔ ہاں ہر گناہ کی طرح یہاں بھی توبہ کی گنجائش ہے، اگر وہ توبہ کر لیں تو فاسق نہیں رہیں گے، بلکہ فقہا کی ایک جماعت کی تفسیر کے مطابق گواہی بھی قابلِ قبول ہو گی۔

- بذاتِ خود ان کا گناہ اتنا سنگین تھا کہ ہو سکتا تھا کہ یہ اللہ کے بڑے عذاب کا شکار ہو جاتے، لیکن چوں کہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال تھی، اس لیے ایسا نہیں ہوا۔ یعنی تمھارا عمل اپنی ذات میں عذابِ عظیم ہی کا موجب تھا، تاہم ایک عارض کی وجہ سے وہ تاثیر تمھارے حق میں ظاہر نہیں ہوئی۔ یہاں تعبیر کا فرق قابلِ توجہ ہے کہ سرغنے کے لیے تو فرمایا کہ اس کے لیے عذابِ عظیم ہے اور باقیوں کے لیے فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو عذابِ عظیم ہوتا جو در حقیقت اگرچہ شناعتِ فعل کے اعتبار سے عذاب کا اثبات ہے، لیکن واقعاتی اعتبار

---

۱ - النور ۲۴:۱۳۔

سے عذاب کی نفی ہے کہ کام تو تم نے سنگین عذاب والا کیا تھا، لیکن اللہ کے فضل اور رحمت سے تم عذاب کا مورد نہیں بنے۔

- ❖ تم اپنے خیال میں اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے، لیکن اللہ کے ہاں بڑی سنگین بات تھی۔
- ❖ آخر میں ایک بار پھر اللہ تعالی نے وہی بات دہرائی کہ تمھاری ذمہ داری تھی کہ سنتے ہی یہ کہہ دیتے کہ اس طرح کی بات کرنے کی ہمارے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں، یہ بہتانِ عظیم ہے۔

یہ سب باتیں قرآن آئندہ کے بارے میں نہیں کہہ رہا، آئندہ کی بات تو اگلی آیت سے شروع ہو رہی ہے يَعِظُكُمُ اللهُ أَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِه أَبَداً. یہ سب کچھ اب تک جو ہوا اس کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ گناہ کے مرتکب ہوئے، عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والا کام کیا، یہ لوگ جھوٹے ہیں، یہ لوگ اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ بات کہنے کی پوری گنجائش موجود ہے کہ یہ مخلصین جو قذف میں شریک ہوئے، وہ محض سادگی میں ہوئے۔ ام المؤمنین کے ساتھ کوئی ذاتی پرخاش وغیرہ اس کا باعث نہیں تھا۔ بادی النظر میں انھوں نے سمجھا ہو گا کہ فلاں بڑی ہستی سے اتنا بڑا گناہ سرزد ہوا، تو اس ایشو کو اٹھانا تو چاہیے۔ ان کی سادگی کو استعمال کرنے والے بھی ہوں گے، لیکن ان کی نیت کی صفائی کے باوجود اپنی ذات میں اس فعل کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں قرآن نے کوئی لچک نہیں رکھی۔ جو کچھ ان سے ہوا وہ ان کی سنگین غلطی تھی۔ نیت خراب نہ ہونے کا اثر اخروی نتائج میں تو لازماً مرتب ہوتا ہے، دنیوی حکم میں ایسا ہونا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات پر حدِ قذف بھی جاری کی گئی۔ تاہم عند اللہ بہت سی باتوں میں اللہ کے فضل اور

رحمت کی وجہ سے غلطی کی سنگینی کے کئی اثرات ان پر مرتب نہیں بھی ہوئے۔ یہاں قرآن جن کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے وہ مخلص صحابہ ہیں، منافقین نہیں ہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کوئی غلطی اپنی ذات کے اعتبار سے سنگین نتائج کی موجب ہوتی ہے، لیکن کسی خاص صورتِ حال میں یا کسی خاص شخص کے حق میں وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، جیسا کہ یہاں اللہ تعالی نے کہا کہ تمھارا عمل اپنی ذات کے اعتبار سے تو موجبِ عذاب تھا۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ ورسول، صحابہ سمیت کسی کی بھی غلطی کے لیے سخت الفاظ بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ اس لیے پیشین گوئیوں کی حدیثوں میں کہیں سخت الفاظ نظر آئیں تو ان میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

اب اگلا اور یہاں اصل متعلقہ سوال یہ ہے کہ غلطی تو افک میں حصہ لینے والے مؤمنین کی سنگین ہے، لیکن کیا اس غلطی کی وجہ سے انھیں برا بھلا کہنا بھی شروع کر دیا جائے، انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنالیا جائے ؟ خود قرآن کریم، رسول اللہ ﷺ کے اپنے اسوہ اور صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرگز نہیں۔ خود قرآن کی انھی آیات میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ پر خرچ کرنے کا سلسلہ بند کرنے کا ارادہ کیا، تو اللہ تعالی نے اس سے منع کرتے ہوئے یہ خرچ جاری رکھنے کا حکم دیا اور کہا کہ ابو بکرؓ جیسے اہلِ فضل کو چاہیے کو وہ عفو اور درگزر سے کام لیں۔ جب اللہ دوسروں کو عفو کا حکم دے رہا ہے تو ظاہر ہے خود تو وہ سب سے زیادہ معاف کرنے والے ہیں، اس لیے اللہ نے بھی انھیں یقینا معاف کر دیا ہوگا، بلکہ یہ آیاتِ براءت سن کر نہ معلوم ان مخلص صحابہ پر کیا گزری ہوگی ! ناممکن ہے کہ انھیں اپنی غلطی پر شدید ندامت نہ ہوئی ہو، اور یہی توبہ ہے، پھر حد بھی جاری ہوگئی، لہذا گناہ تو ان سے صادر ہوا، لیکن وہ اس سے پاک صاف ہو چکے۔ قیامت

تک جب تک اس واقعے کا ذکر آئے گا، یہی کہا جائے گا کہ ان حضرات سے یہ غلطی سرزد ہوئی، لیکن اس کے علاوہ اس واقعے کے بعد خود عہدِ رسالت میں یا عہدِ صحابہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس غلطی کا انھیں طعنہ دیا گیا ہو، اس کی بنیاد پر انھیں سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا ہو، ان کو فاسق وغیرہ قرار دیا گیا ہو، ان پر لعن طعن کی گئی ہو۔ اس واقعے سے سب سے زیادہ اذیت اٹھانے والی تو خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ایک باغیرت خاتون کے لیے اس طرح کا واقعہ کتنی اذیت کا باعث بنتا ہے؟ یہ صرف وہی جان سکتا ہے جس پر گزری ہو۔ خود ام المؤمنین کا بیان کردہ واقعہ **صحیح بخاری** وغیرہ میں ہم پڑھتے ہیں تو گریہ قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ خود ام المؤمنین کس اذیت سے گزری ہوں گی! اس کے باوجود **صحیح بخاری** میں ہی آتا ہے کہ عروہ نے اُم المؤمنین کے سامنے حضرت حسان بن ثابتؓ، جو اس افک میں شریک تھے، کو برا بھلا کہا تو حضرت عائشہؓ نے منع کر دیا۔ وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی شاعری کے ذریعے دفاع کیا کرتے تھے۔[1] گویا ام المؤمنین یہ سبق دے رہی ہیں کہ کسی کی بس غلطی کو لے کر نہیں بیٹھ جایا کرتے، اگر اس نے اچھے کام کیے ہوں تو انھیں بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ یہ تو قرآن کا بھی بیان کردہ اصول ہے کہ نیکیاں برائیوں کے ازالے کا ذریعہ بن جاتی ہیں، تو حسان بن ثابتؓ کی جہاں ایک غلطی ہے وہیں مدافعتِ رسولؐ جیسی نیکیاں بھی ان کے کھاتے میں موجود ہیں۔ اس خاص واقعے میں اس یقین کے باوجود کہ ان کا عمل سراسر غلط تھا، کبھی ہمارے دل میں ان تینوں حضرات کے احترام میں کوئی کمی واقعی نہیں ہوئی ہو گی۔

---

[1]-**صحيح البخاري**، كتاب المغازي، باب حديث الإفك، رقم:۴۱۴۵۔

دوسری مثال ہم ذکر کرسکتے ہیں حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کی۔ بعض صحابی ایسے ہیں جو محض ایک واقعے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید ان کا نام بھی کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ جیسے عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ اذان کے خواب کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا ذکر شاید صرف زنا کے صدور کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔ ان سے یہ سنگین گناہ سرزد ہوتا ہے، خود آکر اقرار کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض کے باوجود بار بار اقرار کرتے ہیں، جب جرم پورے طور پر ثابت ہو جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجم کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ اب ماعز اسلمیؓ سے جو کچھ سرزد ہوا، تھا تو وہ گناہ ہی؛ جب واقعے کا ذکر ہوگا تو یہی کہا جائے گا کہ انھوں نے زنا کیا، اس فعل کو کوئی اور رنگ نہیں دیا جاسکتا، یہی فقہا و محدثین وغیرہ کہتے چلے آئے ہیں، لیکن کیا اس بنیاد پر ان پر سب وشتم بھی جائز ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ یہ صرف ہماری عقیدت کا معاملہ نہیں، خود ماعزؓ کے جرم کا ثبوت تسلیم کرکے رجم کا حکم صادر کرنے والے نبی کی تعلیم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ایک بڑی جماعت کے درمیان تقسیم کر دی جائے تو ان کے گناہ بخشوانے کے لیے کافی ہو جائے۔[1] دو شخصوں نے ماعز اسلمیؓ کے بارے میں نامناسب جملے کہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ایک مردار پھولے ہوئے گدھے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس میں سے کچھ کھاؤ، انھوں نے عرض کیا اسے کیسے کھایا جاسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا تم نے اپنے بھائی کی عزت کے حوالے سے جو ابھی بات کی، وہ اس گدھے کا معمولی

---

[1] - **صحیح مسلم** کے الفاظ ہیں: لقد تاب توبة لو قسمت بين أمة لوسعتهم. (كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنى، رقم: ۱۶۹۵۔)

حصہ کھانے سے زیادہ گھناؤنا کام تھا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، وہ تو اس وقت جنت کی نہروں میں ڈبکیاں لگا رہا ہے۔[1]

صحابہ کے بارے میں یہ اہل السنت کا طریقہ نہیں کہ روافض کی طرح کچھ کو تو معصوم قرار دے کر پوجا جائے اور کچھ پر سب وشتم کی جائے۔ اہل السنت کے نزدیک احترامِ صحابہ درحقیقت حبّ رسول کا تکملہ ہے۔ اس لیے اس نبی سے صحبت رکھنے والے گناہ بھی کر بیٹھیں، تب بھی ہمارے نزدیک وہ محترم ہیں کہ وہ ہمارے نبی سے نسبت رکھتے ہیں۔ اہل السنت کے ہاں قرآن وسنت کی روشنی میں صحابہ کے بارے میں معتدل طرزِ عمل یہ ہے کہ قذف جیسا گناہ، جس کی سنگینی سورۂ نور کی آیتوں سے واضح ہو رہی ہے، سرزد بھی حرمِ رسول ﷺ کے بارے میں ہوا (یہ آیاتِ براءت کے نزول سے پہلے کی بات ہے، وگرنہ اب یہ الزام دہرانا کفر ہے۔) اس سے زیادہ سنگینی کس غلطی کی ہو سکتی ہے۔ جرم، قذفِ زنا جیسا شنیع ہو، ثبوت کا معیار اتنا اعلی ہو کہ اللہ کے نبی نے حد جاری کرنے کا حکم جاری کیا ہو، اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر ثبوت کس قاضی کے فیصلے سے ہو سکتا ہے، لیکن ایک صحیح سُنّی جہاں غلط کام کو غلط ہی کہے گا، وہ یہ مانے گا کہ ان قاذفین سے سنگین غلطی سرزد ہوئی تھی، ماعز اسلمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا، وہیں وہ حسان بن ثابت، مسطح، حمنہ بنت جحش اور ماعز اسلمی رضی اللہ عنہم کی ذات کے بارے میں بے احترامی کا تصور بھی نہیں کرے گا، وہ اللہ کے نبی کے ساتھی ہونے کے ناتے، اللہ کے نبی کے مداح ہونے کے ناتے ان سے پیار ہی

---

[1] - **سنن الدار قطني** کے الفاظ ہیں: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّهُ الْآنَ لَفِي أَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ فِيهَا.( **سنن الدار قطني**، كتاب البيوع، كتاب الحدود والديات وغيره، رقم: ۳۴۴۲)

کرے گا؛ اس لیے کہ ایک صحیح سُنّی فعل پر حکم لگاتے ہوئے فعل کو دیکھتا ہے، ذات پر حکم لگاتے ہوئے ذات کو۔ کسی کی ذات کا دائرہ اس کے ایک آدھ غلط فعل سے بعض اوقات بہت وسیع ہوتا ہے، اس ذات میں کسی غلطی کے ساتھ ساتھ اس سے ہزاروں گنا بھاری اچھائیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔

اب آیئے اصل سوال کی طرف کہ اگر کسی صحابی کی طرف کسی غلط فعل کی نسبت ہو رہی ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ تو اس سلسلے میں انتہائی اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض ہیں:

۱. یہ بات درست ہے کہ اہل السنت کے نزدیک انسانوں میں سے معصوم صرف انبیا ہی ہیں، انبیا کے علاوہ کوئی انسان معصوم نہیں ہوتا؛ اس لیے ہر انسان سے غلطی اور گناہ کا صدور ممکن ہے۔ اگرچہ تفصیل کا موقع نہیں تاہم عام غیر انبیا کے درجات کے تفاوت سے اس امکان میں بھی بہت زیادہ کمی بیشی ہو سکتی ہے، حتی کہ خود صحابہ کے اندر بھی۔ جس چیز کی نسبت ہم بآسانی ماعز اسلمیؓ کی طرف کر لیتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ وہاں اس طرح کے فعل کا امکان اتنا مضمحل ہو گا کہ تقریباً کالعدم ہی ہو گا۔ وہ معصوم تو نہیں، لیکن صدیق اکبر کے درجے کے صحابہ، معصومیت کے نیچے جو بلند ترین مقام ممکن ہے، انھیں اس پر فائز کہا جا سکتا ہے۔

۲. کسی بھی انسان کی طرف غلط فعل کی نسبت سامنے آنے پر سب سے پہلی ذمے داری ہم پر یہ عائد ہوتی ہے کہ ہم یہ جانچیں کہ یہ نسبت ثابت بھی ہے یا نہیں۔ صحابہ کرام کے مقام و مرتبے کی وجہ سے یہ ذمے داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے؛

اس لیے سب سے پہلے تو صحابی کی طرف ایسی کسی بات کے ثبوت کو دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کس درجے کی ہے۔

۳. اگر نسبت درست ہو تو جہاں ہو سکے اس کے لیے کوئی عذر، کوئی تاویل تلاش کر لینی چاہیے۔ بعض اوقات ایک کام اپنی ذات میں تو غلط ہوتا ہے، لیکن کسی عذر کی وجہ سے اس پر وہ حکمِ اخروی جاری نہیں ہوتا جس کا وہ عمل اپنی ذات میں مستحق ہوتا ہے۔ قبلہ سے رخ ہٹا کر نماز پڑھنا گناہ ہے، لیکن اگر کسی شخص کو قبلہ معلوم نہیں ہے، اس نے اندازہ لگا کر ایک طرف رُخ کر کے نماز پڑھی تو امرِ واقعہ میں تو اس کی نماز غیر قبلہ کی طرف ہے، لیکن اسے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے کا گناہ نہیں ہو گا۔ امام بیہقی نے محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ اگر تمھارے بھائی کی کوئی بات تم تک پہنچے تو اس کا عذر تراشنے کی کوشش کرو، اگر کوئی عذر سمجھ میں نہ آئے تو کہہ دو کوئی عذر رہو گا۔[۱] امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں اگر تم تک تمھارے بھائی کی نا مناسب بات پہنچے تو ایک عذر تلاش کرو، وہ نہ بنے تو دوسرا، یہاں تک کہ ستر عذر تک تلاش کرو، پھر بھی کوئی عذر نہ بنے تو کہہ دو شاید

---

۱- **شعب الإيمان للبيهقي**، كتاب حسن الخلق، فصل في ترك الغضب الخ، رقم:۷۹۸۹؛ روایت کے الفاظ یوں ہیں: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ، قَالَ: إِذَا بَلَغَكَ عَنْ أَخِيكَ شَيْءٌ فَالْتَمِسْ لَهُ عُذْرًا، فَإِنْ لَمْ تَجِدْ لَهُ عُذْرًا، فَقُلْ: لَهُ عُذْرٌ.

کوئی اس کا کوئی ایسا عذر ہو جو میری سمجھ میں آ سکا ہو۔[1] اگر عام آدمی کے بارے میں حتی الامکان حسنِ ظن رکھنے کا یہ اصول ہے تو برگزیدہ شخصیات کے بارے میں بطریقِ اَوْلیٰ ہو گا۔

۴. اگر کسی وجہ سے التماسِ عذر (عذر تلاش کرنا) ممکن نہ ہو تو یہ حسنِ ظن رکھنا چاہیے کہ انھوں نے توبہ کر لی ہو گی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا ہو گا، جیسا کہ نصوص میں بعض واقعات میں اللہ کے معاف کرنے کی بھی تصریح ہے اور بعض واقعات میں توبہ کرنے کی بھی تصریح ہے۔

۵. اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں پر حکم ان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے لگتا ہے، اگر کسی سے کچھ گناہ سرزد ہو بھی جائیں، لیکن اس پر حسنات کا غلبہ ہو تو امید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان حسنات کی وجہ سے سیئات کالعدم ہو جائیں گی۔ صحابہ کرام کے بارے میں بھی یہ گمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسناتِ کثیرہ کو بعض سیئات پر غالب فرمائیں گے، چناں چہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

> اس کا جواب جمہور علما کے نزدیک یہ ہے کہ صحابہ کرام سے اگرچہ کوئی کبیرہ بڑا گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے، اور ہوا بھی ہے، مگر ان میں اور عام افرادِ امت میں ایک فرق ہے کہ گناہِ کبیرہ وغیرہ سے کوئی شخص ساقط العدالۃ یا فاسق ہو جاتا ہے اب اس کی مکافات توبہ

---

۱۔ نفسِ مصدر، كتاب حسن الخلق، فصل في ترك الغضب الخ، رقم: ۷۹۹۱؛ روایت کے الفاظ یوں ہیں: قَالَ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ: إِذَا بَلَغَكَ عَنْ أَخِيكَ الشَّيْءُ تُنْكِرُهُ فَالْتَمِسْ لَهُ عُذْرًا وَاحِدًا إِلَى سَبْعِينَ عُذْرًا، فَإِنْ أَصَبْتَهُ وَإِلَّا قُلْ: لَعَلَّ لَهُ عُذْرًا لَا أَعْرِفُهُ.

سے ہوسکتی ہے۔ جس نے توبہ کرلی یا کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس کی حسنات کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کا یہ گناہ معاف کردیا وہ پھر عدل اور متقی کہلائے گا۔ اور جس نے توبہ نہ کی وہ ساقط العدالۃ فاسق قرار دیا جائے گا۔ اب توبہ کے معاملے میں عام افرادِ امت اور صحابہ کرام میں ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ عام افرادِ امت کے بارے میں اس کی ضمانت نہیں ہے کہ انھوں نے توبہ کی یا نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی حسنات نے سب سیئات کا کفارہ کردیا۔۔ مگر صحابہ کا معاملہ ایسا نہیں۔ اول تو ان کے حالات جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ گناہ سے کتنے ڈرتے اور بچتے تھے، اگر کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو اس کی توبہ صرف زبانی کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ کوئی اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لیے پیش کردیتا ہے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا ہے، جب تک قبولِ توبہ کا اطمینان نہیں ہوجاتا ان کو صبر نہیں آتا۔ صحابہ کرام کی اس خوف وخشیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان حضرات سے توبہ کرنے کا اظہار بھی نہیں ہوا ہم ان کے بارے میں بھی یہی ظن رکھیں کہ انھوں نے ضرور توبہ کرلی ہوگی۔ دوسرے ان کے حسنات اور سوابق اتنے عظیم اور بھاری ہیں کہ ان کے مقابلے میں عمر بھر کا ایک آدھ گناہ حق تعالیٰ کے وعدے کے مطابق معاف ہی ہوجانا چاہیے ۔ وعدہ یہ ہے : إن الحسنات يذهبن السيئات.

وہ چند آیات ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں:

اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس بات کی ضمانت دے دی کہ حضراتِ صحابہ سابقین وآخرین میں سے کسی سے بھی عمر بھر میں کوئی گناہ سرزد ہوگیا تو وہ اس پر قائم نہ رہے گا، توبہ کرلے گا، یا پھر نبی کریم ﷺ کی صحبت ونصرت اور دین کی خدماتِ عظیمہ اور ان کی بے شمار حسنات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کردے گا۔ اور ان کی موت اس سے پہلے نہ ہوگی کہ ان کا گناہ معاف ہوکر وہ صاف بے باق ہوجائیں۔ اسی لیے ان میں سے کسی کو بھی ساقط العدالۃ یا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔

مگر یہ سب تفصیل ان کے حکم اخروی کے بارے میں ہے، حکم دنیوی کے بارے اسی سے متصل مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں

> صدورِ گناہ کے وقت اس [صحابی] پر تمام وہی احکام نافذ ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں پر ہوتے ہیں۔ حدِّ شرعی یا تعزیری سزائیں جو عام مسلمانوں کے لیے ہیں وہ ان پر جاری کی جائیں گی۔ اور صدورِ گناہ کے وقت اس عمل کو فسق بھی کہا جائے گا، جیسا کہ آیت إن جاءكم فاسق بنبأ سے معلوم ہوتا ہے، مگر چوں کہ ان کی توبہ یا معافی بنص قرآن معلوم ہو چکی ہے اس لیے ان کو کسی بھی وقت ساقط العدالۃ یا فاسق نہ کہا جائے گا۔ كما حققه الآلوسي في **روح المعاني** تحت آية إن جاءكم فاسق. [1]

مفتی اعظمؒ نے کسی قدر فسق کے اطلاق کے لیے جو استدلال کیا ہے اور اسے علامہ آلوسیؒ سے نقل کیا ہے، مجھے آیت کی اس تفسیر سے اختلاف ہے، یعنی آیت سے جتنا فسق حضرت مفتی صاحبؒ ثابت فرما رہے ہیں میرے نزدیک اتنا بھی اس سے ثابت نہیں ہو رہا۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی ان عبارتوں اور اس طرح کی اہل السنت والجماعت کی بہت سی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اہل السنت صحابہ کے بارے میں جس حسنِ ظن اور ان کے ذکرِ خیر اور ان کے بارے میں کف لسان کے قائل ہیں، اس کا مطلب کیا ہے اور یہ حسنِ ظن کس راہ سے ہے؟ صحابہ کے ساتھ حسنِ ظن یا الصحابۃ کلہم عدول کا یہ مطلب اہل السنت کے نزدیک کبھی بھی نہیں رہا کہ ان سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا، ثابت شدہ غلطی کا انکار کر دیا جائے یا ثابت شدہ غلطی کا علمی مواقع پر بھی ذکر نہ کیا جائے۔ اگر غلطی ثابت شدہ نہیں ہے تو اس کا

---

۱۔ مفتی محمد شفیع، مقام صحابہ، ۵۹۔

انکار کیا جائے گا، اگر ثابت شدہ ہے لیکن بادی النظر میں غلطی لگنے کے باوجود اس کی کوئی توجیہ ایسی بنتی ہے، جس سے وہ غلطی، غلطی نہ رہے تو توجیہ کی جائے گی، وگرنہ غلطی کو تسلیم کر کے مذکورہ بالا طریقِ کار کے مطابق حسنِ ظن سے کام لیا جائے گا اور اس خاص غلطی کو تسلیم کرنے اور علمی ضرورت کے تحت بیان کرنے کے باوجود سب وشتم اور برا بھلا کہنے سے گریز کیا جائے گا، جیسا کہ ماعز اسلمی، حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کی مثالوں میں عرض کیا۔

مفتی اعظمؒ ابن تیمیہؒ کی طویل عبارتوں کا خلاصہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اور جب سلف صالحین کا اہل السنت والجماعت کا اصول یہ پڑ گیا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو اب یہ سمجھیے کہ ان حضرات کے قول کا حاصل یہ ہے کہ بعض صحابہ کی طرف جو بھی گناہ یا برائیاں منسوب کی گئی ہیں ان میں بیشتر حصہ تو جھوٹ اور افترا ہے اور کچھ حصہ ایسا ہے جس کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے حکم شرعی اور دین سمجھ کر اختیار کیا۔ مگر بہت سے لوگوں کو ان کے اجتہاد کی وجہ اور حقیقت معلوم نہیں، اس لیے اس کو گناہ قرار دیا۔ اور کسی معاملہ میں یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ خطا اجتہادی نہیں بلکہ حقیقتاً گناہ ہی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا وہ گناہ بھی معاف ہو چکا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ انھوں نے توبہ کر لی (جیسا کہ بہت سے ایسے معاملات میں ان کی توبہ قرآن وسنت میں منقول وماثور ہے) اور یا ان کی دوسری ہزاروں حسنات وطاعات کے سبب معاف کر دیا گیا اور یا اس کو دنیا میں کسی مصیبت وتکلیف مبتلا کر کے اس گناہ کا کفارہ کر دیا گیا۔ اس کے سوا اور بھی اسباب مغفرت کے ہو سکتے ہیں۔

علامہ آلوسیؒ، جن کی تفسیر کا حوالہ اوپر مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے دیا، انھوں نے اپنے ایک رسالے میں یہ بات مزید وضاحت کے ساتھ فرمائی ہے۔ انھیں پتا چلا تھا کہ ہندوستان میں کچھ لوگ سُنّی کہلانے کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ

پر سب وشتم کرتے ہیں تو انھوں نے **الأجوبة العراقية على الأسئلة اللاهورية** کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ صحیح روایات، بلکہ صحیحین کی روایات سے ثابت ہے کہ بعض صحابہ سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہوئے، پھر ان کی عدالت کا اصول کیسے قائم کر لیا گیا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

وأجيب بأنه ليس مرادنا من كون الصحابة – رضي الله تعالى عنهم – جميعهم عدولا أنهم لم يصدر عن أحد منهم مُفُسّق أصلا ولا ارتكب ذنبا قط ، فإن "دون إثبات ذلك خرط القتاد"، فقد كانت تصدر منهم الهفوات ويرتكبون ما يُحدّون عليه، وإنكارُ ذلك مكابرة صرفة وعنادٌ محض وجهلٌ بموارد الآيات والأحاديث؛ بل مرادُنا أنهم لم ينتقلوا من هذه الدار إلى دار القرار إلا وهم طاهرون مطهرون تائبون آيبون ببركة صحبتهم للنبي – ﷺ – ونصرتهم إياه وبذل أنفسهم وأموالهم في محبته وتعظيمهم له أشد التعظيم سرا وعلانية، كما يدل على ذلك الكتاب وتشهد له الآثار.[1]

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام صحابہ کو ہمارے عادل کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی سے کبھی کوئی باعث فسق بات صادر نہیں ہوئی یا اس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا، کیوں کہ اس بات کو ثابت کرنا کانٹے چننے سے بھی مشکل کام ہے۔ ان سے لغزشوں اور قابلِ حد امور کا صدور بھی ہو جاتا تھا۔ اس کا انکار محض ضد، عناد اور آیات واحادیث کے محل سے جہالت کی بات ہے، بلکہ ہماری

---

۱- الوسی، **الأجوبة العراقية**، ۲۳۔

مراد یہ ہے کہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کی صحبت کی برکت، ان کی نصرت، آپ کی محبت میں اپنے جان ومال کے انفاق اور خفیہ وعلانیہ طور پر آپ کی نہایت تعظیم کے باعث پاک صاف اور تائب بن کر دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہوئے ہیں، جیسا کہ اس پر کتاب وسنت شاہد ودال ہیں۔

بات کو مرتکز رکھنے اور تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ہم نے عموماً عبارات نقل کرنے سے گریز کیا ہے۔ جو اکابر علماے اہل السنت حضرات صحابہ کے بارے میں بدگمانی اور بدزبانی کے خلاف کتابیں لکھ رہے ہیں، وہ اپنی انھیں کتابوں میں مسئلے کو اس انداز سے منقح کررہے ہیں کہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتے کہ کسی صحابی سے غلط فعل سرزد ہو ہی نہیں سکتا، یا ان کی طرف غلط فعل کی نسبت کرنا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے، بلکہ وہ وہی بات کہنا چاہ رہے ہیں جو اوپر پانچ نمبروں میں ہم نے ذکر کی ہے کہ یا تو اس فعل کی نسبت صحیح نہیں، یا اس میں تاویل ہوگی یا وہ مغفور ہے پھر آگے مغفرت کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ حضرت مفتی اعظمؒ ہی نے اپنی اسی کتاب **مقام صحابہ** میں ایک جگہ عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ ”صحابہ معصوم نہیں مگر مغفور ومقبول ہیں“۔ کسی صحابی کا غلط فعل بھی ثابت ہو تب بھی فعل پر تو وہی حکم لگایا جائے گا، جو دلیلِ شرعی کا مقتضا ہے، لیکن صحابی کی ذات پر بالخصوص اس کے اخروی معاملے پر کوئی غلط حکم نہیں لگایا جائے گا۔ متعدد تجربات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بہت سے ذہنوں میں یہ بیٹھ گیا ہے کہ صحابہ کے لیے مغفرت کا ذکر بھی ان کی شان کے خلاف ہے؛ اس لیے ان چند عبارتوں کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوا۔

ابن تیمیہ ہی کی بات نقل کرتے ہوئے مفتی اعظمؒ لکھتے ہیں:

اور عشرہ مبشرہ کے علاوہ کسی معین ذات کے متعلق اگرچہ ہم یہ نہ کہہ سکیں وہ وجنتی ہے، جنت ہی میں جائے گا مگر یہ بھی تو جائز نہیں کہ ہم کسی کے حق میں بغیر کسی دلیل شرعی کے یہ کہنے لگیں کہ وہ مستحق جنت کا نہیں ہے کیوں کہ ایسا کہنا تو عام مسلمانوں میں سے بھی کسی کے لیے جائز نہیں جن کے بارے میں ہمیں کسی دلیل سے جنتی ہونا بھی معلوم نہ ہو۔ ہم ان کے بارے میں یہ شہادت نہیں دے سکتے کہ وہ ضرور جہنم میں جائے گا پھر افضل المؤمنین اور خیار المؤمنین (صحابہ کرام) کے بارے میں یہ کیسے جائز ہو جائے گا۔ اور ہر صحابی کے پورے اعمالِ ظاہر وباطنہ کی اور حسنات وسیئات اور ان کے اجتہادات کی تفصیل کا علم ہمارے لیے بہت دشوار ہے اور بغیر علم وتحقیق کے کسی کے متعلق فیصلہ کرنا حرام ہے اسی لیے مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں سکوت کرنا بہتر ہے۔ اس لیے کہ بغیر علمِ صحیح کے کوئی حکم لگانا حرام ہے۔[1]

یہاں ایک مرتبہ پھر ابن تیمیہ اور مفتی اعظمؒ سے اختلاف کی جسارت کروں گا کہ بالتعیین جنتی ہونے کی صراحت صرف دس صحابہ کے بارے میں نہیں اس کا دائرہ اس سے وسیع ہے۔ ان دس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی حدیث میں انھیں نام لے کر جنتی کہا گیا ہے، وگرنہ اور بھی متعدد صحابہ کو بالتعیین آپ ﷺ نے جنتی قرار دیا ہے۔

اس آخری عبارت سے یہ بھی واضح ہوا کہ مشاجرات کے بارے میں سکوت کا مطلب کیا ہے، وگرنہ ایسی بے شمار عبارات ہیں جن میں سکوت کی تلقین کرنے والے حضرات ہی نے ایک فریق کو بڑی صراحت کے ساتھ حق پر قرار دے کر دوسرے فریق کے

---

۱ - مقامِ صحابہ ص ۱۰۲۔

عمل کو خطا قرار دیا ہے۔ پہلے ذکر ہوا ہے کہ ہمارے بھائی مفتی محمد مجاہد شہید رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک مفصل فتوی لکھا تھا، جس میں انھوں نے اس نوع کی کافی عبارات جمع کر دی تھیں۔ خود مشاجراتِ صحابہ کے معاملے میں حضرت مفتی اعظمؒ نے اس کتاب **مقامِ صحابہ** میں حضرت علیؓ کے بر حق ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بارے میں کف لسان کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف غیر ثابت شدہ غلطی منسوب نہیں کی جائے گی، جہاں غلطی ثابت ہو وہاں اس کی وجہ سے ان کی تفسیق، تضلیل وغیرہ نہیں کی جائے گی، اس غلطی کی وجہ سے انھیں سب وشتم کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا، ان پر لعن طعن نہیں کیا جائے گا۔ یہ حکم عام تھا، مشاجراتِ صحابہؓ کے سیاق میں اس کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی اس لیے محسوس ہوئی کہ یہاں چوں کہ مدمقابل فریق سے خطا کا صدور مسلمہ سا امر ہے، اس لیے شدتِ جذبات میں یا گروہ بندی میں غلطی کرنے والے حضرات کے بارے میں سب وشتم اور لعن وتفسیق کا راستہ کھل سکتا تھا۔ کف لسان غلطی ہی کی صورت میں درکار ہوتا ہے، کارناموں میں تو کف لسان نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جتنی کسی کی غلطی ہے اس کا بھی ذکر نہ کیا جائے، بالخصوص جہاں نصوص نے کسی خاص غلطی کا درجہ متعین کر دیا، وہاں اس نص کے مقتضا ہی کو مانا جائے گا، لیکن مذکورہ تشریح کے مطابق کفِ لسان کے ساتھ؛ وگرنہ کل کوئی یہ بھی کہے گا کہ ماعز اسلمی سے زنا کے صدور اور ان پر حد جاری ہونے کا ذکر کرنا بھی عظمتِ صحابہؓ کے منافی ہے، قذفِ عائشہؓ میں شریک ہونے والوں کے بارے میں قرآنی تعبیرات ناقابلِ ذکر ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ حضرت علیؓ کی تصویب میں درجن بھر حدیثیں سننے کے بعد دوسری طرف کے صحابہ کے بارے میں کوئی شخص اچھا گمان کیسے رکھ سکتا ہے۔ ان کے سوال کے مطابق تو ماعز

اسلمیؓ، حسانؓ، اثاثہؓ اور حمنہؓ کے بارے میں یا حسنِ ظن کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے یا قذف اور زنا کی شناعت کی نصوص، بالخصوص قذفِ عائشہؓ کے بارے میں آیات کو حذف کر دینا چاہیے۔ اہل السنت کا طرزِ اعتدال یہ ہے کہ فعل کی غلطی اور فاعل پر حکم کو نتھی نہ کیا جائے۔ اس طرح کے اشکالات کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اہل السنت والجماعت کا پورا نقطۂ نظر سامنے نہیں ہوتا، وگرنہ کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

## عذر کے فہم کے لیے اہم اصول

اوپر تیسرے نمبر پر ہم نے عذر تلاش کرنے کی بات کی، بعض اوقات عذر کی بات بلاوجہ کی تاویل لگ رہی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عقلِ عام اور کامن سینس کا ایک اصول بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے، جس سے مواقف کی غلطی کا عذر سمجھنا مزید آسان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی خاص واقعہ، خصوصاً گہما گہمی اور جذبات کی حساسیت والا واقعہ ہو رہا ہو، اس وقت کی صورتِ حال اور ہوتی ہے اور بعد میں جب اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو بات اور ہوتی ہے۔ بعد میں جب تجزیہ کیا جا رہا ہو تب صحیح معاملے تک رسائی بعض اوقات آسان ہو چکی ہوتی ہے، تاریخ معاملات کو بہت حد تک واضح کر چکی ہوتی ہے، لیکن واقعات ہونے کے دور میں بعض اوقات حالات کی دھول میں بہت سی چیزیں کئی سمجھ دار اور مخلص لوگوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہ جاتی ہیں۔ ماضی میں ہمارے بعض حکمرانوں خصوصا آمروں کے بعض اقدامات کے بارے میں اب تقریباً مسلمہ سا معاملہ ہے کہ وہ غلط تھے، لیکن جب وہ کام ہو رہے تھے تو ہو سکتا ہے ہمیں بعض مخلص ہی نہیں سمجھ دار شخصیات ان اقدامات کے ساتھ کھڑی نظر آئیں۔ آج اگر میں اس معاملے کو درست طریقے سے سمجھ رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ضروری نہیں کہ میری سمجھ بوجھ ان سے بڑھ کر ہے بلکہ عین حالات کے دوران اور

بعد کا فطری فرق ہے۔ اُس طرح کی صورتِ حال میں ممکن ہے میں اس سے بھی بڑی غلطی کر جاؤں۔ اس شخصیت کے اخلاص یا اس کی سمجھ بوجھ پر سوال اٹھانے کی بجائے مجھے چاہیے کہ انہیں اسی صورتِ حال میں رکھ کر دیکھوں اور ان کے موقف کی غلطی کے باجود ان کے عذر کو بھی مدّ نظر رکھوں۔ عہدِ رسالت میں اس کی ایک مثال صلح حدیبیہ کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پورے شرحِ صدر کے ساتھ یہ صلح فرمائی، لیکن صحابہ کے لیے یہ انتہائی حیران کن تھی۔ رسول اللہ ﷺ ہدی ذبح کرکے واپسی کا فرمارہے ہیں لیکن صحابہ کو ایسا کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مشرکین کے مطالبے پر آپ ﷺ حضرت علی کو ڈرافٹ کے ایک لفظ کو مٹانے کا فرمارہے ہیں لیکن ان سے یہ کام نہیں ہو پارہا۔ سب سے زیادہ جذباتی ہمیں حضرت عمرؓ نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی رسول اللہ ﷺ سے جذباتی انداز میں سوال کررہے ہیں کہ جب ہم حق پر ہیں وہ باطل پر ہیں تو پھر اپنے دین کے معاملے میں ہم کم زوری کیوں دکھارہے ہیں، کیا آپ نے خود ہی یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے؟ کبھی اسی انداز سے سوال وجواب اور بحث حضرت ابو بکرؓ سے کررہے ہیں۔ دونوں جگہ سے ایک ہی جواب ملتا ہے (جو رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر میں کمالِ مناسبت کی دلیل بھی ہے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا نصرت جو وعدہ ہے وہ ہر قیمت پر پورا ہو کر رہے گا، آپ اللہ کے نبی ہیں ہمیں ہر قیمت پر ان کا دامن تھامے رکھنا ہے۔[1] اب آج اگر کوئی کہے کہ صلح حدیبیہ

---

[1] - صحیح البخاري رقم: ٢٧٣١، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب۔ اس طویل روایت میں متعلقہ لفظ یہ ہیں: فقال عمر بن الخطاب: فأتيت نبي الله صلى الله عليه وسلم فقلت: ألست نبي الله حقا، قال: «بلى»، قلت: ألسنا على الحق، وعدونا على الباطل، قال: «بلى»، قلت: فلم نعطي الدنية في ديننا إذا؟ قال: «إني رسول

کی افادیت اور اس کے نتائج پر میں کئی گھنٹے تقریر کر سکتا ہوں، لہٰذا میری سمجھ بوجھ اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر اعتماد کی سطح زیادہ ہے تو جواب میں یہی کہا جائے گا کہ آج اس انداز سے یہ بات کہنا آسان ہے۔ اس موقع پر اُن حالات میں جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے یہ انہی کا حصہ تھے جنہیں اللہ نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا تھا۔ مدینے سے اللہ کے نبی کے ایک خواب کی بنیاد پر چلے ہیں۔ منافقین کے طعنوں کو نظر انداز کر کے چلے ہیں۔ راستے میں

---

الله، ولست أعصيه، وهو ناصري»، قلت: أوليس كنت تحدثنا أنا سنأتي البيت فنطوف به؟ قال: «بلى، فأخبرتك أنا نأتيه العام»، قال: قلت: لا، قال: «فإنك آتيه ومطوف به»، قال: فأتيت أبا بكر فقلت: يا أبا بكر أليس هذا نبي الله حقا؟ قال: بلى، قلت: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل؟ قال: بلى، قلت: فلم نعطي الدنية في ديننا إذا؟ قال: أيها الرجل إنه لرسول الله صلى الله عليه وسلم، وليس يعصي ربه، وهو ناصره، فاستمسك بغرزه، فوالله إنه على الحق، قلت: أليس كان يحدثنا أنا سنأتي البيت ونطوف به؟ قال: بلى، أفأخبرك أنك تأتيه العام؟ قلت: لا، قال: فإنك آتيه ومطوف به، - قال الزهري: قال عمر -: فعملت لذلك أعمالا، قال: فلما فرغ من قضية الكتاب، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لأصحابه: «قوموا فانحروا ثم احلقوا»، قال: فوالله ما قام منهم رجل حتى قال ذلك ثلاث مرات، فلما لم يقم منهم أحد دخل على أم سلمة، فذكر لها ما لقي من الناس، فقالت أم سلمة: يا نبي الله، أتحب ذلك، اخرج ثم لا تكلم أحدا منهم كلمة، حتى تنحر بدنك، وتدعو حالقك فيحلقك، فخرج فلم يكلم أحدا منهم حتى فعل ذلك نحر بدنه، ودعا حالقه فحلقه، فلما رأوا ذلك قاموا، فنحروا وجعل بعضهم يحلق بعضا حتى كاد بعضهم يقتل بعضا غما

لبيك اللهم لبيك کی صداؤں اور بیت اللہ کے طواف اور افعالِ عمر کے تصور سے جذبات کی سطح کیا ہو رہی ہو گی، اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بہت جوش و جذبے کے ساتھ جان نثاری کی آخری حد تک جانے کی بیعت کر رہے تھے، اب یک دم ایسی یک طرفہ صلح کہ جس فریق کو ہم یقیناً باطل سمجھتے ہیں ان کی ہر بات مانے چلے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ یہیں سے احرام سے ختم کر کے واپسی کا فیصلہ۔ تھوڑی دیر کے لیے خود کو اس خاص ماحول میں تصور کریں، پھر دیکھیں اس صلح کی مستقبل کی افادیت کتنی سمجھ میں آتی ہے۔ آج اس کی افادیت پر گھنٹوں تقریر کر لینا آسان معاملہ ہے۔ لہٰذا اس وقت حضرت عمر کو جو تحفظات یا اشکالات تھے اپنی ذات کے اعتبار سے وہ درست نہیں تھے بلکہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر جو فرما رہے تھے وہی درست تھا لیکن اس کی بنیاد پر حضرت عمر کی تنقیص کرنا ہر گز درست نہیں۔ حضرت عمر اس خاص ماحول میں نہ صرف یہ کہ معذور تھے بلکہ ان خیالات کا منشا بھی اچھا ہی تھا۔ اسی طرح صلح سے جن صحابہ میں خستگی پیدا ہوئی اس کا منشا بھی ایمان کی کمی نہیں ایمانی جذبات ہی تھے۔ حضرت عمر کو بعد میں اگرچہ اپنے اس طرزِ عمل پر بہت افسوس ہوا، لیکن یہ ان کی حساس طبیعت اور کمالِ ایمان کی علامت ہے وگرنہ ان حالات میں ایسی بات سرزد ہونا کوئی گناہ نہیں تھا۔ اب دونوں طریقے غلط ہوں گے۔ یہ کہنا کہ حضرت عمر کے تحفظات میں جان تو لگ رہی ہے، کل تک جان نثاری کی بیعت اور آج اتنا جھک کر صلح، یہ تو نعوذ باللہ یوٹرن لگ رہا ہے، یہ بھی غلط ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہو گا کہ حضرت عمر کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان میں نعوذ باللہ کمی واقع ہو گئی تھی، یا یہ کہ مجھے اس صلح کی حکمتیں سمجھ میں آ رہی ہیں جو حضرت عمر کو نہیں

آرہی تھیں۔ حاصل یہ کہ کسی معاملے میں کسی کے عذر کو سمجھنے کے لیے اس شخص کو اسی ماحول میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے، اس سے عذر بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

## حضرت علی سے محاربہ کرنے والوں کا مقام

اب یہاں خصوصیت کے ساتھ دو فریقوں پر کسی قدر مستقلا بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک وہ حضرات جو حضرت علیؓ کے مد مقابل آئے اور ان سے حضرت علیؓ کی جنگیں ہوئیں۔ دوسرے وہ حضرات جو حضرت علیؓ کی مدد کے لیے میدان میں نہیں آئے، بلکہ الگ تھلگ رہے۔

حضرت علیؓ کے تین بڑے قتالوں میں سے جنگِ نہروان کے بارے میں تو واضح ہی ہے کہ وہاں مد مقابل خوارج تھے۔ وہاں رسول اللہ ﷺ نے محض ان کے فعل کو غلط یا برا قرار نہیں دیا، بلکہ خود ان لوگوں کو مخلوق میں سے بدترین لوگ قرار دیا ہے۔ جمل اور صفین کے بارے میں کسی قدر بات کرنے کی یہاں ضرورت ہے۔

اس سے پہلے یہ اصول ذہن میں رکھیں کہ کسی کام کے درست ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہمیشہ اصولِ شریعت کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ دیکھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بعینہ اسی طرح کی صورتِ حال میں اگر کوئی اور یہ کام کرے تو ہم اسے درست کہیں گے یا نہیں۔ اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ مسلمانوں کا ایسا خلیفہ موجود ہے جس کی خلافت منعقد ہو چکی ہے۔ اس کے خلیفہ ہونے یا نہ ہونے پر کوئی سوال موجود نہیں ہے، وہ خلیفہ جائز نہیں عادل ہے، وہ اس منصب کا اہل ہے، اس کی اہلیت پر بھی سوال موجود نہیں ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہل کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ اب کچھ لوگوں کو اس کی کسی پالیسی یا کچھ پالیسیوں سے اختلاف ہو جاتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خلیفہ تو جائز اور عادل ہے

لیکن اس کی فلاں پالیسی درست نہیں ہے تو انھیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ خلیفہ سے بات چیت کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بالکل درست طریقہ ہے، وہ اسے نصیحت کرتے ہیں، بہت اچھی بات ہے، وہ اس کی پالیسیوں پر زبان سے تنقید کرتے ہیں، یہ بھی قابلِ گوارا ہے، لیکن اگر اس سے آگے بڑھ کر خلیفۂ عادل سے اجتہادی اختلاف رکھنے والے اپنا اجتہاد نافذ کرانے کے لیے گروہ اور جتھا بنا لیتے ہیں، تاکہ خلیفۂ وقت کو اپنی بات منوانے پر مجبور کر سکیں، اس مقصد کے لیے خلیفہ کی رٹ چیلنج کرتے ہیں، کچھ علاقے جو خلافت کا حصہ اور اسی کے ماتحت تھے انھیں خلافت سے الگ کر کے اس پر اپنی متوازی حکومت قائم کر لیتے ہیں، اپنا متوازی لشکر قائم کر لیتے ہیں تو کسی کے نزدیک بھی امامِ عادل سے اپنے مطالبات یا اپنے اجتہادات منانے کا یہ طریقہ درست نہیں ہو گا، خواہ ایسا کرنے والوں کی اجتہادی صلاحیت کتنی بھی اعلی کیوں نہ ہو۔ یہ اصول زید، عمرو، بکر وغیرہ سب کے لیے ہے، چناں چہ خلفاے ثلاثہ کے دور میں بھی اگر کسی بڑے سے بڑے صحابی کا اجتہاد خلیفۂ وقت کے اجتہاد سے مختلف ہوا تو انھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اگر کچھ لوگ اپنے اجتہاد کی تنفیذ کے لیے اس طرح کا طریقہ اختیار کرتے ہیں تو امامِ عادل کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اس کے سدّ باب کے لیے مناسب کارروائیاں کرے۔ اس مقصد کے لیے اسے فوجی آپریشن یا قتال کا فیصلہ کرنا پڑے تو اسے اس کا بھی اختیار حاصل ہے، جس کی تفصیلات فقہانے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ یہ اصول بہت واضح اور مسلمہ ہو چکا ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت اہل السنت کے نزدیک منعقد ہو چکی ہے۔ وہ خلیفۂ راشد اور امامِ عادل ہیں، اس وقت میں ان سے زیادہ علم اور دینی فضیلت رکھنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے انھیں قضا کا سب سے بڑا عالم قرار دے رکھا ہے، جس کا مطلب یہ کہ

وہ صرف شرعی اصولوں ہی کو نہیں جانتے تھے کسی خاص امرِ واقعہ پر منطبق کرنے کا فن بھی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ قصاصِ عثمان کے حوالے سے بعض حضرات کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شاید حضرت علیؓ کی پالیسی درست نہیں ہے، یا اسی سے ملتا جلتا ایک آدھ اشکال اور ہو جاتا ہے۔ (یہ چند ایک شبہات بھی قلتِ تامل یا غلط فہمی پر مبنی ہیں، جو ایک الگ موضوع ہے) یہ حضرت علیؓ کی بہت بڑی کرامت اور آپ کی عظمت ہے کہ آپ کی اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ پورا دورِ خلافت پریشانی میں گزرا، بعد میں بھی آپ کو تنقید اور سب وشتم کا نشانہ بنایا گیا لیکن قصاصِ عثمان جیسے ایک آدھ معاملے کے علاوہ آپ کی گورننس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا۔ سوال یہ نہیں کہ کسے اجتہاد کا حق حاصل تھا کسے نہیں، سوال یہ بھی نہیں کہ کس کا اجتہاد زیادہ وزنی تھا، سوال تو اپنے اجتہاد کی تنفیذ کے طریقہ کار کا ہے۔ مان لیتے ہیں کہ جنھیں یہ شبہ ہوا تھا ان کا مقامِ اجتہاد، حضرتِ علیؓ سے بھی بلند تھا، تب بھی سوال یہ ہے کہ اصول کیا کہتا ہے کہ انھیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ وہی جو اوپر ذکر کیا۔ ہمارا موضوع تو حضرت علیؓ ہیں، اس لیے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اگر کسی چیز کی روک تھام کی کارروائی کا فیصلہ کیا تو کیوں کیا؟ کوفے میں خوارج نے حضرت علیؓ کے خلاف بڑی بڑی باتیں کیں، لیکن حضرت علیؓ نے انھیں برداشت کیا، کوئی کارروائی ان کے خلاف نہیں کی۔ یہاں بھی ان حضرات کی طرف سے اپنا متبادل اجتہاد صرف خلیفہ کے سامنے نہیں، سرِ عام بیان کیا جاتا، اپنی دلیل کی روشنی میں خلافت کی پالیسی پر تنقید کی جاتی تو ضرور گوارا کیا جاتا اور کوئی کارروائی نہ ہوتی۔ مگر یہاں اہلِ جمل ہوں یا اہل صفین وہ اپنی بات منوانے کے لیے اس سے آگے نکل جاتے ہیں، اس لیے بقول مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ بالاجماع ان حضرات کا یہ طریقہ خطا پر مبنی تھا اور حضرت علیؓ کا حق پر۔ ایسے موقع پر حضرت علیؓ کو بطور خلیفہ عادل ان

تمام کارروائیوں کا اختیار حاصل تھا، جو انھوں نے کیں، اور یہی بات احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہوئی کہ حضرت علیؓ کے خلاف کوئی بھی نکلا، اللہ کے نبی ﷺ نے اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، ناپسندیدگی کے اظہار کے انداز الگ الگ رہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جب نارمل حالت میں ہم کسی معاملے پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو درست رائے اور نتیجے تک پہنچنا بہت آسان ہوتا ہے، لیکن جہاں حالات انتہائی الجھے ہوئے ہوں، پروپیگنڈے کی گرد میں کچھ دیکھنا مشکل ہو، نت نئی افواہیں ہوں، کچھ لوگوں کا مفاد ہی شخصیات کو ایک دوسرے کے مد مقابل لانے سے وابستہ ہو، ایسے ماحول میں انتہائی فہیم، انتہائی مخلص اور انتہائی دیانت دار شخص کے لیے بھی درست فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر کسی سے درست فیصلہ نہ ہو سکے، تو اس کے عذر اور مجبوری کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مد مقابل حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہم نمایاں شخصیات ہیں۔ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ صواب پر تھے۔ دوسرے فریق سے اگرچہ غلطی ہوئی ہے، جیسا کہ دلائل اور احادیث سے ثابت ہو چکا کہ غلطی ہوئی ہے اور یہی اہل السنت کا عمومی رخ ہے، مگر ان حضرات کے عذر اور ان کی مجبوری کو سمجھنا اور ان کے دیگر کمالات، مناقب اور کارناموں کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے، اور ان کی نیت پر اعتراض کرنا بھی غلط ہے۔ خصوصاً جنگِ جمل چوں کہ فتنۂ قتلِ عثمان کے بہت جلدی بعد ہوا ہے، اس لیے ان حضرات کا یہ عذر بھی بہت واضح ہے کہ حالات تھے ہی اتنے گرد آلود کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود جنگِ جمل کے واقعات میں بھی بہت ابہامات موجود ہیں۔ یہ درست ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے ایک

بڑا لشکر جمع کیا تھا، لیکن ان کا پورا پلان کیا تھا؟ شاید اس کا تعین کرنا مشکل ہو۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہ سوچ کر کہ بجائے اس کے کہ اتنی بڑی جماعت مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کرے، خود اپنا لشکر لے کر ان کی طرف روانہ ہوئے، لیکن اس کے باوجود اس جنگ کو ایک حادثہ کہنا ممکن ہے، اور اس بات کے امکانات موجود تھے کہ فریقین بات چیت سے مسئلہ حل کر لیتے، اس لیے یہاں حالات کے ابہام کا فائدہ بہت واضح انداز میں حضرت زبیر وطلحہ وغیرہ کو دیا جانا ضروری ہے۔ پھر خود جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا کہ حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سے رجوع بھی ثابت ہے۔ اس طرح کے الجھے ہوئے حالات میں نیک جذبے کے ساتھ کوئی قدم اٹھانے میں غلطی بھی ہو گئی تو حقیقت کا ادراک ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یاد آنے پر اپنی رائے سے مڑ گئے۔ اس سے بڑھ کر خلوص اور عظمت کیا ہو سکتی ہے؛ اس لیے یہ تو درست ہے کہ اس خاص معاملے میں ان سے فیصلہ غلط ہوا، لیکن اس کی وجہ سے انھیں کسی بھی قسم کی ملامت کا نشانہ بنانا دنیا و آخرت کا خسارہ ہے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ جمل کے بارے میں فرمایا کہ میں اور وہ اس آیت کا مصداق ہوں گے وَنَزَعْنَا مَافِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَاناً عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِيْنَ (اللہ تعالی اہلِ جنت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں ان کے دلوں میں کوئی کدورت ہو گی بھی تو ہم ان کے دلوں سے نکال لیتے ہیں اور وہ جنت میں بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں ہوں گے۔) جو روایات ہم نے اپنے اس خطاب میں ذکر کیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں ان کے دل ایک دوسرے کے بارے میں صاف ہو چکے تھے۔

چناں چہ علامہ آلوسی **الأجوبة العراقية** میں مذکورہ روایت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "وهذا ونحوه يدل على أنهما - رضي الله تعالى عنهم - لم يذهبا إلا طاهرين مطهرين." (یہ اور اس طرح کی دیگر روایات بتاتی ہیں وہ دونوں [طلحہ وزبیر] دنیا سے پاک صاف ہو کر گئے ہیں۔)[۱]

حضرت عائشہ کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ دنیا سے حضرت علیؓ کی حقانیت کا اعلان کر کے گئی ہیں۔ نیز علامہ آلوسیؒ اپنے مذکورہ رسالے میں لکھتے ہیں:

> جب حضرت علیؓ کو جنگ میں غلبہ حاصل ہوا تو آپ ام المؤمنین کے پاس تشریف لائے اور کہا: "اللہ آپ کی مغفرت کرے"۔ حضرت عائشہؓ نے کہا "اور آپ کی بھی؛ میرا مقصد صرف اصلاحِ احوال تھا۔"۔۔۔ تین دن کے بعد دوبارہ حضرت علیؓ ان سے ملاقات کے لیے گئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ کو خوش آمدید کہا اور ان کی بیعت کی۔ اسی دوران میں حضرت علیؓ کو پتا چلا کہ دو آدمی حضرت عائشہؓ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں تو حضرت علیؓ نے قعقاع بن عمرو کو حکم دیا کہ دونوں کے کپڑے اتار کر انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔۔۔[۲]

اس لیے جمل کے موقع پر اختلاف ضرور ہوا، اور اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں بھی ظاہر ہوا، لیکن یہ اختلاف ان عظیم شخصیات کی زندگی ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ ابتدا میں بعض شخصیات سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی پراسس میں غلطی ہوئی، اب اس پر اعتراض کرنے کی سرے سے کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہی۔

---

۱-الالوسی، **الأجوبة العراقية**، ۳۶۔

۲-نفسِ مرجع، ۳۱۔

علامہ آلوسی نے اپنے مذکورہ رسالے میں اس کے بعد واقعۂ صفین کا ذکر کیا ہے۔ واقعہ ذکر کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

وأهل السنة إلا من شذ يقولون إن عليا كرم الله تعالى وجهه في كل ذلك على الحق لم يفترق عنه قيد شبر وإن مقاتليه في الوقعتين مخطئون باغون وليسوا كافرين -خلافا للشيعة- ولا فاسقين خلافا للعمرين أصحاب عمرو بن عبيد من المعتزلة ولمن شذ من أهل السنة، ولا أن أحد الفريقين، من علي كرم الله وجهه ومقاتليه، لا بعينه فاسق خلافا للواصلية أصحاب واصل بن عطاء المعتزلي. أما أن الحق مع علي كرم الله وجهه فغني عن البيان. وأما كون المقاتل باغيا فلأن الخروج على الإمام الحق بغي وقد صح أنه - صلى الله عليه وسلم - قال: «ويح عمار تقتله الفئة الباغية» وقد قتله عسكر معاوية.[۱]

سوائے چند شاذ لوگوں کے، باقی اہل السنت کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان تمام [جنگوں] میں حق پر تھے، وہ حق سے ایک بالشت برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے اور یہ کہ دونوں واقعوں [جمل اور صفین] میں حضرت علیؓ سے قتال کرنے والے غلطی کرنے والے باغی تھے۔ یہ حضرات کافر نہیں تھے، جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں، نہ ہی فاسق تھے جیسا کہ عمرو بن عبید معتزلی یا بعض شاذ اہل السنت کہتے ہیں۔ یہ بات بھی [اہل السنت نہیں کہتے] کہ ایک فریق غیر متعین طور پر غلط فاسق تھا جیسا کہ واصل بن عطاء معتزلی کے پیروکار کہتے ہیں [یعنی اہل السنت کے نزدیک کسی بھی فریق کو

۱۔ نفس مرجع، ۳۸۔

متعین طور پر یا غیر متعین طور پر فاسق کہنا درست نہیں]۔ جہاں تک [اہل السنت کے مذہب کے پہلے حصے کا] تعلق ہے کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا تو [یہ اتنا واضح ہے کہ] اسے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ آپ سے قتال کرنے والا باغی تھا تو اس وجہ سے کہ امام برحق کے خلاف خروج کرنا بغاوت ہے اور یہ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی اور حضرت عمار کو حضرت معاویہ کے لشکر نے قتل کیا۔

## محض بغاوت کی وجہ سے کفر، فسق یا لعنت کا اطلاق درست نہیں

اس کے بعد علامہ آلوسیؒ نے الفئۃ الباغیۃ والی حدیث میں کی جانے والی تاویلوں کی تردید کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ بغاوت کی وجہ سے کسی کا کفر ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے پہلی دلیل سورۂ حجرات کی آیت ہے، جس میں جہاں الفئۃ الباغیۃ کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا ہے، وہیں دونوں جماعتوں کو مؤمن قرار دیا ہے۔ ایک مضبوط دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے صلح کی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ مقابل فریق کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ درمیان میں انھوں نے شیعوں کے متعدد اعتراضات کے جواب دیے ہیں، اس کے بعد ایک واقعے سے علامہ الوسیؒ نے استدلال کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بھی حضرت علیؓ سے قتال اور بغاوت پر ندامت کا اظہار کیا ہے۔ غالباً اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اہل صفین پر بھی فاسق کا اطلاق درست نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کسی کو فاسق کہتا ہے دلیل اس کے ذمے ہوتی ہے، لہذا یہاں بھی مدعی کے ذمے دلیل ہوگی کہ باغی فاسق بھی ہوتا ہے، جب کہ ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے۔

شاہ عبد العزیزؒ نے فسق کی نفی اور انداز سے کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> اب رہا یہ شک کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کردار باغیانہ تھا[1] اور وہ ناحق غلبہ حاصل کرنے والے تھے تو [اہل السنت] ان پر لعن کیوں نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک گناہِ کبیرہ کے مرتکب پر لعن جائز نہیں اور چوں کہ بغاوت بھی کبیرہ گناہ ہے، اس لیے اس پر لعن منع اور ناجائز ہے۔[2]

لیکن میرے نزدیک یہ مقدمہ ہی محلِّ نظر ہے کہ ہر بغاوت کبیرہ گناہ ہوتی ہے، یا کسی بھی کبیرہ کا ارتکاب کرنے سے آدمی مطلقاً فاسق ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تفصیل میں جانے سے بات دوسری طرف نکل جائے گی، لیکن ایک بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ باغی اگرچہ غلطی پر ہو اس کے پاس تأویل ہوتی ہے، اور تاویل چاہے بذاتِ خود غلط ہو، لیکن اس کے نتیجے میں متعدد احکام میں تخفیف ضرور ہوتی ہے، حتیٰ کہ کفر جیسے حکم میں بھی تاویل سے تخفیف ہو جاتی ہے؛ اس لیے کہ فقہا کی ذکر کردہ تفصیل کے مطابق اگر کچھ لوگ جتھا بنا کر امام برحق کی طاعت سے نکل جائیں اور کسی جگہ پر اپنی عمل داری قائم کر لیں تو اگر تو ان کی کوئی تاویل نہیں ہے تو وہ لصوص اور قطاع الطریق یعنی ڈاکو کہلائیں گے، اگر ان کی تاویل ہے تو اگر اپنے علاوہ کو کافر بھی کہتے ہیں تو وہ خوارج ہیں اور اگر اپنے علاوہ کو کافر نہیں کہتے، تاہم تاویل رکھتے ہیں یعنی ایسی وجہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں (اگرچہ

---

۱- کردار باغیانہ تھا یہ اردو مترجم کا ترجمہ ہے اصل فارسی عبارت یہ ہے ''آمدیم باین کہ چوں اورا باغی و متغلب می دارند پس چرا لعنِ او نمی کنند''، یعنی اب اہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ جب اہل السنت حضرت معاویہ کو باغی و متغلب سمجھتے ہیں تو ان پر لعنت کیوں نہیں کرتے۔"

۲-شاہ عبد العزیز، **تحفہ اثنا عشریہ** (اردو)، ۳۶۰۔

امرِ واقعہ میں ان کا ایسا سمجھنا درست نہ ہو) تو وہ باغی کہلائیں گے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ امام عادل کی طاعت سے جتھا بنا کر نکلنے کی صورتوں میں سے شناعت میں سب سے کم صورت بغاوت کی ہے۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے جنگ کے بیش تر ظاہری احکام خوارج اور بغاۃ پر ایک جیسے لاگو کیے اور حضرت علیؓ کو فقہا نے اس باب میں اسوہ قرار دیا ہے، لیکن نصوصِ نبویہ اور خود حضرت علیؓ کے ارشادات کی روشنی میں دیکھیں تو خوارج کے لیے جس طرح کے سخت الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ بغاۃ کے لیے استعمال نہیں ہوئے، بلکہ حضرت علیؓ نے دونوں طرف کے مقتولین کو جنتی قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لصوص کو بھی فاسق ہی کہہ سکتے ہیں کافر نہیں، خوارج بھی راجح قول کے مطابق فاسق ہی ہیں کافر نہیں، تو باغی جس کی شناعت ان دونوں سے بہت کم ہے، اس پر بھی فاسق کا اطلاق کریں گے تو فرق کیا رہ جائے گا؟ اس لیے مجھ ناچیز کی رائے میں باغی پر فاسق کے اطلاق کا اصول ہی محل نظر ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مد مقابل فریق کے مجتہد ہونے سے یہاں امام کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ یہاں عام طور پر جس کو اجتہاد کہا جاتا ہے اس کے لیے ٹھیٹھ فقہی اصطلاح ''تاویل'' ہے۔ اور تاویل کی موجودگی بغاوت کے تحقق میں مانع نہیں ہوتی، بلکہ حنفیہ کی اصطلاح کے مطابق باغی بنتا ہی تاویل (اجتہاد) سے ہے۔

---

[1] چناں چہ ابن عابدین کے **الدر المختار** پر حاشیہ **رد المحتار** میں ہے: (قوله: وبغاة) هم كما في الفتح قوم مسلمون خرجوا على إمام العدل ولم يستبيحوا ما استباحه الخوارج من دماء المسلمين وسبي ذراريهم اهـ والمراد خرجوا بتأويل وإلا فهم قطاع كما علمت. وفي الاختيار: أهل البغْي كل فئة لهم منعة يتغلبون ويجتمعون ويقاتلون أهل العدْل بتأويل يقولون: الحق معنا ويدعون الولاية. اهـ.

نیز یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حضرت معاویہؓ کی جماعت پر بغاۃ والا حکم تب تک تھا، جب تک حضرت حسنؓ نے ان سے صلح نہیں کی تھی۔ صلح کے بعد حضرت معاویہؓ مسلمانوں کے جائز حکم ران بن گئے؛ اس لیے اب ان پر بغاوت کا اطلاق نہیں ہو گا۔ چناں چہ شاہ عبد العزیزؒ لکھتے ہیں:

> یہاں پر یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بعض جاہل امامیہ انتہائی عناد و تعصب کی بنا پر کہتے ہیں کہ اہل سنت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں۔ یہ قول انتہائی بے شرمی اور شوخ چشمی پر مبنی ہے اور اس کو منہ پر جھوٹ بولنا کہتے ہیں۔ ورنہ معمولی پڑھا لکھا فارسی خواں[1] جس نے اہل سنت کے مولانا عبد الرحمان جامی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ عقائد نامہ فارسی پڑھا یا دیکھا ہے، یقین سے جانتا ہے کہ اہل سنت سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ابتداے امامت سے لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے معاملۂ امامت حوالہ کرنے تک ، حق پر نہیں تھے، بلکہ باغی جیسا کردار ادا کر رہے تھے۔ اس لیے کہ امام وقت کی اطاعت چھوڑ بیٹھے تھے، امام حسن رضی اللہ عنہ نے جب امامت سپرد کی تو اس وقت وہ بادشاہ ہوئے۔[2]

---

۱-اس زمانے میں ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگ عموماً فارسی پڑھنے والے ہوتے تھے، خود **تحفہ اثنا عشریہ** بھی فارسی میں ہے، بظاہر لگتا ہے کہ مولانا جامی کی کتاب اس زمانے میں متداول ہو گی، اس لیے اس کا حوالہ دیا کہ شیعوں کا یہ اعتراض ایک متداول و معروف کتاب کے بھی خلاف ہے۔

۲-شاہ عبد العزیز، مرجع سابق، ۳۶۰۔ باغی کے ساتھ ''جیسا'' کا لفظ مترجم نے زائد کر دیا ہے اصل فارسی میں شاہ صاحب کی تعبیر یوں ہے: ''*اہل سنت قاطبۃ اجماع دارند بر آن کہ معاویہ بن ابی سفیان از ابتدای امامت*

حاصل یہ کہ حضرت علیؓ سے قتال کرنے والے تمام گروہ غلطی پر تھے، لیکن اہلِ جمل و صفین کو فاسق کہنا جائز نہیں، ان پر لعن طعن اور سب و شتم کرنا جائز نہیں، ایک خاص معاملے میں جتنی غلطی ان سے ہوئی ہے اس کے بیان سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔

بہر حال ہماری گفت گو کا اصل موضوع اہل جمل و صفین نہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت احادیث نبویہ کی روشنی میں ہے۔ احادیث سے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داخلی قتالوں کی تصویب فرمارہے ہیں بلکہ ان کی بعض جگہ تحسین بھی فرمارہے ہیں؛ اس لیے داخلی جنگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عیب اور نقص شمار کرنا درست نہیں ہے۔

## متخلفین کا نقطۂ نظر

اب تھوڑی سی بات ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی مناسب معلوم ہوتی ہے، جو کسی طرف سے بھی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ جو لوگ کسی طرف سے بھی جنگ میں شریک نہیں ہوئے، ان کا معاملہ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے مقابلے میں بہت اہون ہے جو آپ کے مقابلے میں بر سرِ پیکار تھے؛ کیوں کہ ان کی اگر کوئی کوتاہی فرض کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ امامِ عادل کی نصرت سے وہ محروم رہے۔ جب ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مقاتلین کو برا بھلا کہنا درست نہیں، تو یہ حضرات تو بالکل ہی قابلِ ملامت نہیں ٹھہرتے؛ کیوں کہ کفار کے خلاف بھی جہاد فرضِ عین تب ہوتا ہے، جب کہ یا تو امام نفیرِ عام

---

حضرت امیر بغایت تفویض حضرت امام حسن باو از بغاۃ بود کہ اطاعت امام وقت نداشت ، وبعد از تفویض حضرت امام بدو از ملوک شد۔"

کر دے یا کسی کو متعین طور پر جانے کا حکم دے دے۔ اہل بغی کے قتال میں بطریقِ اولی یہ بات ہو گی۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کو بطور حکمِ امیر المؤمنین متعین طور پر قتال میں شریک ہونے کا پابند کیا ہو یا عمومی حکم جاری کیا ہو کہ سب کا نکلنا ضروری ہے۔ آپ نے افراد سے جو بات کی وہ بھی عموماً ترغیب ہی کے انداز میں تھی، اور عمومی خطابات بھی اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ اس لیے ان میں سے اکثر پر اعتراض سرے سے بنتا ہی نہیں ہے۔ نہ معلوم کس کس کے کیا اعذار ہوں گے! البتہ بعض حضرات کا پیچھے رہنا بطور رائے تھا۔ بعض کی رائے ہو سکتا ہے کہ پالیسی کی نوعیت کی ہو۔ یعنی جب بغاوت کی شرائط متحقق ہو جائیں تو امامِ عادل کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ سمجھانے بجھانے اور ازالۂ شبہات کی کوشش کے بعد قتال کا فیصلہ کرے، لیکن وہ حتمی طور پر قتال کا پابند نہیں ہو جاتا، بلکہ اس نے حالات و واقعات دیکھ کر فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ قتال کرنا بہتر پالیسی ہو گی یا نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے کچھ حضرات کا یہ خیال ہو کہ اگرچہ مخالف فریق کا طرزِ عمل درست نہیں ہے، اس کے باوجود ان سے قتال کے بجائے کوئی اور پالیسی اختیار کرنا بہت زیادہ بہتر ہو گا۔ اس رائے کا براہِ راست حکمِ شریعت سے تعلق نہیں ہے، اس لیے یہاں اس پر بات کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ ہم نے شروع میں عرض کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں کے سیاسی مضمرات وغیرہ یہ الگ موضوعِ بحث ہے؛ تاہم قتال سے پیچھے رہنے والے حضرات میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو باقاعدہ اپنی ایک خاص رائے کے تحت قتال سے پیچھے رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ترغیب کے باوجود انھوں نے اپنی اس رائے کی بنیاد پر معذرت کر لی۔ ان حضرات کی رائے میں چوں کہ نصوص کا حوالہ اور شرعی پہلو بھی آتا ہے؛ اس لیے ان کے موقف کو ذرا سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے بھی کہ آج کل بعض لوگ ان کی رائے کی بطور

خاص بڑی تمجید کرتے ہیں کہ دیکھیں جی، یہ سارا ماحول دنگے فساد کا تھا، اس لیے بڑے بڑے صحابہ نے خود کو اس لیے الگ رکھا، سب سے بہتر دانش مندانہ انداز انھی کا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ جو قتال کرتے پھر رہے تھے، وہ بس ویسے ہی لگے ہوئے تھے۔ گویا براہِ راست حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدامات کی تنقیص تو مشکل ہے، یہ کام بالواسطہ طریقے سے کرو۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کا تعلق ہے تو اس کا انکار تو خود مقاتلین سے ثابت نہیں، تو توقف کرنے والوں کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے منکر تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ معلوم کتنے حضرات تو ذاتی اعذار کی وجہ سے قتال کا حصہ نہیں بنے ہوں گے،[1] یا بالتعیین تشکیل نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے ضروری نہیں سمجھا ہو گا؛ تاہم متوقفینِ صحابہ کی ایک جماعت کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ وہ یہ کہ کسی بھی مسلمان گروہ کے لیے کسی بھی حالت میں کسی دوسرے مسلمان گروہ کے خلاف قتال کرنا جائز نہیں ہے اور اگر دو مسلمان گروہوں کے درمیان قتال ہو رہا ہو تو کسی بھی حالت میں ان میں سے کسی کی حمایت یا مخالفت میں قتال میں حصہ لینا جائز نہیں ہے۔ ان حضرات کا مستدل ان احادیث کا عموم تھا جن میں دورِ فتن میں قتال سے الگ تھلگ

---

۱۔ بعض فقہاے حنفیہ نے سب متخلفین کے تخلف کو عدمِ قدرت پر محمول کیا ہے، چناں چہ سرخسی لکھتے ہیں: والذي روي أن ابن عمر – رضي الله عنهما – وغيره لزم بيته تأويله أنه لم يكن له طاقة على القتال، وهو فرض على من يطيقه ، بہت سے صحابہ کے بارے میں یہ وجہ بھی درست ہے، لیکن سب پر اس کا اطلاق بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔ صحیح تعبیر عذر کی ہے، یعنی وہ عذر کی وجہ سے پیچھے رہے۔ عذر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں قتال کی رائے سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ دوسری طرف بھی مسلمان ہیں۔

رہنے کا حکم دیا گیا ہے یا مسلمانوں کی باہمی جنگ کی مذمت بیان کی گئی ہے۔[1] مثلاً حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ قتال سے اس لیے الگ رہے، بلکہ **صحیح بخاری** کی روایت کے مطابق احنف بن قیس

---

[1]- ان حضرات کی یہ بات کہ وہ حضرت علیؓ کی خلافت کا انکار نہیں کر رہے، اپنی اس خاص رائے کی وجہ سے قتال میں شرکت سے معذرت کر رہے ہیں، خود ان اہل توقف کی روایات سے واضح ہے۔ اس کے علاوہ ابن العربی بھی لکھتے ہیں: قالت العثمانية: تخلف عنه من الصحابة جماعة، منهم سعد بن أبي وقاص ومحمد بن مسلمة، وابن عمر، وأسامة بن زيد وسواهم من نظرائهم. قلنا: أما بيعته فلم يتخلف عنها. وأما نصرته فتخلف عنها قوم منهم من ذكرتم (ابو بکر ابن العربی، **العواصم من القواصم** (بیروت: دار الجيل، ۱۹۸۷ء)، ۱۵۰۔؛ اسی طرح قاضی ابو بکر باقلانی بڑی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ ان اہل تخلف نے کیا دلیل پیش کی، ساتھ ہی اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ امام نہیں ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں: قيل لهم ليس في جميع القاعدين ممن أسميناه أو أضربنا عن ذكره مَن طعَنَ في إمامته واعتقدَ فسادَها ، وإنما قعدوا عن نصرته على حرب المسلمين لتخوفهم من ذلك وتجنب الإثم فيه، وظنِّهم موافقة العصيان في طاعته في هذا الفعل؛ فلذلك احتجوا عليه في القعود ورووا له فيه الأخبار، وقال منهم قائل: لا أقاتل حتى تأتيني بسيف له لسانٌ يعرف المؤمن من الكافر، ويقول هذا مؤمن وهذا كافر فاقتله ، **ولم يقل إنك لست بإمام واجب الطاعة** وقال له محمد بن مسلمة بعد مراجعته ومعارضته: إن رسول الله ﷺ عهد إلي إذا وقعت فتنة بين المسلمين أن أكسر سيفي وأتخذ مكانه سيفا من خشب وفي خبر آخر أن أغمد سيفي وأمتسك في بيتي حتى تأتيني ميتة ماضية أو يد خاطئة ، فاحذر يا علي لا تكن أنت تلك اليد الخاطئة ، **ولم يقل له: لستَ بإمام مفروض الطاعة** وكذلك قال له أسامة بن زيد: قد علمتَ يا علي أنك لو دخلتَ بطن أسد لدخلتُ معك فيه ولكن

کو بھی قتال میں شریک ہونے سے اس لیے روکا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب دو مسلمان تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مد مقابل ہوں تو قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں دوزخی ہیں۔ اس طرح کی بھی متعدد روایات ہیں کہ خود حضرت علیؓ کے سامنے بعض صحابہ نے لڑائی میں عدمِ شرکت کا یہ عذر پیش کیا کہ مدّ مقابل فریق بھی مسلمان ہے، اور فتنہ میں ترکِ قتال اور الگ تھلگ رہنے کی کوئی حدیث پیش کی، کسی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے حالات میں لکڑی کی تلوار بنانے کا حکم دیا تھا، چناں چہ میں نے لکڑی کی تلوار بنالی ہے۔ کسی نے لڑائی سے شرکت کرنے سے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے کہ قتال تب تک کرنا ہے، جب تک لوگ کلمہ نہ پڑھ لیں، جب کلمہ پڑھ لیں تو قتال نہیں کیاجائے گا۔ یعنی یہاں مدّ مقابل چوں کہ کلمہ گو ہیں اس لیے قتال نہیں کریں گے۔ اس طرح کے مکالمات سے اتنی بات تو واضح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ان نصوص کو جس موقع پر فٹ کررہے ہیں، اس موقع کے بارے میں یہ نصوص نہیں ہیں۔ وگرنہ تو نص سن کر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان کی بات کے قائل ہوجاتے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ایسی نصوص موجود ہیں جن میں مسلمانوں کے باہمی قتال میں شرکت سے منع کیاگیاہے، لیکن جس طرح سے ان حضرات نے ان نصوص کو سمجھاہے، بعد میں اس تشریح کا کوئی بھی قائل نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان استدلالات کو مان لینے سے بعض ایسے محذورات لازم آتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی شاید ان کا قائل نہیں ہوگا۔

---

لامواساة في النار ، **ولم يقل إنك لست بإمام** وإنما خاف من قتل المسلمين ، **وليس هذا من القدح في الإمامة بسبيل.** (ابو بکر الباقلانی، **تمهيد الأوائل في تلخيص الدلائل** (لبنان:مؤسسة الكتب الثقافية)، ۵۵۴۔)

مثلاً حضرت ابو بکرہؓ نے جس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے احنف بن قیس کو قتال میں حصہ لینے سے منع کیا ہے، اسے اگر مان لیا جائے تو مطلب یہ بنے گا کہ اس جنگ میں دونوں طرف سے شریک ہونے والے خواہ وہ مقتول ہوں یا قاتل دوزخی ہیں، جب کہ دنیا میں کوئی بھی مسلمان اب ایسا نہیں ہو گا کہ جو اس بات کا قائل ہو کہ ان جنگوں کے سارے شرکا اور تمام مقتولین دوزخی تھے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فریقین کے مرنے والوں کو جنتی قرار دیا۔ یہی حال باقی نصوص کا ہے، ان کے اپنے محامل ہیں، جس کی تفصیل کی طرف جانے سے بات دوسری طرف نکل جائے گی؛ چناں چہ اس بات پر کم از کم اہل السنت کا اتفاق موجود ہے اور کوئی اختلاف کہیں نظر نہیں آتا کہ اگر امام عادل موجود ہو اور کچھ لوگ اس کی طاعت سے نکل جائیں اور باغی کی شرائط متحقق ہو جائیں تو امام کو ان کے مسلمان ہونے کے باوجود ان کے خلاف قتال کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے اور اگر امام ایسا فیصلہ کرے تو اصل حکمِ شرعی یہی ہے کہ اس کے کہنے سے باغی گروہ کے خلاف قتال کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن نصوص کو ان بعض صحابہ نے قتال سے عذر کے طور پر پیش کیا، ان کے بارے میں اتنی بات پر تو اتفاق ہو گیا ہے کہ یہ خاص صورت اس میں داخل نہیں ہے، اور اس حد تک ان احادیث میں تخصیص اتفاقی ہو چکی ہے۔ ویسے بھی ان حدیثوں کو اگر اپنے عموم پر لیں تو یہ نص قرآنی کے خلاف ہو جاتی ہیں؛ اس لیے کہ قرآن جن کے بارے میں کہہ رہا ہے فقاتلوا التي تبغي یہ مؤمنین ہی کا ایک طائفہ ہے، لہٰذا ''بغی'' کے پائے جانے کی صورت میں کسی مسلمان گروہ سے قتال کرنا خود نص قرآنی سے ثابت ہے؛ اس لیے صحیح یہی ہے کہ چوں کہ اس خاص وقت میں حالات میں الجھاؤ بہت زیادہ تھا، اس طرح کی صورتِ حال سے پہلی دفعہ واسطہ پڑ رہا تھا، اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کے خلاف قتال ایک تکلیف دہ امر

ضرور ہے، جس کا سب سے زیادہ اظہار خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتالِ بغاۃ میں نپے تلے انداز سے ہوتا ہے؛ اس لیے فوری طور پر یا غلبۂ حال میں تمام نصوص کی طرف توجہ نہ جانے کی وجہ سے ان چند حضرات سے ان نصوص کے فہم میں غلطی ہوئی اور ان نصوص کو عموم پر محمول نہ کرنے پر بعد کے ادوار میں اتفاق ہو گیا ہے، بلکہ خود قرن اول میں بھی، بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، جمہور کی رائے یہی تھی کہ یہ حدیثیں اپنے عموم پر محمول نہیں۔[1] چوں کہ انھوں نے اگرچہ غلطی کی، لیکن نیک نیتی سے رائے قائم کرنے کی کوشش کی، اس لیے وہ قابل طعن و ملامت بھی نہیں، اور حالات کی گرد بیٹھنے کے بعد ان کی رائے کو اختیار کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ اگر یہ بات درست ہے، اور یقیناً درست ہے کہ یہ حدیثیں اپنے عموم پر محمول نہیں اور مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی باہمی قتال ایسا ضرور ہے جو مستثنیٰ اور جائز ہے، تو اس کا سب سے زیادہ حق دار خلیفۂ راشد کا قتال ہو گا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتال اس میں داخل نہیں تو بعد میں کسی اور کا باغیوں کے خلاف قتال کرنا بھی اس میں داخل نہیں ہونا چاہیے اور ان تمام قتالوں پر وہی مذکورہ استدلال لاگو کر کے ان سے پیچھے رہنے والوں کی تمجید کرنی چاہیے، بلکہ

---

۱- چناں چہ حافظ فرماتے ہیں: واحتج به من لم ير القتال في الفتنة وهم كل من ترك القتال مع علي في حروبه كسعد بن أبي وقاص وعبد الله بن عمر ومحمد بن مسلمة وأبي بكرة وغيرهم وقالوا يجب الكف حتى لو أراد أحد قتله لم يدفعه عن نفسه ومنهم من قال لا يدخل في الفتنة فإن أراد أحد قتله دفع عن نفسه وذهب جمهور الصحابة والتابعين إلى وجوب نصر الحق وقتال الباغين وحمل هؤلاء الأحاديث الواردة في ذلك على من ضعف عن القتال أو قصر نظره عن معرفة صاحب الحق. (ابنِ حجر، **فتح الباري**، ۱۳:۳۴۔)

فقہ کی کتابوں سے أحكام البغاة کا باب ہی نکال دینا چاہیے۔ حیرت کی بات ہے کہ سید احمد شہیدؒ سکھوں کے علاوہ مسلمانوں سے قتال کریں، ملا عمر اپنے مخالف مسلمانوں کے خلاف قتال کریں تو اس سے اختلاف کرنے والوں کی تمجید تو نہ کی جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کے بارے میں اسی مرجوح استدلال کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے جو ہر اس جائز اور نیک سے نیک حکم ران کے خلاف پیش ہو سکتا ہے جو اپنی حکومت کی رِٹ منوانے کے لیے کسی بھی درجے میں طاقت کا استعمال کرے۔ جیسا کہ ہم نے اس بحث کے شروع میں عرض کیا، کسی موقف کی درستی کو جانچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اب اگر اسی طرح کی صورتِ حال ہوتی ہے تو اس موقف سے استدلال کتنا وزنی ہو گا۔ فرض کر لیں آپ کو یا آپ کی کسی محبوب ترین ہستی کو جو علم، تقویٰ دیانت وغیرہ ہر اعتبار سے بہت اونچے مرتبے پر فائز ہیں، انھیں امیر المؤمنین بنا دیا جاتا ہے، بالکل جائز طریقے سے، اس وقت کے مروجہ دستور کے بالکل مطابق، اب کچھ لوگ ان امیر المؤمنین کے خلاف باقاعدہ لشکر تشکیل دے کر ان کی رٹ کو چیلنج کر دیتے ہیں اور آپ کے وہ امیر المؤمنین آخر کار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نپا تُلا ہی سہی، طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ ایسے میں کچھ دانش منداسی طرح کے استدلالات لے کر آپ کے امیر المؤمنین کے پولیس اور فوج کے افسران کے پاس پہنچ جاتے ہیں، جی دیکھیں آپس کی لڑائی بھڑائی اچھی بات نہیں ہوتی، صلح صفائی سے مسئلے حل ہونے چاہییں، بس جاؤ سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھو، اپنی بندوقوں کو کند کر دو، اپنے ذہن سے لڑائی کا خیال نکال دو۔ ایسے دانش مندوں کے بارے میں صرف یہ کہنے کے بجائے کہ مخلص اور نیک نیت ہونے کی باوجود چوں کہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے اس لیے معذور ہیں، اس کے بجائے ان حالات میں ان ''دانش مندوں'' کے موقف کی تمجید کی جائے اور کہا جائے کہ کرنے کی بات

تو انھوں نے ہی کی ہے، یہ ہیں صحیح صلح پسند لوگ، تو سوال یہ ہے کہ آج اگر اس طرح کی صورتِ حال ہو، اور آپ کے کسی محبوب امیر المؤمنین کے بر عکس اس موقف کو اس طرح تمجید کے ساتھ پیش کیا جائے تو آپ کے خیال میں کتنا درست ہو گا، اور دنیا کا کون سا فقیہ اس اندازِ فکر کو درست قرار دے گا؟[1]

اس طرح کے موقف کو درست مان لینے اور ان نصوص کو عموم پر محمول کرنے کا عملی نتیجہ کیا ہو گا؟ اسی کو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، ابن جریر طبریؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال الطبري لو كان الواجب في كل اختلاف يقع بين المسلمين الهرب منه بلزوم المنازل وكسر السيوف لما أقيم حد ولا أبطل باطل ولوجد أهل الفسوق سبيلا إلى ارتكاب المحرمات من أخذ الأموال وسفك الدماء وسبي الحريم بأن يحاربوهم ويكف المسلمون أيديهم عنهم بأن يقولوا هذه فتنة وقد نهينا عن القتال فيها وهذا مخالف للأمر بالأخذ على أيدي السفهاء.[2]

طبری کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں اگر اس بات کو واجب قرار دے دیا جائے کہ گھروں میں بیٹھ کر اور تلواریں توڑ کر اس

---

۱-اور اب حالیہ دنوں میں توپیغامِ پاکستان وغیرہ کے نام سے تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ اور جلیل القدر علما کی طرف سے جدید مسلم ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے خلاف بھی فوجی اقدام کی حمایت کی گئی ہے۔ متوقفین کا بیانیہ مان لیا جائے تو یہ بیانیہ بھی غلط ٹھہرے گا۔

۲-ابنِ حجر، **فتح الباري**، ۱۳:۳۴۔

اختلاف سے راہِ فرار اختیار کی جائے [جیسا کہ بعض نے سمجھا] تو کوئی حد قائم نہ ہو سکے، کسی باطل کو ختم نہ کیا جا سکے اور اہل فسق مال لوٹنے، خون بہانے اور عزتیں لوٹنے جیسے محرمات کا کھلا راستہ پالیں، اس طرح سے کہ وہ تو مسلمانوں سے بر سرِ پیکار ہوں گے اور مسلمان اپنے ہاتھ روک لیں گے کہ [چوں کہ دوسرا فریق بھی مسلمان ہے اس لیے] یہ "فتنہ" ہے اور ہمیں فتنے میں قتال سے منع کیا گیا ہے۔

پھر خوارج کے خلاف قتال کے بارے میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ مہربان متجددین بھی مانتے ہیں کہ وہ بہت اعلیٰ کارنامہ ہے، حالاں کہ متوقفین صحابہ کا مذکورہ بالا استدلال تو اس کے بھی خلاف جاتا ہے، اس لیے کہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو کافر قرار دیا ہو، بلکہ اس کے برعکس عدمِ تکفیر کے اقوال ملتے ہیں۔[1] اس لیے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں قتال کرنے والوں کو معذور سمجھ کر ان پر طعن سے گریز کیا جاتا ہے، ان کے موقف کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں تمجید نہیں کی جاتی، یہی معاملہ اہل توقف کا بھی ہے۔ توقف کی اس رائے کی تمجید کرنے والے تأثر تو یہ دے رہے ہوتے ہیں کہ وہ عظمتِ صحابہ کا فرض انجام دے رہے ہیں، لیکن حقیقت میں صحابہ کے دو بڑے فریقوں کو بیک وقت مطعون کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ اتنی بڑی دانش مندی سے محروم ہی رہے۔ یہ دیکھیں کتنی خوب صورت صلح صفائی کی باتیں کر رہے تھے، لیکن ان

---

۱- اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کے فیصلوں میں کیڑے نکالنے والے یہی لوگ خاندان بنو امیہ کے متعدد حکم رانوں کے کارناموں میں یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے فلاں فلاں موقع پر خوارج سے لڑائی کی اور بغاوت کو بزورِ طاقت فرو کیا، یہاں آ کر یہ استدلالات ان کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ کیا اس دور تک وہ تلواریں ایجاد ہو چکیں تھیں جو مسلم و غیر مسلم کے درمیان تفریق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی یا اب یہ صحابہ کے اقوال نہیں رہے تھے کسی اور کے بن گئے تھے؟

دونوں فریقوں کو نعوذ باللہ سمجھ نہیں آئیں۔ جس طرح سے یہ صحابہ غلبۂ احتیاط کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف قتال سے ہچکچاہٹ کا شکار تھے، اس سے اللہ تعالی کی یہ تکوینی حکمت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اللہ تعالی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی جلیل القدر شخصیت اور خلیفۂ راشد سے قتالِ بغاۃ کا نمونہ قائم نہ کروا دیا ہوتا، تو بہت سے نیک طبیعت لوگوں کے لیے اس مسئلے کو مسئلہ شرعیہ سمجھنا ہی مشکل ہو جاتا، کوئی بھی حکومت کسی بھی حالت میں اندورنی طور پر طاقت کا استعمال نہ کر پاتی یا کم از کم اس کا شمار بھی خاصے اختلافی مسائل میں ہوتا۔

پھر متخلفین کی یہ آرا کب تک باقی رہیں؟ یہ الگ سوال ہے؛ اس لیے کہ تین واقعے بعد میں ایسے پیش آئے جو بہت سوں کی رائے میں تبدیلی پیدا ہونے کا ذریعہ بن سکتے ہیں: ایک تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت، جس پر تفصیل سے بات ہو چکی؛ چناں چہ حضرت خزیمۃ بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے قتال کے معاملے میں متردد تھے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھوں نے قتال میں حصہ بھی لیا اور شہید بھی ہوئے۔ دوسرا بڑا واقعہ قتالِ خوارج کا خاص معرکہ ہے جس میں ذو الثدیہ مارا گیا تھا۔ اس جماعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت اچھے الفاظ منقول ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بر حق ہونے کی دلیل سمجھا۔ تیسرے بعد میں پیش آنے والے یزید کے اور خاندان مروان کے کرتوت؛ چناں چہ متخلفین میں ایک بڑا نام، بلکہ جنھیں رئیس المتخلفین کہا جا سکتا ہے، وہ ابن عمرؓ ہیں؛ ان کے بارے میں بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ انھیں بھی بعد میں ندامت رہی کہ میں نے الفئۃ الباغیۃ کے خلاف قتال کیوں نہ کیا۔ جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں جانے والی ہر روایت میں تاویل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے، ان کی اس تاویل پر بھی بات ہو چکی ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات پر افسوس تھا کہ حجاج بن یوسف کے ساتھ

مل کر حضرت عبد اللہ بن زبیر کے خلاف "جہاد" کیوں نہ کر سکا، لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس تاویل کو مان لیتے ہیں، تو کم از کم یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ صلح کل والے بیانیے اور نظریے پر قائم نہیں رہے تھے، بلکہ حجاج بن یوسف جیسے "عادل" کے ساتھ مل کر قتال کرنے کے قائل ہو گئے تھے؛ تو تخلف والے نظریے کی اساس تو بہر حال ختم ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزر تا گیا، گرد بیٹھتی گئی، رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی پیش گوئیاں سامنے آتی گئیں، دلائل پر غور بڑھتا گیا تو حضرت علیؓ کے خلاف قتال کرنے یا ان کی حمایت سے تخلف کو مطلوبِ شرعی سمجھنے کی رائے تقریباً ختم ہوتی گئی، تا آنکہ حضرت علی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کی اصابت پر اہل السنت کا تقریباً اتفاق ہو گیا۔ متعدد مسائل میں ہوا کہ ابتدا میں تو دلائل میں ابہام کی وجہ سے صحابہ میں کچھ اختلاف ہو گیا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک رائے پر اتفاق ہوتا چلا گیا اور دوسری رائے تقریباً متروک ہو گئی، جیسے ربا الفضل کے جواز کی رائے یا متعۃ النساء کے محدود جواز کی رائے؛ چناں چہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

إلّا أنّ أهل العصر الثاني من بعدهم اتّفقوا على انعقاد بيعة عليّ ولزومها للمسلمين أجمعين ، وتصويبِ رأيه فيما ذهب إليه ، وتعيين الخطإ من جهة معاوية ومن كان على رأيه، وخصوصا طلحة والزّبير لانتقاضهما على عليّ بعد البيعة له فيما نقل مع دفع التّأثيم عن كلّ من الفريقين كالشّأن في المجتهدين وصار ذلك إجماعا من أهل العصر الثّاني على أحد قولي أهل العصر الأوّل كما هو معروف.

ولقد سئل عليّ رضي الله عنه عن قتلى الجمل وصفّين فقال: «والّذي نفسي بيده لا يموتنّ أحد من هؤلاء وقلبه نقيّ إلّا دخل

الجنّة» يشير إلى الفريقين نقله الطّبريّ وغيره فلا يقعنّ عندك ريب في عدالة أحد منهم الخ.[1]

مگر یہ کہ دوسرے دور اور اس کے بعد کے دور والے اس بات متفق ہو گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت منعقد تھی اور وہ تمام مسلمانوں پر لازم تھی[یعنی کسی کا یہ کہنا درست نہیں کہ چوں کہ فلاں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بالفعل بیعت نہیں کی؛ اس لیے اس پر یہ منعقدہ بیعت لازم نہیں اور اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت لازم نہیں] اور یہ کہ جو رائے اختیار کی اس میں حضرت علی صواب تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان جیسی رائے رکھنے والوں کی خطا متعین ہے، خصوصا حضرت طلحہ وزبیر، کیوں کہ روایت کے مطابق وہ بیعت کرنے کے بعد حضرت کے خلاف معرکہ آرا ہو گئے تھے؛ تاہم کسی فریق کو گناہ گار نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔ یہ پہلے دور کے دو قولوں میں سے ایک پر دوسرے دور کا اجماع ہے۔ جیسا کہ معروف ہے[یعنی ایسا ہوتا رہتا ہے]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جمل اور صفین کے مقتولین کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے ان میں جو شخص بھی صاف دل ہونے کی حالت میں فوت ہوا وہ جنت میں ضرور جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فریقین کے مقتولین کی بات کر رہے تھے [صرف ایک فریق کی نہیں] اس لیے ان میں سے کسی کی عدالت میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

---

۱ - عبدالرحمن بن محمد بن خلدون، **ديوان المبتدأ والخبر في تاريخ العرب والبربر ومن عاصرهم من ذوي الشأن الأكبر**، ت، خلیل شحادہ، والأمر الثّالث شأن الحروب الواقعة في الإسلام بين الصّحابة والتّابعين(بیروت:دار الفکر،۱۹۸۸ء)،۱:۲۶۸۔

ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اس گفت گو کا اصل موضوع وہی ہے جو بالکل شروع میں ہی عرض کر دیا ہے۔ ہمارا اصل موضوع خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور احادیث نبویہ ہے۔ حضرت علیؓ سے قتال کرنے والے یا ان کا ساتھ نہ دینے والے حضرات براہِ راست موضوع نہیں ہیں؛ تاہم جن کے پیشِ نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات یا ان خلافت کی پوزیشن کو کم زور کر کے پیش کرنا ہوتا ہے، ان میں ایسی جرأت بہت کم ہوتی ہے کہ وہ براہِ راست حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موضوعِ بحث بنا سکیں؛ اس لیے وہ عموماً بالواسطہ بات کرتے ہیں، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو ان جنگوں سے الگ تھلگ رہے، ان کے موقف کو اس طرح سے تعظیم کے ساتھ پیش کیا جائے کہ دیکھنے میں لگے کہ اصل دانش مندانہ راستہ تو یہی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو تلوار اٹھائے رہے، وہ اپنی ذات میں تو کوئی دانش مندانہ طرزِ عمل نہیں تھا، بس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جلالتِ شان کی وجہ سے اس کے بارے میں لب کشائی نہیں کر سکتے۔ جب کہ اہل السنت کا عمومی رخ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والے صحابہ ہوں یا مذکورہ رائے کے ساتھ ان سے تخلف کرنے والے؛ سب کا احترام واجب ہے، انھیں سب وشتم کرنا ناجائز ہے، ان کے دیگر مناقب وکمالات یا کارنامے جو بھی ثابت ہوں انھیں بیان کیا جائے گا، اللہ کے نبی سے نسبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھی جائے گی؛ لیکن ان خاص معاملات میں ان کی رائے کی تمجید کرنے کے بجاے ان کے لیے عذر تلاش کیا جائے گا؛ اس لیے کہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ تھا، ان کی رائے صواب تھی، فقہاے امت نے اس خاص باب میں ان کے طرزِ عمل کو اہم نمونہ تسلیم کیا ہے۔

نہ چاہنے کے باوجود بھی بات کسی قدر لمبی ہو گئی، پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کا اختتام شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی کتاب **تحفہ اثناعشریہ** کے ایک اقتباس پر کیا جائے ۔ اقتباس کا پس منظر یہ ہے کہ شاہ صاحب شیعہ کے مختلف طبقات یا فرقے بیان فرمارہے ہیں۔ شیعہ اصل میں کسی کی پارٹی اور اس کے حمایتی کو کہتے ہیں۔ مثلاً شیعانِ اہلِ شام تھے اور کچھ شیعان علی تھے۔ یہاں شیعانِ علی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حمایتیوں یا ان کی حمایت کے نام لیواؤں کی بات ہو رہی ہے۔ شیعان علی میں سب سے پہلا طبقہ وہ ہے جسے شاہ صاحب مخلص شیعہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ در حقیقت اہل السنت کے امام اور مقتدا ہیں۔ شاہ صاحب ان کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی ہونے کے باوجود دیگر کبارِ صحابہ وامہات المؤمنین کے حق کو پہچانتے تھے، جن صحابہ سے جنگ وجدل کرتے تھے ان کے بارے میں سینے کو کینے سے محفوظ رکھتے تھے۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں ان کے ہم قدم تھے، اسی طرح اس معاملے میں بھی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم قدم تھے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے تفضیلی، غالی اور تبرائی شیعوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تبرائیوں کی طرف سے شیعانِ مخلصین کو بھی برا بھلا کہا جاتا ہے، اس کی مزید تفصیل کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ان شیعان اولی ؛ [یعنی شیعانِ مخلصین] کی حالت واقعی قابل رحم ہے کہ شیعوں کے تمام گمراہ فرقوں اور خارجیوں دونوں کی لعنت وملامت کا نشانہ بنے اور سب کے ساتھ مخالفت اختیار کی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وراثت میں مسکنت اور غربتِ عظمی انہی کے نصیب میں آئی اور جنگ وجدال اور مجاہداتِ شاقہ کے لئے ان کے صحیح وارث یہی قرار پائے۔ در حقیقت یہ حدیث ان ہی کے حال پر ٹھیک منطبق ہوئی اور ان کے انجام کا پتا دیتی ہے۔

إن الدين بدأ غريبا وسيعود غريبا فطوبیٰ للغرباء.

و الحمد للہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں آگے چل کر یہ بات کھلے گی کہ شیعانِ اولیٰ میں مہاجرین و انصار کی اس جماعت کا شمار ہے جن میں سے اکثر سعادت مآب جناب مرتضیٰؓ کی ہم رکابی میں باغیوں اور قرآن میں تاویل کرنے والوں کے مقابلہ میں جنگ لڑ چکے تھے! ایسے ہی جنابِ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی رفاقت میں منکرین قرآن سے لڑائیوں میں شریک رہے تھے اور ان میں سے بعض ایسے تھے جو انتہائی پرہیز گاری اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اور اہل کلمہ اور اہل قبلہ کے قتال سے گریز کرتے ہوئے چند عذر پیش کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے اور جن کے سب عذر حضرتِ علیؓ نے قبول فرمائے تھے اور باوجود اس گوشہ نشینی کے انھوں نے آپؓ کے مناقب و فضائل کو پھیلانے اور آپؓ کی محبت پر لوگوں کو ابھارنے اور آپؓ کی عزت و تعظیم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے عمل سے اس آیت کی ترجمانی فرمائی:

ليس على الضعفاء ولا على المرضى ولا على الذين لا يجدون ما ينفقون حرج إذا نصحوا لله ورسوله ما على المحسنين من سبيل

(ترجمہ: "نہیں ہے ان ضعیفوں، مریضوں اور ان لوگوں پر جو خرچ کے لیے کوئی مال نہیں رکھتے کوئی حرج، جب کہ وہ اللہ اور رسول کے خیر خواہ ہوں اور نیکوں پر کوئی الزام نہیں۔")

اور آگے چل کر قارئین کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ بیعتِ رضوان کے حاضرین میں سے تقریباً آٹھ سو حضرات نے جنگِ صفین میں دادِ جان نثاری دی [1] اور تین سو

---

۱۔ اگرچہ واقعاتی امور کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ تاہم شاہ عبد العزیزؒ نے یہاں ایک بڑی غلط فہمی دور کر دی ہے۔ عام طور یہ تاثر کہ دونوں طرف صحابہ تھے، کچھ اس انداز سے دیا جاتا ہے کہ شاید اس وقت موجود صحابہ کو قدرت نے مکمل طور پر دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا آدھا بانٹ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات تو درست ہے کہ دونوں طرف صحابہ تھے، مگر صفین میں دونوں طرف صحابہ کی تعداد اور مرتبہ ومقام دونوں کے اعتبار سے زمین وآسمان کا فرق تھا۔ شاہ صاحب نے یہاں جو اعداد ذکر کیے ہیں وہ کچھ کم وبیش ہو سکتے ہیں، لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت کے افاضلِ صحابہ کی ایک بڑی تعداد حضرت علیؓ کے ساتھ تھی یا آپ کی ذہناً حامی تھی۔ جس طرح حضرت علیؓ کی حمایت میں جانے والی ہر بات کو الجھانے کی بعض لوگوں نے کوشش کی ہے، تعداد کے معاملے کو بھی الجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوں کہ اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں، اس لیے یہاں اس پر زیادہ بات نہیں ہو سکتی، تاہم اتنا عرض ہے کہ امام بخاری کے شیخ خلیفۃ بن خیاط اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد الرحمٰن بن ابزی سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت علیؓ کے ساتھ بیعۃ الرضوان والوں میں سے آٹھ سو افراد تھے، جن میں سے تریسٹھ شہید ہوئے (ابو عمرو خلیفہ بن خیاط، **تاریخ خلیفة بن خیاط**، ت اکرم ضیا العمری (دمشق، بیروت: دار القلم، مؤسسة الرسالة) ۱۸۴۔) حضرت ابن عباسؓ جب خوارج کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے گئے تو وہ ان سے سب سے پہلی بات یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم حضرت علیؓ کے لشکر سے الگ کیوں ہوئے ہو؟ تو ابن عباس نے ان سے یہ سوال کرتے ہوئے فرمایا کہ تمھیں رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد اور داماد اور مہاجرین وانصار پر کیا اعتراض ہے؟ (بیہقی، **السنن الکبری**، ت محمد عبد القادر عطا، کتاب قتال أهل البغي، باب لا يبدأ الخوارج بالقتال الخ، ۸: ۳۱۰۔) اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک بھی حضرت علیؓ کی جماعت کا مرکزی حصہ مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا۔ خیر! حدیثی اور تاریخی روایات تو اور بھی بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں، مگر یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے خوارج کی ایک مخصوص جماعت کے خلاف قتال کرنے

نے جامِ شہادت نوش کیا،ان کے علاوہ دوسرے صحابہ و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے جو خدمات دین و خلافت کی انجام دیں، نہ کسی زبان کو اس کے بیان کا یارا ہے نہ کسی قلم کو یہ تاب کہ ان کو رقم کرسکے، لیکن چوں کہ دورِ خلافت ختم ہو چکا تھا اور خاتم الخلفاء حضرت امیرؓ کا جامِ حیات لبریز ہو چکا تھا، اس لیے دنیاوی طور پر یہ قربانیاں بار آور نہ ہو سکیں، بجز اس کے کہ وہ حضرات ثوابِ آخرت اور جنت میں درجاتِ بلند کے حق دار ٹھہرے جو منجملہ دو بھلائیوں کے ایک بھلائی ہے۔[1]

---

والی جماعت کی جو فضیلت احادیث سے سمجھ میں آتی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت روے زمین پر حضرت علیؓ کا ساتھ دینے والی اس جماعت سے بہتر کوئی جماعت نہیں تھی۔ یہ بات بظاہر بعید لگتی ہے کہ اس جماعت کو یہ فضیلت اس صورت میں حاصل ہو کہ آپ اپنے ساتھ چند سبائی قسم کے لوگوں کو ساتھ لے کر پھر رہے ہوں۔

۱- شاہ عبد العزیز، **تحفہ اثنا عشریہ**، ۳۰۔